قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

دسمبر 2019 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ **بچوں کی دنیا** دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

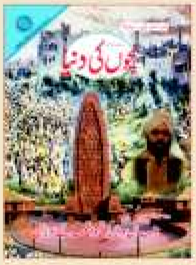

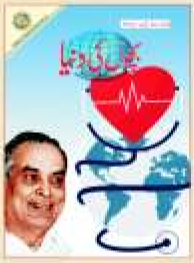

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

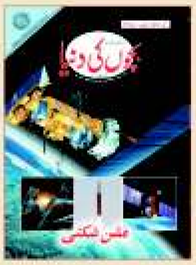

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:21، شمارہ:12، دسمبر 2019

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ۔ نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

زبان اور زمینی صورت حال

زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی سے رابطہ ضروری ہے — مصباح انظر 8

نقد و نگاہ

خاموش غازی پوری ایک مقبول عوامی شاعر — معصوم شرقی 11
ملک کی تعمیر و ترقی میں اردو زبان و ادب کا کردار — ابوبکر عباد 14
اختر شیرانی کی نظم نگاری — فیروز عالم 17
ادا جعفری: بحیثیت نظم نگار — جمشید احمد 20
سہیل عظیم آبادی کی خاکہ نگاری — محمد منہاج الدین 22
جموں و کشمیر میں صوفیانہ شاعری کی روایت — مشتاق احمد صدیقی 25

یاد رفتگاں

اقبال جاوید کی شخصیت کی نمایاں جہتیں — ابواللیث جاوید 28
لئیق صلاح کی علمی و ادبی خدمات — قمر النسا 30
ذرا سی دیر میں برسوں کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں — ظہیر حسن ظہیر 33

روشنی کے مینار

'جپ جی' گورونانک کا عظیم شاہکار — محمد اقبال 37

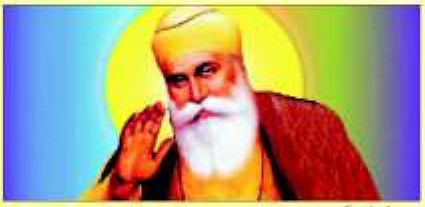

صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیاری — سید محمد نیر رضوی 39

خصوصی گفتگو

اردو زبان و ادب کے بغیر ہماری شخصیت ادھوری ہے: شفیق الحسن — عبدالحی 43

سلسلۂ صحافت

بیسویں صدی میں عربی صحافت — محمد نافع عارفی 46

نیا آسماں نئے ستارے

آج کے عالمی تناظر میں اردو کا تحفظ اور فروغ — سعدیہ صدف 51
مثنوی کدم راو پدم راو اور مشترکہ تہذیب — ساجد ممتاز 56
غبار خاطر: ایک مطالعہ — محمد ریحان 59
اردو ادب میں انسانی اور سماجی اقدار کا تصور — طارق 62
ترجمے کے ذریعے اردو کا فروغ — شاہ جہاں بیگم 65

کمپیوٹر

تبصرے اور حوالہ جات 67

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ 69

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ — ادارہ 80

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 81

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद
National Council for Promotion of Urdu Language
وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند نئی دہلی

ہماری بات

معاصر دنیا کے بہت سے تہذیبی، لسانی اور نسلی مسائل ہیں جن کی وجہ سے معاشرے میں انتشار اور کشمکش کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ زیادہ تر معاشرے اپنے مخصوص نظریاتی وجود اور تشخص پر اصرار کی وجہ سے ایک دوسرے سے متصادم بھی رہتے ہیں اور یہی وہ تصادم ہے جس کی وجہ سے سماج تباہ اور برباد ہو جاتا ہے۔

پوری دنیا میں جس طرح کی نظری اور فکری انتہاپسندی بڑھتی جارہی ہے اس سے سماج پر نہایت منفی اثرات مرتب ہورہے ہیں اور اس کا اثر صرف موجودہ نسل پر نہیں بلکہ آنے والی نسلوں پر بھی پڑے گا اور اس کی وجہ سے معاشرے میں انتشار اور انحطاط کا گراف اور بھی بڑھتا جائے گا۔ یہ انتشار اور انحطاط پوری انسانیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اسی انتشار اور انتہاپسندی کو روکنا اس وقت پوری انسانیت کی ذمے داری ہے کیونکہ احترام آدمیت سے گریز اور انسانی و اخلاقی اقدار سے اجتناب، نظریاتی بالادستی کی جنگ اور جبر و استحصال کے یہ سلسلے معاشرے کو تباہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں شدت پسندی کا انسداد اور پرامن متوازن اور متمدن معاشرے کا قیام اہل قلم کا فریضہ بن جاتا ہے۔

ماضی میں ارباب قلم نے اسی طرح کے فریضے انجام دیے ہیں اور سماج کی مثبت رہنمائی کی ہے۔ چاہے کسی بھی ملک کا ادیب اور کسی بھی زبان کا قلم کار ہو ان میں سے بیشتر نے اپنی معاشرتی ذمے داریوں کو محسوس کرتے ہوئے نثری اور شعری تخلیقات کے ذریعے انسانی اقدار اور احترام آدمیت کو فروغ دیا ہے۔ طبقاتی کشمکش اور تصادم کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ امن و آشتی کے پیغام کے ذریعے نفرتوں کا خاتمہ کیا ہے۔ انسانیت کی خدمت کے ساتھ معاشرے کی اصلاح کی ہے۔ تاریک راہوں کو روشن کیا ہے اور محبتوں کی شمعیں جلائی ہیں۔

ادبا اور شعرا بنیادی طور پر معاشرے کے نہایت حساس اور ذمے دار افراد ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ معاشرے میں پنپنے والی برائیوں پر نظر رکھتے ہیں اور ان کے خاتمے کے لیے وہ اپنی سطح پر کوششوں کو جاری رکھتے ہیں۔ اخوت کا بیاں اور محبت کی زباں بن کر معاشرے کو صحیح راہ دکھاتے ہیں۔ قلمکاروں کا اپنے عہد کے تمام مسائل اور سماج سے گہرا سروکار ہوتا ہے اس لیے سماج کی صحت اور سالمیت ان کی ذمے داریوں میں شامل ہوتی ہے۔ یہ اور بات کہ قلم کار حضرات کے پاس قوتِ نافذہ نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ سیاسی مقتدرہ کا حصہ ہوتے ہیں پھر بھی خود کو معاشرے کا باشعور اور حساس فرد ہونے کے ناطے وہ اپنی ذمے داری سمجھتے ہیں کہ معاشرے کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ اسی لیے وہ تمام تر تعصبات سے بالاتر ہو کر اپنے ضمیر کی آواز بلند کرتے ہیں۔

دنیا کے کسی بھی ملک کے ادب کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے وہاں کے ادب نے معاشرے کو خوب سے خوب تر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور انسانوں کو ایک رشتۂ محبت و وحدت میں جوڑنے کا کام کیا ہے، خاص طور پر وہ حضرات جو سلوک و تصوف سے جڑے رہے ہیں انھوں نے اپنے کلام اور نغموں کے ذریعے تفریق کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے بیشتر افراد واقف ہیں کہ معاشرے میں قیام امن کے لیے قلم کاروں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہر طرح کی نظریاتی شدت پسندی اور انتہاپسندی کو مسترد کرتے ہوئے امن و سکون اور اعتدال کا پیغام دیا ہے۔ ارباب قلم نے اپنے قلم کی روشنائی سے معاشرے کے ذہن اور ضمیر کو روشنی عطا کی ہے اور اسی روشنی کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں اب تک کچھ انسانی اور اخلاقی قدریں زندہ ہیں۔

آج جب کہ پوری دنیا میں انتشار کی ایک عجب سی کیفیت ہے تو ایسے میں اہل قلم کی ذمے داریاں اور بڑھ جاتی ہیں کہ وہ کبیر، بلھے شاہ، امیر خسرو اور دیگر صوفیوں، سنتوں کی طرح محبت کا ساز چھیڑیں اور اپنے نغمے اور کلام کے ذریعے معاشرے سے اندھیروں کو مٹائیں، یہ مقتدر ہستیاں ہمارے لیے روشنی کے مینار اور مشعل راہ ہیں۔ یہی چراغ جلیں گے تو ہر طرف روشنی ہوگی اور ہمیں اس وقت روشنی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے!

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

آپ کی بات

’اردو دنیا‘ نومبر ماہ کا شمارہ موصول ہوا۔ اس بار کے اداریے میں مدیر صاحب نے تمام تر مذاہب کی ماہیت وروح کی یکسانیت کو نشان زد کرتے ہوئے انسانیت کے تحفظ کی خط کشی کی ہے۔ ایک جگہ انھوں نے اختلاف میں وحدت کی ضرورت پر ذوق کا شعر درج کیا ہے ۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

ابن کنول صاحب نے اپنے مضمون میں ہند کی تاریخ کے تناظر میں مرزا مظہر جانِ جاناں کے تصوف پر زور دیا ہے، جبکہ وہ ایک شہرۂ آفاق شاعر بھی تھے۔ 18ویں صدی میں انہوں نے اپنے شعر میں حسرت حریت کی نشان زدگی کی تھی۔

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

اس مقالے کے مابین کہیں بھی ان کی زندگی کے کل عرصے کا ذکر نہیں کیا جا سکا ہے اور وہ شاید یہ تھا سنہ 1698 سے لے کر سنہ 1781 تک۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی پر مبنی مقالہ بھی ایک احسن تحریر ثابت ہوا ہے۔ موصوف نے ہی نظمیہ شاعری کو جدیدیت کا زیور عطا کیا تھا۔ اختر الایمان اور جاں نثار اختر کی مانند وہ ’غزل‘ سے کہیں زیادہ ’نظم‘ کے حق میں تھے۔

جناب احمد اقبال نے ’اجنتا کے غار‘ جیسے کمیاب موضوع کو پیش کر کے ایک قابلِ مدح کام انجام دیا ہے۔ اس مضمون کے ذیل میں اجنتا کے متعدد غاروں کا خلاصہ دیدنی ہے۔ مستزاد، ہر تفصیل عرق ریزی کا نمونہ ہے۔ صفحہ 37 پر ’سیتا پھل‘ کا نام درج کیا گیا ہے، جسے ’شریفہ‘ بھی کہا جاتا ہے۔ ایک بار امیر خسرو وارنگل گئے تھے اور اس پھل کا نام سن کر شری رام کی اہلیہ سیتا دیوی جی کے نام سے منسوب کرنے پر اعتراض کیا تھا اور اسی وقت اسے ’شریفہ‘ نام رکھ دیا تھا، بس تبھی سے یہ نیا نام صوفی، شاعر، موسیقار اور مختلف الجہات تشخص خسرو کے وسیع المشرب ہونے کا ایک مستند ثبوت بھی پیش کرتا آیا ہے۔

جناب محمد الیاس کا مضمون رامپور اور حیدرآباد کے دبستانوں کی مشترکہ خصوصیات کی خط کشی کرتا ہے، تاہم رامپور اور حیدرآباد دونوں ہی شہروں کے بلند پایہ شعرا پر الگ سے ایک ایک مضمون کی اشاعت درکار ہے۔ شاہد احمد صاحب نے بھی فلمی سے کہیں زیادہ ایک ادبی شاعر جناب حسرت جے پوری کی شاعری پر ایک جامع مقالہ پیش کیا ہے، جو کہ کوزے میں سمندر کے مصداق ہے۔ کلی طور پر یہ شمارہ ایک معیاری کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

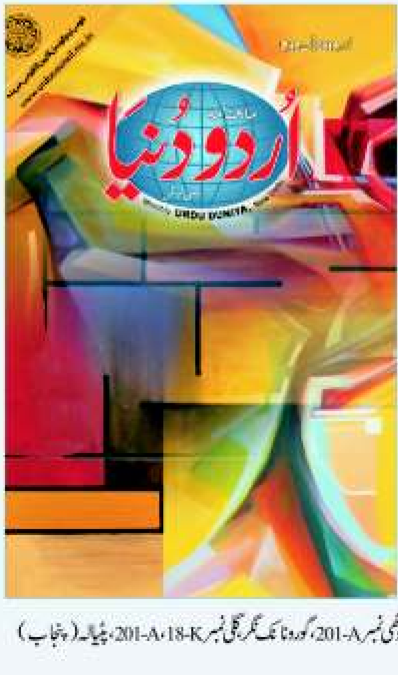

❖ ڈاکٹر کرشن بھاوک : کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر گلی نمبر K-18، A-201، پٹیالہ (پنجاب)

ماہنامہ ’اردو دنیا‘ اکتوبر 2019 کا شمارہ بہت تاخیر سے ملا، پھر بھی شکریہ۔ زیرِ نظر شمارے کے اداریے ’ہماری بات‘ میں آپ نے ٹیکنالوجی انقلاب کو ادب کے دائرے میں سمونے کا محاسبہ کیا ہے جو آپ کے اس اداریے کا لب لباب ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ آج انٹرنیٹ یا میڈیا نے ساری دنیا کے ساتھ ساتھ دنیائے ادب کو بھی اپنی مٹھی میں لے لیا ہے۔ آپ کی بات پر کوئی شک وشبہ نہیں کہ آج تحقیقی مواد اور تنقیدی مضامین کے حصول کے لیے لائبریریوں اور کتب خانوں کی خاک چھاننے کی ضرورت نہیں ہے، بس اسمارٹ فون کے بٹن پر انگلی دباتے ہی وہ ساری مطلوبہ کتابیں، جرائد، دواوین، نگارشات اور مضامین اسکرین پر موجود ہو جاتے ہیں۔ اداریے کے آخری پیراگراف میں آپ نے مشاعروں کو بھی فروغِ اردو کا ذریعہ بتایا ہے جب کہ مشاعرے

خالص ادبی اور کلاسیکل ہوں نہ کہ مظاہروں کی شکل اختیار کرلیں جیسا کہ آج کل کے مشاعروں میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ اردو مشن کو عام کرنے کے لیے لازم ہے کہ مادّہ پرست عناصر سے ہم اپنے مقصد کو پاک رکھیں۔

❖ **علیم صبا نویدی**: 266 ٹرپلی کین ہائی روڈ، فلیٹ نمبر 16، رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی، تمل ناڈو

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' تمام تر مصروفیات کے باوجود میرے مطالعے کا ایک اہم حصہ ہے، جو آپ کی کرم فرمائیوں کے باعث بروقت موصول ہوتا ہے۔ اداریہ تا 'خبرنامہ' علمی و ادبی مضامین کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں سائنس و ٹکنالوجی اور فنون لطیفہ کے گلہائے رنگارنگ ہر موسم اور ہر رُت کو تابناکیاں بخشتے ہیں اور اذہان کو علمی تر و تازگی سے دوچار کرتے ہیں۔

❖ **ڈاکٹر رضوانہ ارم**: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور وومنس یونیورسٹی، جھارکھنڈ

✍ 'اردو دنیا' اکتوبر 2019 کو موصول ہوا۔ اس میں کوئی پندرہ ابواب کے در، وا ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تقنیات کی معاونت سے فاصلے سمٹ گئے ہیں اور انٹرنیٹ (مربوط نظام) سے درکار معلومات ہمیں چشم زدن میں فراہم ہو جاتی ہیں لیکن جو مزہ سابقہ طرز تحقیق کی چھان پھٹک میں تھا، وہ اس برق ریزی میں کہاں لیکن فوائد سہولیات اور بھی تو میسر ہیں جن سے اردو زبان کو دور افتادہ علاقوں تک رسائی حاصل ہے اور ایسے کئی جتن ہیں جو قومی اردو کونسل نے اختیار کرلیے ہیں اور جن سے متوقع کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں۔ مشاعروں کو بھی تمام تر دستیاب ذرائع ابلاغ کی مدد سے عوام تک اور دور دور تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ بہرحال یہ ایک خوش آئند سوچ ہے۔ 'قلم کاروں سے گذارش' نظر سے گزری، پر کیا فائدہ سوائے مراسلوں کے اچھے مضامین بھی عرصہ دراز تک توجہ کے محتاج رہتے ہیں۔ خیر۔ 'زبان و تعلیم' کے ذیل میں 'الفاظ کی طاقت' ناقابل یقین حد تک حیرت انگیز ہے۔ 'زبان اور زمینی صورتحال' کے تحت دیا گیا مضمون 'کسی زبان کی موت انسانی وراثت کا خاتمہ ہے' اس کے سابقہ صفحے پر دیے گئے سوالنامہ کے خاکہ کے مطابق بہم پہنچایا گیا جوابی اظہار ہے، مگر بہت خوب ہے۔ 'نقد و نگاہ' میں کوئی پانچ مقالے درج ہیں۔ ایک تو 'برج نرائن چکبست کی شاعری میں حب الوطنی کے عناصر' اچھا مضمون ہے لیکن تمہید طویل ہے۔ 'اردو غزل میں قدرتی آفات' میں بڑی ندرت پائی جاتی ہے۔ آفات کو جہاں واضح کیا گیا ہے وہیں غزل کے ایسے اشعار بھی دیے گئے ہیں جن میں ان آفات کا ذکر کیا گیا ہے۔

'اردو کی پہلی داستان......'' گو کہ تنقیدی مطالعہ ظاہر کیا گیا لیکن درحقیقت یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ 'اردو مثنوی......'' کے ذیل میں ذوق سے لے کر علامہ شبلی تک کوئی چھ ادیبوں کے کلام پر بحث کی گئی ہے۔ 'اردو ریڈیائی ڈرامہ....' کی روایت کا آغاز 1928 سے ہوا۔ یہ بڑا معلوماتی مضمون ہے۔ 'خراج عقیدت' کے ذیل میں 'مہاتما گاندھی' اور 'سرسید احمد خان' پر بہت خوب مضامین دیے گئے ہیں۔ 'یادیں' (ص 40 تا 45) تک موسیقار خیام اور حضرت غوث خواہ مخواہ پر مضامین ہیں۔ 'سلسلہ صحافت' میں اردو کی ادبی صحافت کے تعلق سے وہاب اشرفی کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'تہذیبی اور لسانی رشتوں' میں دو مقالے دیے گئے ہیں۔ ایک تو 'اردو اور کشمیری......' جس میں یہ قائل کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ برعظیم کی ساری جدید زبانیں اپ بھرنش سے ہی نکلی ہیں۔ چونکہ کشمیری اور اردو زبانیں بھی جدید زبانیں ہیں اس لیے یہ دونوں شورسینی اپ بھرنش ہی کی شاخیں ہیں۔ یہی کیفیت اردو اور پنجابی میں بھی رہی ہے کیونکہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق پنجابی لہجہ، آہنگ، تلفظ اور محاورہ شروع ہی سے اردو کے مزاج میں شامل رہا ہے۔ 'نیا آسمان اور نئے ستارے' میں تمام تر نسوانی کہکشاں روشن ہے۔

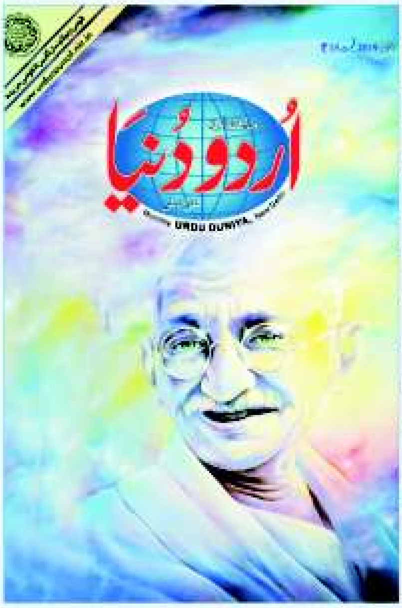

'اردو ناولوں میں نسوانی کردار' میں ڈپٹی نذیر احمد کو اولین ناول نگار کہا گیا ہے جنھوں نے مراۃ العروس (1869) سے ناول نویسی کی شروعات کی اور اپنے ناولوں میں عورتوں کے حقیقی اور واقعی مسائل پر قلم اُٹھایا ہے۔ دوسرا مضمون 'ڈپٹی نذیر احمد اور تعلیم نسواں' کو پہلے مضمون کا تسلسل سمجھیے۔ 'فلم' کے تحت ایک مضمون بعنوان 'بالی ووڈ میں اردو جاننے کے مواقع' دیا گیا ہے۔ عنوان ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں روزگار سے متعلق ہی گفتگو کی گئی ہے ورنہ کوئی تفریحی معلومات درج نہیں۔ 'کمپیوٹر' میں مضمون 'دستاویز میں عناصر جوڑنا' دیا گیا ہے۔ اُردو طلبہ کو چاہیے کہ موبائل خبط کے بجائے اس مضمون کو پڑھیں اور بار بار پڑھیں کہ اس میں انھیں غیر معمولی مہارت حاصل ہو جائے۔ رسالے میں کوئی تیرہ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں جن میں ان کے محاسن و معائب پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'عالمی اردو نامہ' میں بیرون ممالک کی خبریں درج ہیں۔

❖ **مصطفی ندیم خاں غوری**: B-11، گرین والی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذوق اور سطح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحریریں شائع کی جاتی ہیں مگر ایسے مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے جو سائنسی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں میں ہونے والی ترقیات کا احاطہ کرتے ہوں یا روزگار کے حصول میں معاون وسائل کی نشان دہی کرتے ہوں۔ یہ ہر طبقے کا رسالہ ہے اسی لیے اس میں تنوع کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کی خوش بختی ہے کہ اسے ہندوستان بھر کے قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ ہر موضوع پر ہمیں مضامین ملتے رہتے ہیں۔ لیکن تمام مضامین کی فوری اشاعت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اب قلم کاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مضمون کے ساتھ چند سطروں میں مضمون کے اہم نکات کی نشان دہی فرمادیں تاکہ ترجیحی طور پر مضمون کو شامل اشاعت کیا جاسکے۔ برائے مہربانی اپنے مضامین، خبروں اور خط کے ساتھ **اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ مع پن کوڈ ضرور فراہم کریں۔** معاوضے کے لیے بھیجے گئے فارم میں اپنے قلمی اور بینک اکاؤنٹ میں درج نام کی الگ الگ نشان دہی کریں۔

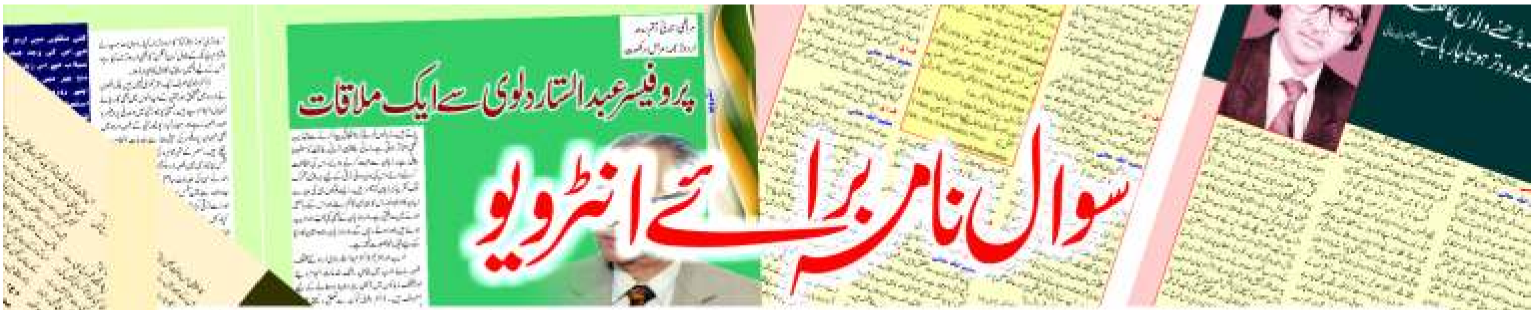

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہورہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہورہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کررہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کررہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

مصباح انظر

زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی سے رابطہ ضروری ہے

اردو رسائل میں اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا. زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے. عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں. جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا.

سوال: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: زبان کی ترقی کا تعلق اس کے برتنے والوں کی سیاسی وسماجی زندگی اور ان کی معیشت سے ہے۔ زبان کے سیکھنے کا عمل ایک لاشعوری عمل ہے، مگر اس کے فروغ کا دارومدار متعدد نوعیت کی اپنائی گئی حکمت عملی پر ہے۔ جس طرح زبان کو روزمرہ زندگی اور معاشی سرگرمیوں سے جوڑکر فروغ دیا جا سکتا ہے، اسی طرح اس کے استعمال اور وسائل کو محدود کرکے اسے تنزلی کا شکار بھی بنایا جاسکتا ہے۔ زبان کو تہذیب وثقافت کے فروغ کے لیے ایک وسیلے کے طور پر استعمال کرکے اسے فروغ بھی دیا جا سکتا ہے، اسے حاشیے پر پہنچا کر اس کی جڑیں کم زور بھی کی جاسکتی ہیں۔ کوئی بھی زبان سماجی زندگی سے جتنا قریب ہوگی اس کی ترقی کے امکانات اتنا ہی زیادہ ہوں گے۔ زبان اگر گھریلو استعمال کے ساتھ گلی کوچوں، چوک چوراہوں، بازاروں اور دفتروں میں بھی استعمال ہورہی ہے تو اس کا دائرہ روز بروز بڑھتا جائے گا۔ اگر اس کے برعکس اس کے استعمال کو محدود کردیں تو اس کی وسعت کم ہوتی جائے گی۔ اگر اسکول کی سطح پر کسی زبان کی تعلیم کو ناقص کردیں تو اسے پنپنے کا موقع نہیں ملے گا۔ اسی طرح اخبارات، رسائل اور کتابوں کے کم شائع ہونے اور قاری کی تعداد میں مسلسل کمی ہونے سے بھی زبان کو زبردست نقصان پہنچتا ہے۔

سوال: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

جواب: زبانوں کو زندہ رکھنے کا آسان طریقہ ہے کہ انھیں عوام الناس کی روزمرہ زندگی کا حصہ بنایا جائے۔ انھیں بڑے پیمانے پر ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ کسی بھی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے سے اس کی ترویج واشاعت کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی زبان لاکھوں کروڑوں طلبہ کے ذریعے روز استعمال ہورہی ہو تو اس کی وسعت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ زبان کو اس لائق بنادیں کہ اس سے تعلیمی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ معاشی زندگی سے تعلق پیدا کرکے اور سائنس وٹکنالوجی سے مستحکم روابط قائم کرکے زبانوں کو زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ روزی روٹی کا وسیلہ بنا دینے سے اور اچھا ادب لکھے جانے سے زبان کو ترقی بھی ہوگی اور اس کا معیار بھی بلند ہوگا۔ کسی بھی زبان کے بہتر مستقبل کے لیے اچھے مصنفین کے ساتھ ہی قاری کی بہت بڑی تعداد ہونی چاہیے۔ ہر زبان کا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے۔ اردو زبان کا مزاج ایسا ہے کہ یہ کسی بھی زبان کے لفظ کو قبول کرسکتی ہے اور اس زبان کو سماج کے ہر طبقے میں فروغ دیا جاسکتا ہے۔

سوال: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

جواب: زبان تہذیب وثقافت کو پروان چڑھانے کا وسیلہ ہے۔ زبان کی شیرینی یا کرواہٹ سے اس کے بولنے والوں کے مزاج کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ کسی مہذب قوم کی زبان انتہائی خراب ہو۔ زبان کے ذریعے طرز زندگی کو، اس کے ذریعے متعلقہ معاشرے کو، اور اس معاشرے سے تہذیب وثقافت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لیے ترسیل خیال میں زبان کی شائستگی کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔

سوال: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

جواب: زبان سے انسان کی شخصیت اور اس کے اقدار کا پتہ چلتا ہے۔ زبان انسانی تہذیب کی بہترین علامت ہے۔ انسانی وراثت کی پامالی کے لیے زبان وثقافت کو نیست و نابود کردینا کافی ہے۔ اس کے برعکس انسانی وراثت کے تحفظ کے لیے زبان وثقافت کو فروغ دے کر ایک بہترین معاشرے کی تشکیل ہوسکتی ہے۔ جب معاشرہ صحت مند ہوگا تو اس سے یقیناً انسانی وراثت کے تحفظ کی راہ ہموار ہوگی۔

سوال: کیا کسی زبان میں خواندگی سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

جواب: کسی بھی زبان کی وسعت کا اندازہ اس میں دستیاب معیاری ادب اور اس کے استعمال کرنے والوں کی تعداد سے ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی میں اگر کوئی زبان سائنسی و سماجی مواد سے محروم ہے تو اس کا سب سے بڑا نقصان اس زبان کے قاری کو ہے۔ زبان کو فروغ دینے کے لیے اس میں تمام عصری علوم کا مواد فراہم ہونا چاہیے۔ اردو میں خواندگی بڑھا کر، اس میں سماجی و سائنسی علوم کا مواد مہیا کر کے اسے خوب ترقی دی جا سکتی ہے۔

سوال: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

جواب: اردو زبان و ادب کے لیے سب سے زیادہ تشویش کی بات اس میں قاری کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہونا ہے۔ اردو داں طبقہ، بالخصوص نوجوانوں میں اردو کتابیں پڑھنے کا رجحان افسوسناک ہے۔ کتابیں پڑھنے میں دلچسپی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ اردو رسالے قاری سے محروم ہو رہے ہیں۔ اردو اخبارات کے قاریوں میں اضافہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ مہاراشٹر، کرناٹک اور تلنگانہ کے علاوہ کسی اور ریاست میں اردو ذریعہ تعلیم کا خاطر خواہ فروغ نہیں ہو رہا ہے۔ اتر پردیش اور بہار جیسی بڑی ریاستوں میں اردو ذریعہ تعلیم کی کوئی قدر نہیں ہے، جبکہ دونوں ریاستوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ وہاں اردو اور اردو ذریعہ تعلیم کے لیے مختلف قسم کی رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ ملک کی راجدھانی دہلی کے بعض اردو میڈیم اسکولوں میں غیر اردو داں اساتذہ کو بھر دیا گیا ہے۔ اردو اساتذہ کی اسامیاں برسوں تک بھری نہیں جاتیں۔

سوال: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟

جواب: اردو بین الاقوامی سطح پر بولی جانے والی زبان ہے۔ اپنی شیرینی کی وجہ سے یہ ہمیشہ زندہ رہنے والی زبان ہے۔ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نا جائے گا۔

سوال: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: اردو کا مستقبل بہت حوصلہ افزا یا تابناک تو نہیں، مگر ہمیں مایوس ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستانی فلموں میں اردو کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اردو ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ اس کی ترقی کی رفتار کم ہو سکتی ہے مگر اس کی جڑیں مستحکم ہیں۔ اردو ادب نے انسانی اقدار کے فروغ میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو میں اسلامی ادب کا جتنا بڑا سرمایہ ہے، اس پر ہمیں فخر ہونا چاہیے۔ اردو میں مذہبی کتابوں کے مطالعے کا صحت مند رجحان ہے۔ اس زبان میں دعوت و تبلیغ کا کام بھی عالمی سطح پر چل رہا ہے۔ خلیجی ممالک میں اردو زبان بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ جس زبان کا دائرہ اتنا وسیع ہو، اس کے مستقبل کے لیے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ ایسا لائحہ عمل تیار کرنے کی ضرورت ہے جس سے نوجوان طبقہ اس میں مستقبل تلاش کرنے لگے۔

سوال: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

جواب: زبان دلوں کے جوڑنے اور اچھے خیالات کی ترسیل کا ذریعہ ہوتی ہے۔ زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے وہ بالکل عارضی ہے۔

سوال: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

جواب: اردو کے ادارے زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے الگ الگ انداز میں کام کرتے ہیں۔ زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت عام طور پر بنیادی تعلیم کے لیے یا زبان کی تدریس سے متعلق کورسوں، ڈی۔ ایل۔ ایڈ، بی۔ ایڈ وغیرہ کے نصاب کے مطابق ہوتی ہے۔ ادب اطفال کی اشاعت اور فروغ کے تحت زبان سے متعلق کتابیں بڑے پیمانے پر شائع کی جا سکتی ہیں۔ سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز (سی آئی آئی ایل، میسور) کے ذریعہ اس طرف توجہ دی گئی تھی، مگر یہ کام زیادہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ قومی اردو کونسل کی طرح یہ بھی ایک سرکاری ادارہ ہے، مگر اس کا اشاعتی پروگرام بڑے پیمانے کا نہیں ہے۔ اگر یہ دونوں ادارے باہمی اشتراک سے کوئی حکمت عملی طے کریں تو بات بن سکتی ہے۔ ساہتیہ اکادمی ادب کے فروغ کے لیے ہر سال بڑے ادیبوں کو، نوجوان ادیبوں کو (یووا پرسکار) اور مترجموں کو انعامات سے نوازتی ہے۔ زبان سے متعلق کتابوں کے لیے بھی اگر کسی انعام کا اعلان ہو تو مصنفین یقیناً اس طرف توجہ دیں گے۔

کسی بھی زبان کی وسعت کا اندازہ اس میں دستیاب معیاری ادب اور اس کے استعمال کرنے والوں کی تعداد سے ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی میں اگر کوئی زبان سائنسی و سماجی مواد سے محروم ہے تو اس کا سب سے بڑا نقصان اس زبان کے قاری کو ہے۔ زبان کو فروغ دینے کے لیے اس میں تمام عصری علوم کا مواد فراہم ہونا چاہیے۔ اردو میں خواندگی بڑھاکر، اس میں سماجی و سائنسی علوم کا مواد مہیا کر کے اسے خوب ترقی دی جا سکتی ہے۔

سوال: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

جواب: کلاسیکیت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر گفتگو سے زبان کو جزوی فائدہ پہنچے گا۔ یہ ادب کی چیزیں ہیں، ان پر گفتگو اور بحث و مباحثہ سے ادب کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مگر زبان کو راست طور پر فائدہ پہنچانے کے لیے مختلف نوعیت کی حکمت عملیاں اپنانی ہوں گی۔ کلاسیکیت اور جدیدیت پر گفتگو کرتے رہنا اور زبان کے استعمال کی گنجائشیں کم کر دینا مناسب نہیں۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کیا تعداد ہے؟

جواب: تلنگانہ میں اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ صرف حیدرآباد شہر میں کم از کم ایک سو بتیس اردو میڈیم اسکول ہیں جن میں سیکڑوں اساتذہ ہیں اور بائیس ہزار (22000) سے زیادہ بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہاں ہر سال کئی ہزار طلبا دسویں کا امتحان اردو میڈیم میں لکھتے ہیں۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

جواب: حیدرآباد اردو کے لیے بہت ہی زرخیز علاقہ ہے۔ یہاں کے گچی باؤلی علاقے میں واقع ہماری یونیورسٹی میں مقامی اخبارات، روزنامہ منصف، سیاست، راشٹریہ سہارا، اعتماد اور رہنمائے دکن کے ساتھ ہی دیگر شہروں کے اخبارات بھی پہنچتے ہیں۔ اسی طرح مقامی ماہنامہ سب رس، خوشبو کا سفر، شگوفہ، وقار ہند کے علاوہ ملک بھر کے رسائل یہاں پہنچتے ہیں۔ مزید برآں، یہاں مختلف تنظیمیں الگ الگ سطحوں پر اردو کی ترقی کے لیے کام کر رہی ہیں۔

سوال: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کر رہے ہیں؟

جواب: اردو میری زبان ہی نہیں بلکہ میری شناخت ہے۔ اردو کے اخبارات، رسائل اور کتابیں خرید کر پڑھتا ہوں۔ اپنے بچوں کو اردو کی باضابطہ تعلیم دیتا ہوں۔ میرا بارہ سالہ فرزند اردو کے علاوہ عربی، انگریزی، ہندی، جرمن اور سنسکرت میں باضابطہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ان

پرائمری سطح پر اردو میڈیم میں درس و تدریس کا بہترین انتظام ہونا چاہیے، اس کے لیے ملک بھر کے نمائندہ ضلعوں میں جواہر نؤدیے ودیالیہ کے طرز پر اردو میڈیم اقامتی اسکول کا قیام ضروری ہے۔ حسب ضرورت نؤدیے ودیالیوں اور کیندریہ ودیالیوں میں اردو اساتذہ کی بحالی ہونی چاہیے۔ سرکاری اور سرکاری امداد یافتہ اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کو یقینی بنایا جانا چاہیے۔ اردو اساتذہ اور اردو ذریعہ تعلیم سے منسلک اساتذہ کی مسلسل تربیت کا کارگر انتظام ہونا چاہیے۔ تمام مسابقتی امتحانات میں انگریزی اور ہندی کی طرح اردو میں امتحان دینے کی اجازت دی جانی چاہیے۔

تمام زبانوں کے اساتذہ اس کی اردو یعنی مادری زبان سے متاثر ہیں۔ میں نے تلنگانہ، آندھرا پردیش، مہاراشٹر، کرناٹک، کیرالہ اور اڈیشا کے تین ہزار سے زائد اردو اساتذہ کو تربیت دی ہے۔ اسکولوں اور مدرسوں کے اساتذہ کے لیے تربیتی پروگرام منعقد کرنا میرا پیشہ ہے۔ میں اس طرح کے 61 تربیتی پروگراموں میں راست حصہ لے چکا ہوں۔

سوال: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

جواب: پرائمری سطح پر اردو میڈیم میں درس و تدریس کا بہترین انتظام ہونا چاہیے، اس کے لیے ملک بھر کے نمائندہ ضلعوں میں جواہر نودے ودیالیہ کے طرز پر اردو میڈیم اقامتی اسکول کا قیام ضروری ہے۔ حسب ضرورت نودے ودیالیوں اور کیندریہ ودیالیوں میں اردو اساتذہ کی بحالی ہونی چاہیے۔ سرکاری اور سرکاری امداد یافتہ اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کو یقینی بنایا جانا چاہیے۔ اردو اساتذہ اور اردو ذریعہ تعلیم سے منسلک اساتذہ کی مسلسل تربیت کا کارگر انتظام ہونا چاہیے۔ تمام مسابقتی امتحانات میں انگریزی اور ہندی کی طرح اردو میں امتحان دینے کی اجازت دی جانی چاہیے۔ مناسب اردو آبادی والے تمام دفتروں میں اردو میں مراسلے کو عملاً کامیاب بنایا جانا چاہیے۔ دنیا بھر کی بہترین کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کی ذمے داری متعلقہ اداروں کو سونپی جانی چاہیے۔

سوال: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟

جواب: دنیا بھر کے معیاری ادب کو اردو میں منتقل کرنے یا اردو کے قالب میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ کلاسیکی اردو ادب کی دیدہ زیب، دلکش اور معیاری کتابیں شائع کی جانی چاہئیں۔ اردو میں دلچسپی رکھنے والے غیر اردو داں افراد کو اردو سکھانے کے لیے انفرادی اور اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے۔

سوال: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟

جواب: ابتدائی طور پر بہترین اردو ادب کو علاقائی زبانوں میں منتقل کر سکتے ہیں۔ اگر زباں زد اشعار لوگوں کو اپنی مادری زبان میں مل جائیں تو وہ کم از کم اردو کی چاشنی سے ضرور متاثر ہوں گے۔ اردو کی مشہور کہانیوں کو علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے سے ان زبانوں کے قاری بھی اردو ادب سے واقف ہونے لگیں گے۔

سوال: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

جواب: ہماری شناخت اردو سے ہے۔ مادری زبان ہونے کی وجہ سے ہمارے گھر والے اردو میں سوچتے ہیں، اردو بولتے ہیں اور اردو پڑھتے و لکھتے ہیں۔ روزنامہ منصف، سیاست اور راشٹریہ سہارا روزانہ پڑھتے ہیں۔ اردو دنیا، فکر و تحقیق، آج کل، ایوان اردو، امنگ اور پیش رفت جیسے رسالے مستقل منگاتے ہیں۔ قرآن شریف کے متعدد اردو تراجم گھر پر استعمال میں ہیں۔

سوال: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

جواب: میری طرف سے میرے بچوں میں جو اقدار منتقل ہو رہی ہیں، ان میں اردو کا بڑا دخل ہے۔ اردو ہماری شناخت ہے اور ہم اپنی شناخت آخری سانس تک قائم رکھیں گے، ان شاء اللہ۔

سوال: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جا سکتی ہے؟

جواب: غیر اردو حلقے میں ہم اپنی زبان اور شائستگی کی چھاپ چھوڑیں۔ انھیں آسان اور عام فہم اردو سے مانوس ہونے کا موقع فراہم کریں۔ اگر غیر اردو داں احباب اردو سے متعلق کسی طرح کی دلچسپی کا مظاہرہ کریں تو ہمیں ان کے لیے انفرادی اور تنظیمی سطح پر مواد فراہم کرنے سے نہیں چوکنا چاہیے۔ ان کی دلچسپی کے مطابق انٹرنیٹ پر موجود مواد تک ان کی رسائی کے لیے ہمیں رہنمائی کرنی چاہیے۔

سوال: آپ کے علاقے میں اردو میں اعلیٰ تعلیم کا کیا انتظام ہے؟ طلباء کتنے ہیں؟

جواب: شہر کے گچی باؤلی علاقے میں دو مرکزی جامعات، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف حیدرآباد واقع ہیں۔ دونوں جامعات میں اردو میں اعلیٰ تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ دو سو ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی اردو یونیورسٹی میں ملک بھر کے ہزاروں طلبا اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یونیورسٹی میں بی۔ ٹیک، ایم۔ ٹیک، ایم۔ سی۔ اے، ایم۔ بی۔ اے، ایم۔ سی۔ جے، ایم۔ ایڈ جیسے کورسوں کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ یونیورسٹی کے دو درجن سے زائد شعبوں اور مراکز میں پی ایچ۔ ڈی کے مقالے اردو میں لکھوائے جا رہے ہیں۔ یہ ہندوستان کی واحد یونیورسٹی ہے جہاں سائنس اور سماجی علوم میں بھی پی ایچ۔ ڈی کے مقالے اردو میں لکھے جا رہے ہیں۔ شہر میں یونیورسٹی کا اپنا اردو میڈیم سینیئر سیکنڈری اسکول بھی ہے جہاں پہلی سے بارہویں جماعت تک تمام مضامین اردو میڈیم میں پڑھائے جاتے ہیں۔

سوال: اردو کی ترویج و اشاعت میں این جی او سے کیا مدد لی جا سکتی ہے؟

جواب: ہندوستان کی بیشتر غیر سرکاری تنظیموں (این جی او) کی شبیہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ اردو کی ترویج و ترقی کے لیے غیر سرکاری تنظیموں سے مدد حاصل کرنے میں کوئی اعتراض تو نہیں، مگر ان کو مالی امداد دینے میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم و تدریس میں 'پرتھم' ایک اہم این جی او ہے، مگر بنیادی تعلیم کے لیے تیار کردہ اس کا مواد انتہائی ناقص ہے۔ اگر سنجیو صراف صاحب کی 'ریختہ فاؤنڈیشن' جیسی کوئی تنظیم کتابوں کی ترویج و اشاعت میں کوئی پیش قدمی کرے تو اس کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔

سوال: کے وی اور نو ادے اسکولوں میں اردو تعلیم کا معقول انتظام ہے یا نہیں؟

جواب: کیندریہ ودیالیہ اور نوادے ودیالیہ ہندوستان کے بہترین سرکاری اسکول ہیں۔ اگرچہ ان اسکولوں کی تعداد تقریباً ساڑھے تین ہزار ہے، مگر جموں و کشمیر کے اسکولوں کے علاوہ شاید ہی کسی اور ریاست میں اردو مضمون کی تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق مسلمانوں کی آبادی والے کشن گنج ضلع کے نوادے ودیالیہ میں اردو کے بجائے اکھمیا زبان پڑھائی جاتی تھی۔ مقامی رکن اسمبلی اور رکن پارلیمنٹ کی مسلسل جد و جہد کے بعد وہاں اردو معلم کا انتظام کیا گیا۔

■

Misbahul Anzar
Asst. Professor, CPDUMT,
Maulana Azad National Urdu University,
Gachibowli, Hyderabad-500032 (Telangana)
Mobile-9948412484

معصوم شرقی

خاموش غازی پوری
ایک مقبول عوامی شاعر

20.07.1932—11.10.1981

غازی پور اتر پردیش کا ایک مردم خیز خطہ اور گہوارۂ علم وفن رہا ہے۔ عہد قدیم سے موجودہ زمانے تک اس نے مختلف ادوار اور شعبۂ حیات میں عبقری (Genius) اور لائق احترام شخصیتیں پیدا کی ہیں جن کے علم وکمال اور ادبی وشعری خدمات نے ماضی میں اس شہر کا نام روشن کیا۔ غازی پور کی قابل ذکر شخصیتوں میں مولانا آسی غازی پوری، ہنر غازی پوری، سامری غازی پوری، بقا غازی پوری، ڈاکٹر مونسؔ رضا عابدی، پروفیسر امیر حسن عابدی، ہمیل خاں، عبدالحمید خاں۔ پروفیسر سید نور الحسن مولانا عبدالوحید صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر سید محمود نذیر حسین، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، سید مشیر الحق، ڈاکٹر انس، خاموش غازی پوری، ظہیر غازی پوری، سید منیر نیازی اور عزیز الحسن صدیقی کی ذات گرامی اپنے اپنے میدان فکر وعمل میں سرگرم رہی ہیں۔

میدان علم وادب ہو یا جہان سیاست اس میں چند ایسی بدیع روزگار ہستیاں منصۂ شہود پر آئیں جنھوں نے زندگی کے قلیل عرصے میں اپنے علم وکمال سے ایک عالم کو متاثر کیا اور نقش دائمی چھوڑ گئیں۔ زندگی نے کچھ اور وفا کی ہوتی تو مزید کارہائے نمایاں انجام پاتے۔ مسٹر ملا نگ۔ مسٹر گوکھلے، ڈاکٹر ستیش چندر، پنڈت بشن نرائن در، جون ملٹن، سوکا نتو، خواجہ غلام الثقلین، میراجی، دیا شنکر نسیم، ناصر کاظمی، مجید امجد، مجاز، سارہ شگفتہ، پروین شاکر، شکیب جلالی، آنس معینؔ زیب غوری اور اشک امرتسری جیسے لوگ کم عمری میں نذر اجل ہو گئے۔ خاموش غازی پوری بھی ایسے ہی فنکاروں میں سے تھے جنھوں نے زندگی کی صرف 48 بہاریں دیکھیں اور دار فانی سے رخصت ہو گئے مگر یہ کہہ گئے۔

میں وہ سورج ہوں نہ ڈوبے گی کبھی جس کی کرن
رات ہوگی تو ستاروں میں بکھر جاؤں گا

خاموش کے انتقال کی خبر سن کر مشہور شاعر شعری بھوپالی نے بے ساختہ کہا تھا۔

’’ہائے! ایسے شاعر روز روز پیدا نہیں ہوتے۔‘‘

خاموش نے 1945 میں شاعری کی ابتدا کی۔ لیکن آزادی کے بعد ان کی شاعری میں ایک نوع کی درشتگی پیدا ہو گئی تھی۔ 1947 ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس عہد کی سب سے ممتاز خصوصیت ہے ’بے اطمینانی‘ اور ’اضطراب‘۔ اس احساس کی صحیح عکاسی آزادی کے بعد کی غزلیہ شاعری میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ آزادی کے نام پر موسم گل کا فریب ہاتھ آیا۔ وطن کی زمین انسانی لہو سے لالہ زار بنی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا اور انسانیت تڑپ تڑپ کر دم توڑتی رہی۔ ان احساسات کو ہمارے شعرا نے شعری پیکر عطا کیا۔ خاموش بھی ایسے اشعار کہنے پر مجبور ہوئے

کسی نے دیکھا نہ بیخودی میں کہ دھوپ شامل ہے چاندنی میں
بہار بن کر خزاں جو آئی فریب کھا ہی گیا زمانہ
وہ دن ہے نزدیک باغباں جب ہمارے رحم و کرم پہ ہوگا
جو آج بجلی گرا رہا ہے وہی بنائے گا آشیانہ
یہ کہہ دو خاموش رہبروں سے، بھرم حقیقت کا کھل چکا ہے
یہ کھوٹے سکے نہیں چلیں گے کہ ہوش میں آ گیا زمانہ
چمن کے بدلے یہ چاند تارے، یہ کہکشاں لے کے کیا کریں گے
زمیں کے دامن میں کیا نہیں ہے، ہم آسماں لے کے کیا کریں گے
جو رنگ و بو کے حریف ٹھہرے، وہ کب گلوں سے وفا کریں گے
چمن کو تقسیم کرنے والے، چمن کی تنظیم کیا کریں گے
یہی جو حالت رہی چمن کی تو اک دن ایسا بھی حال ہوگا
کوئی نہ دیکھے گا بجلیوں کو اور آشیانے جلا کریں گے
بدل چکا ہے نظام عالم، اب اس کو خاموش کیا کریں ہم
چمن ہمارا چمن نہیں ہے، کلی ہماری کلی نہیں ہے

اچھی تدبیر نکالی ہے یہ صیادوں نے
ذہن کو قید کیا پاؤں کو آزاد کیا

سوال یہ نہیں تاریک ہے فضا اب تک
سوال یہ ہے کہ تاریک یہ فضا کیوں ہے

خاموش کی شاعری جذبات اور احساسات کی ایک کھلی کتاب ہے جس میں ان کی زندگی اور شخصیت کے روشن گوشوں کا با آسانی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ خاموش کی شعری بقا کے لیے ان کے یہ اشعار کافی ہیں۔ تشبیہات واستعارات اور دیگر محاسن شعری کی جلوہ گری ملاحظہ کیجیے۔

غالب کی اک غزل کی طرح ہے یہ زندگی   ایسی غزل جو سب کو سنائی نہ جا سکے
ہر لمحۂ نشاط کی قیمت کہاں رہے   ہر لمحۂ نشاط اگر جاوداں رہے
ڈوب جانے دو مرے ذہن کو پیمانوں میں   زندگی کیا ہے یہ سوچوں گا تو مر جاؤں گا
راحت میں بھی خلش ہے مصیبت میں بھی خلش   کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی زندگی مجھے
آج کے دور میں انساں کے کئی چہرے ہیں   مسکراتے ہوئے چہروں پہ نہ جاؤ لوگو
دل ان کا نام سن کے دھڑکتا ہے آج بھی   زنجیر ٹوٹ کر بھی چھنکتی ضرور ہے
خاموش ترک عشق و محبت کے بعد بھی   سینے میں کوئی چیز کھٹکتی ضرور ہے
وہ یوں نظروں سے اوجھل ہو رہے ہیں   کہ جیسے دھوپ سمٹی جا رہی ہے
جب میں چلتا ہوں رہ احساس میں   ساتھ چلتی ہیں تری پرچھائیاں

خاموش کے یہاں عشق کا نشاطیہ پہلو بھی نمایاں ہے مگر غم کی دھیمی آنچ بھی بین السطور محسوس ہوتی ہے۔ ان کے کلام میں وہ غنائیت موجود ہے جو رومانی شاعری کے لیے ضروری ہے۔ جمالیاتی حس خاموش کو فطرت سے ودیعت ہوئی تھی اور آزادہ روی کو انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ رومانی فضا انھیں پوری طرح راس آگئی۔ خاموش کو اگر اختر شیرانی کی طرح 'شاعر رومان' کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ان کے یہاں بیشتر وہی عشقیہ شاعری ہے جو اردو غزل کی روایت رہی ہے۔ خاموش رومانیت کے حامل تھے۔ ان کی شاعری پر جگر اور اختر شیرانی کا اثر نمایاں ہے۔ سمندر کی سطح پر کوئی طوفان نہیں ملتا لیکن اس کی تہہ نشیں موجوں میں مسلسل اضطراب پنہاں رہتا ہے۔ یہی کیفیت خاموش کی داخلی زندگی میں تھی۔ ان کی غزلوں میں ذاتی محرومیوں کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔ ایسے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شاید اسی کا نام ہے بیچارگی عشق   سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں اختیار میں
رات تاریک اگر ہے تو خطا رات کی ہے   کیا ستم ہے کہ چراغوں کو سزا دی جائے
ترے فریب مسلسل کے باوجود اے دوست   تری وفا پہ مجھے اعتبار سا کیوں ہے
ہماری صبح پریشاں، ہماری شام الم   خدا کرے کہ تمہاری نظر سے کم گزرے
بیکار مسرت ہے اگر راس نہ آئے   راس آئے کسی کو تو بڑی چیز ہے غم بھی
کہو تم اپنی کہ ترک الفت کے بعد کس کا سہارا ہوگا   ہمارا کیا ہم تو جبر کرکے کبھی کبھی مسکرا ہی لیں گے

خاموش کی حساس طبیعت اور دل کی تہہ میں محبت کی موجیں آتش خاموش بن کر رقصاں تھیں۔ ان کی شاعرانہ شخصیت کی تکمیل میں غم جاناں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اختر شیرانی کی تصوراتی ہیروئن ریحانہ، سلمہ اور عذرا اور مجاز کی نورا کی طرح خاموش کی کوئی تصوراتی محبوبہ نہیں تھی بلکہ ان کی محبوبہ کا وجود تھا جسے انھوں نے جنون کی حد تک چاہا تھا۔ لیکن ناکامی محبت نے خاموش کی زندگی کے شیرازے کو تار تار کردیا اور وہ کہنے پر مجبور ہوئے :

محبت کی شکستہ آرزوؤں کا لہو دے کر   تمہارے تذکرے میں رنگ پیدا کردیا میں نے
اس کیفیت کا نام محبت ہے غالباً   جو کیفیت کسی کو بتائی نہ جا سکے

کس کو معلوم تھا دیکھتے دیکھتے آرزوؤں کے سپنے بکھر جائیں گے
جیسے بادل کا سایہ نہ ٹھہرے کہیں یوں محبت کے لمحے گزر جائیں گے

جہاں پہ ہم نے محبت کے گیت گائے تھے   وہ سوگوار فضائیں سلام کہتی ہیں
مرے سکون کی دنیا کو لوٹنے والے   مری غریب دعائیں سلام کہتی ہیں
تو نے ہی تو جینے کا انداز سکھایا ہے   اے دوست ترے غم کو دیتے ہیں دعا آنسو
جس میں خلش نہ ہو وہ کوئی زندگی نہیں   اچھا ہوا کہ میں نے تمہیں پا کے کھو دیا
وہ بھی تھی ایک زندگی چین نہ تھا ترے بغیر   یہ بھی ہے ایک زندگی میں نے تجھے بھلا دیا

خاموش کے اشعار غم کے گہرے احساس سے آراستہ ہیں۔ زندگی کے ہیجانات کی شدید کشمکش اور اس کے اظہار کو خاموش نے ایک خوبصورت لہجہ عطا کیا ہے۔ ان کے اشعار دل کی دھڑکن بن کر پردۂ سماعت سے ٹکراتے ہیں اور تحت الشعور کے خوابیدہ احساس کو بیدار کرتے ہیں۔ ان کے اشعار ذاتی حالات اور داخلیت کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ بعض اشعار میں شکست زندگی کا احساس بہت گہرا ہوگیا ہے۔ نظم 'ہم سفر چھوٹ گیا' میں خاموش نے محبوب سے بچھڑنے کا ذکر دردانگیز پیرائے میں کیا ہے۔ بند ملاحظہ کیجیے۔

کس کو معلوم تھا انجام سفر سے پہلے
موسم گل کی طرح تو بھی بدل جائے گا
عہد رفتہ کے جنازے پہ سسکنے کے لیے
یاد رہ جائے گی اور وقت نکل جائے گا

بھول جاؤں گا کہ اظہار محبت کرکے
خوبصورت سا کوئی جرم کیا تھا میں نے
بھول جاؤں گا کہ خود تجھ سے اجازت لے کر
تیرے ہونٹوں کو کبھی چوم لیا تھا میں نے

داغ، حسرت، فانی، سیماب اور جگر نے صنف غزل کی کلاسکی روش کو دوام بخشا۔ خاموش کو اس سلسلے کی آخری کڑی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ معروف شاعر و نقاد ظہیر غازی پوری رقمطراز ہیں :

'' خاموش کی شاعری میں عام طور پر محسوس کی جانے والی تمام واردات قلبی کی بازگشت موجود ہے۔ حسن و عشق، کائنات کی طلسمی فضا، ہجر و فراق کے کرب انگیز لمحوں کی خوں آشامی، ذات و کائنات کی ابہامی کیفیات، سیاسی بحران کی اندوہناکی، تہذیبی و معاشرتی قدروں کی زبوں حالی اور عہد رواں میں ٹوٹتے بکھرتے انسانی رشتوں کی اذیت ناکی ایسے موضوعات ہیں جو ان کے قلم کی زد میں بار بار آتے ہیں۔ ان کی شاعری ایسی متوالی خوشبو کے مصداق ہے جو ہر دہلیز سے گزرتی ہے اور ہر ذکی الحس کو قلندرانہ مستی عطا کرتی ہے۔ ایسی شاعری کو بجا طور پر کلاسکی ادبی اقدار کا ایسا آبشار کہہ سکتے ہیں جو نشیب و فراز کی پروا کیے بغیر ہمیشہ رواں دواں ہے۔''

خاموش تاحیات نامساعد حالات سے نبرد آزما رہے۔ حادثے، محبوب کی بے وفائی، تلخ یادیں اور ذاتی غم جزو زندگی بن گئے جن سے نجات پانے کی خاطر انھوں نے اپنی زندگی شراب کی نذر کردی اور بے تحاشہ مے نوشی کرنے لگے۔

یاد جب زخم بن جاتی ہے تو محبوب کو بھلانا آسان نہیں ہوتا۔ غیر ارادی طور پر آنکھوں میں آنسوؤں کے دیے جھلملانے لگتے ہیں جن پر شاعر قابو پانا چاہتا ہے۔

بھیگ جاتی ہیں جو پلکیں کبھی تنہائی میں
کانپ اٹھتا ہوں مرا درد کوئی جان نہ لے
یہ بھی ڈرتا ہوں کہ ایسے میں اچانک کوئی
مری آنکھوں میں تجھے دیکھ کے پہچان نہ لے

ڈھونڈتا ہوں عشق میں تسکین لاحاصل کو میں
کس جگہ پہ پھینک آؤں اضطراب دل کو میں
کاش کوئی لے لے میرے عہد ماضی کے عوض
بیچنے آیا ہوں اپنے حال و مستقبل کو میں

شاعر کو محبوب کی رسوائی منظور نہیں۔ وہ اپنی آنکھوں کو نمناک کرنے اور جذبۂ شوق کو زبان

پر نہ لانے کی قسم کھاتا ہے۔

جذبۂ دل کو کبھی عام نہ ہونے دوں گا
اس فسانے کا اب انجام نہ ہونے دوں گا
اپنی خاطر تجھے بدنام نہ ہونے دوں گا
خود ہر الزام اٹھا نے کی قسم کھاتا ہوں
آج پھر تجھ کو بھلانے کی قسم کھاتا ہوں

غم کی خاموش گھٹاؤں کو نہ چھانے دوں گا
اپنی آنکھوں کو ستارے نہ بنانے دوں گا
آنسوؤں کو کبھی دامن پہ نہ آنے دوں گا
ان چراغوں کو بجھانے کی قسم کھاتا ہوں
آج پھر تجھ کو بھلانے کی قسم کھاتا ہوں

(قرار)

شراب خاموش کو پی چکی تھی اور وہ وہاں پہنچ چکے تھے جہاں سے بازیابی کی کوئی امید نہ تھی۔ شراب بڑے بڑے فنکاروں کو کھا گئی۔ منٹو، اختر شیرانی، عبدالحمید عدم، اسرارالحق مجاز، ساحر لدھیانوی، نریش کمار شاد، ارشاد کاشف اور ناظر خیامی سب کے سب شراب کی نذر ہو گئے۔

شراب پی کر خاموش شاذ و نادر ہی بہکتے تھے۔ ان کے ہوش و حواس قائم رہتے تھے اور کوئی خلاف تہذیب بات ان کی زبان سے نہیں نکلتی تھی۔ ان کے پینے میں بھی ایک سلیقہ اور قرینہ تھا۔ وہ پی کر بھی اخلاق و آدب کو ملحوظ رکھتے تھے۔

خاموش کے کلام میں محبت کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ ان رنگوں کے قوس و قزح میں ان کی زندگی اور زمانے کی بعض حقیقتیں بھی جھلک دکھا جاتی ہیں۔ وہ محبت کو وسیع نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیے:

ایک نعمت ہے محبت بھی مگر — سب کو یہ دیوانگی ملتی نہیں
کچھ نہ سمجھو تو محبت کی نظر کچھ بھی نہیں — اور سمجھو تو محبت کی نظر سب کچھ ہے
اس کیفیت کا نام محبت ہے غالباً — جو کیفیت کسی کو بتائی نہ جا سکے
سچ جو پوچھو تو محبت کے بغیر — زندگی بھر زندگی ملتی نہیں
سچ یہ ہے محبت کا مزا مل نہیں سکتا — جب تک کہ محبت میں رقابت کی کمی ہے
یہ ربط محبت بھی کیا ربط محبت ہے — دل ان کا وہاں دھڑکا آواز یہاں آئی

خاموش کے سرمایۂ سخن کا کچھ حصہ حب الوطنی اور وطن پرستی پر بھی مشتمل ہے۔ انھوں نے چند کامیاب اور موثر نظمیں بھی کہی ہیں جن میں سارے ہندوستانیوں کو ایک قوم سمجھنے کا تصور، ہندوستانی کلچر سے دلی وابستگی اور غازی پور کی تہذیبی روایات کا احترام ملتا ہے۔

ہمیں فصل گل میں بھی باغباں کے ستم اٹھانے پڑے مگر
نہ تو ہم نے ترک وفا کیا نہ چمن کو چھوڑ کے ہم گئے

راز کھل جائے نہ ساقی کی تہی دستی کا — جام خالی سہی ہونٹوں سے لگائے رکھنا
کسی طرح نہ مٹی جب چمن کی تاریکی — لگا دی آگ نشیمن میں روشنی کے لیے

وطن پرستی اور وفا داری کے باوجود شاعر فرقہ پرستوں کی نگاہ میں مشکوک ہے۔ ایسی حالت میں وہ پکار اٹھتا ہے:

کہتے ہو تم ہمیں کہ وفادار ہی نہیں
دل میں ہمارے جذبۂ بیدار ہی نہیں
آزادیِ وطن سے ہمیں پیار ہی نہیں
یعنی ہمارے ہاتھ میں تلوار ہی نہیں
ہم تم سے پوچھتے ہیں وہ انسان کون تھے
عبدالحمید کون تھے عثمان کون تھے

اور دشمنوں کو للکارتا ہے۔

مانگے کے اسلحوں سے ڈرانے کا غم نہیں
طوفان سرحدوں پہ اٹھانے کا غم نہیں
کانٹے قدم قدم پہ بچھانے کا غم نہیں
ہم متحد ہیں ہم کو زمانے کا غم نہیں
مانا کہ آبروئے وطن کا سوال ہے
ہم پہ اٹھائے آنکھ یہ کس کی مجال ہے

خاموش نے کم و بیش 25-20 برسوں تک شاعری کی مگر انھوں نے اس طویل مدت میں بہت کم لکھا۔ ان کا صرف ایک مجموعۂ کلام 'نوائے خاموش' جو 160 صفحات پر مشتمل ہے ظہیر غازی پوری نے 1970 میں ترتیب دیا تھا۔ خاموش میں شعر گوئی کی تمام تر صلاحیتیں موجود تھیں مگر وہ ضرورتاً شعر کہا کرتے تھے اور عام طور پر عوامی پسند اور ذوق کو مدنظر رکھ کر شاعری کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں سادگی اور جذبے کی شدت زیادہ ہے۔

خاموش کم گو شاعر تھے۔ البتہ انھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی اور بات کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ اخلاق و محبت، دوستی و رواداری، ہمدردی و شرافت ان کی شخصیت کا جوہر تھی۔ ہر مکتبہ فکر کے لوگ ان کا احترام اور ان سے محبت کرتے تھے۔ ان کے دوستوں، قدردانوں اور ملاقاتیوں کی تعداد اس لحاظ سے بہت زیادہ تھی کہ وہ عوامی شاعر تھے اور اپنی آواز اور سخن سازی دونوں کے ذریعے بڑی کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ انھوں نے اپنی سحر انگیز آواز کے ذریعے اردو شعر و ادب کی خدمت انجام دی اور اردو کے ایک مخصوص طبقے میں اپنا مقام بنا لیا تھا۔ ہندستان کے بڑے بڑے مشاعروں میں خاموش کی شرکت ناگزیر سمجھی جاتی تھی۔ حقیقتاً وہ مشاعرے کی جان تھے۔ عشق و محبت کے راز و نیاز اور حسن کی دل فریبی کا اظہار کچھ ایسی کیفیت پیدا کرتا کہ سامعین وجد میں آجاتے اور داد و تحسین سے نوازتے۔ ان کی مسحور کن آواز آج بھی کانوں میں رس گھولتی ہے اور آج بھی اہل ذوق حضرات ان کے اشعار گن گناتے ہیں۔ بقول ظہیر غازی پوری:

''خاموش واقعی غازی پور کے مجاز تھے۔''

عوام پسند شاعری وہی ہوتی ہے جو ذہن و دل کو متاثر کرتی ہے۔ اس کی ادبی حیثیت چاہے جو بھی ہو مگر ایسی شاعری عوام میں اس درجہ مقبول ہوتی ہے کہ جابجا لوگ اشعار دہراتے ہیں اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی اور اشک امرتسری کے بہت سارے اشعار زبان زد عام ہیں۔ ہندی شاعری میں دوہے عوامی زبان میں کہے جاتے تھے لہٰذا کبیر، تلسی اور رحیم کے بے شمار دوہے آج بھی لوگوں کو ازبر ہیں۔

بقول ملک زادہ منظور احمد:

'' اردو کی بہترین نظمیں مشاعروں ہی کے ذریعہ عوام تک پہنچیں۔ لہٰذا عوامی شاعری کی حیثیت بھی بہر حال مسلم اور لائق تحسین ہے۔''

خاموش غازی پوری اس لحاظ سے ایک مقبول اور کامیاب شاعر قرار دیے جاسکتے ہیں۔

■

Dr. Masoom Sharqi
At & P.O. : R.L.B.Lane
24-Pgs(N) 743194 (W. B.)

ملک کی تعمیر و ترقی میں اردو زبان و ادب کا کردار

ابوبکر عباد

یقین کیجیے کہ دنیا کے تمام ملکوں کی تعمیر وترقی، وہاں کی تہذیب و ثقافت کی ثروت مندی اور بنیادی انسانی اوصاف کی تشکیل میں زبان وادب نے اولین، اہم اور مثبت کردار ادا کیے ہیں۔ زبان وادب کی اہمیت، ان کا وقار اور ان کی سحر انگیزی انسان کے ابتدائی عہد میں بھی تسلیم شدہ تھی اور آج سائنس اور ٹکنالوجی کے عروج کے زمانے میں بھی مسلم ہے۔ عرب اپنی پاورفل زبان اور معیاری شعروادب کی بنا پر ہی غیر عربی کو عجمی کہتے تھے، اور قرآن کی فصاحت و بلاغت سے متاثر ہوکر اسے شاعری اور صاحب قرآن کو ساحر پکارتے تھے۔ نشان خاطر رہے کہ سائنس وٹکنالوجی بنی نوع انسان کو جسمانی آسائش فراہم کرتی ہے جس کا دوسرا پہلو بہر طور مضرت رساں ہوتا ہے۔ جبکہ زبان وادب روحانی بالیدگی فراہم کرتے ہیں، اخلاقی ترفع عطا کرتے ہیں، جذبات واحساسات کی تزکیہ و تنقیح کرتے ہیں۔

زبان کا کام ایک طرف ابلاغ واظہار ہے تو دوسری جانب یہ شعروادب کا وسیلہ یا میڈیم بھی ہے، جو شعر و ادب میں ڈھلنے کے بعد ذات اور انفراد کی حد سے آگے نکل کر اشخاص بلکہ کائنات کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتی ہے۔ جس ملک اور قوم کی زبان جتنی زیادہ ثروت مند ہوگی اس کا ادب اتنا ہی بلند معیار اور ملک وقوم کی تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی تعمیر وترقی میں سود مند ہوگا۔ (یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ کسی بھی زبان کو پرقوت اور ثروت مند شعروادب ہی بناتے ہیں) زبان وادب ایک طرف عوام الناس کے لیے محبت و اخلاص اور امن و یکجہتی کی خدمات انجام دیتے ہیں تو دوسری جانب زبان وادب کو قدیم زمانے سے ظالم و غاصب اقتدار کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کرنے کا بھی رواج رہا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ جنگی اسلحوں کے ذریعے ملک وقوم کو وقتی طور پر غلام بنایا جاسکتا ہے، لیکن زبان وادب سے ذہن و دل کو جیتا جاسکتا ہے، بغاوت کے شعلے بھڑکائے جاسکتے ہیں، بڑے سے بڑا انقلاب بپا کیا جاسکتا ہے، ملک وقوم کو فتح کیا جاسکتا ہے اور کھوئے ہوئے ملک کو واپس حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کی دو مثالیں 'مقدمہ شعروشاعری' میں مولانا الطاف حسین حالی نے بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ: 'ایتھنز' سے جنگ لڑ کر 'مگارا' والوں نے جزیرۂ سیلمس کو جیت لیا تھا۔ ایتھنز والوں نے اپنے ہارے ہوئے جزیرے کو واپس حاصل کرنے کے لیے مگارا سے متعدد جنگیں لڑیں لیکن ہر بار انھیں شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ اور بالآخر ایتھنز والوں نے تمام تر حوصلہ کھونے کے بعد طے کیا کہ اس ذلت آمیز شکست والی جنگ کا ذکر کرنے یا پھر سے جنگ پر ابھارنے والے شخص کو قتل کردیا جائے گا۔ لیکن وہاں کے شاعر سولن کو ملک کی یہ شکست آمیز ذلت قبول نہ تھی۔ وہ جزیرۂ سیلمس کو کھونے کے بعد عرصے تک پاگلوں کا بھیس بنا کر گھومتا اور لوگوں کو غیرت دلانے اور ان میں نیا جوش وولولہ پیدا کرنے والے اشعار سناتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایتھنز والوں نے نئے جوش و ولولے کے ساتھ ایک بار پھر جنگ کی تیاری کی اور اپنا ہارا ہوا جزیرہ سیلمس واپس جیت لیا۔ دوسری مثال انھوں نے بائرن کی مشہور نظم 'چائلڈ ہیرالڈ پلگرمیج' کی دی ہے جس کے ایک حصے میں شاعر نے فرانس، انگلستان اور روس کو غیرت دلائی ہے کہ ان ملکوں نے یونان کے علم وحکمت سے اتنا فائدہ اٹھایا لیکن آج جب کہ یونان کو ترکوں نے غلام بنا رکھا ہے یہ ممالک یونان کی آزادی کے لیے کچھ نہیں کرتے، ساتھ ہی یونانیوں کو بھی غیرت دلائی گئی ہے کہ دوسروں کے سہاروں پر امید رکھنے کے بجائے اپنے دست وبازو پر بھروسہ کرکے ترکوں سے آزادی کی جدوجہد کریں۔ 1812 میں اس نظم کے شائع ہوتے ہی پورے یورپ میں اس کی دھوم مچ گئی۔ یوروپ والوں نے اس نظم کو حرز جاں بنایا اور بالآخر 1827 میں فرانس، انگلستان، آسٹریا، اٹلی اور روس کی متحدہ فوج نے ترکی سے یونان کو آزاد کرالیا۔ اسی طرح ساؤتھ افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فاموں کو جس طور گوروں نے غلام بنایا اور انھیں غیر انسانی سطح پر جینے کے لیے مجبور کر رکھا تھا یہ دنیائے انسانیت کی المناک تاریخ ہے۔ یقین کیجیے کہ تاریخ کے اس سیاہ باب کو منور کرنے اور سیاہ فاموں کو انسانی سطح پر لانے والے بغاوت وانقلاب میں شعروادب کا زبردست کردار ہے، جسے ادبی تاریخ میں بلیک لٹریچر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ امریکن فکشن نگار ہارپر لی (Harper Lee) کے دو ناول: To kill a mocking bird اور Go set a watch man اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

تاریخی ثبوت کی بنا پر یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اردو زبان وادب ملک کی تعمیر وترقی میں دنیا کے کسی بھی ملک کی زبان، وہاں کی صحافت اور وہاں کے شعروادب سے کسی بھی طور کم نہیں، بلکہ ان سے چند قدم آگے ہی ہے۔ اردو زبان وادب نے جدوجہد آزادی، انسداد فسادات، انسانیت کی بقا، علم وحکمت کی اشاعت، سماجی و مذہبی ہم آہنگی کے فروغ اور ملک کی تعمیر وترقی میں مذکورہ مثالوں سے کہیں زیادہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ذرا لمحے بھر کو یاد کیجیے سرسید احمد خاں کی قائم کردہ ایشیاٹک سوسائٹی، حیدرآباد کا 'دارالترجمہ' اور دلی کالج کے ورناکلر سوسائٹی کو جہاں کے سائنسی، تاریخی، زراعتی، معدنیاتی، صنعتی، طبی، اور دوسرے متعدد جدید علوم وفنون کی کتابوں کے اردو ترجموں کو؛ جن سے حاصل شدہ نتائج پر نئے ہندوستان کی تعمیر وترقی کی پُرشکوہ عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ اس میں کوئی

شک نہیں کہ ان اردو ترجموں نے ہمارے ملک کو میڈیکل سائنس، اگریکلچر، زراعت، عمارت سازی، معاشی نظام، سیاسی سوجھ بوجھ اور گھریلو صنعت وحرفت میں خود کفیل ہونے کے راستوں کو پایاب، آسان اور جلد حصول بنایا۔ دنیا کی تاریخی اور تہذیبی کتابوں کے اردو ترجموں نے ملک کی عوام کو مہذب ومتمدن بنانے میں اہم کردار نبھایا اور جدید علوم وفنون کے حصول کی طرف راغب کیا۔ گیتا، رامائن، مہابھارت، بائبل، گروگرنتھ صاحب، اور بدھ صحیفے 'دھمپد' کے علمی اور ادبی اردو ترجموں کو بھی ذہن میں رکھیے کہ ان ترجموں نے مختلف النوع مذہبوں، فرقوں اور قبیلوں والے وطن عزیز کے باشندوں کو یہ پیغام دیا کہ کسی بھی مذہب کے راستے کو آپ اختیار کریں، منزل سب کی ایک ہے، تعلیم سب کی مساوی ہے۔ سچائی، ایمانداری، انصاف، برابری، دلداری اور فلاح انسانیت۔ اردو کے ان منثور اور منظوم ترجموں نے یہ ثابت کیا اور عوام کو یقین دلایا کہ تمام مذاہب اور فرقوں کے پیروکاروں کی مثال ان اینٹوں کی مانند ہے جو ملک وقوم کی عظیم الشان عمارت کو نہ صرف حسن ومضبوطی اور وقار عطا کرتی ہیں بلکہ اسے قائم ودائم بھی رکھتی ہیں۔

ملک کے پہلے اردو شاعر حضرت امیر خسرو نے وطن عزیز کو نہ صرف ایک نئی زبان میں صوفیانہ شاعری، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں دیں بلکہ ہندوستانی موسیقی کو اپنی ایجاد کردہ متعدد راگ راگنیوں سے سجایا، اسے مالا مال کیا۔ دنیا کے چار مشہور ومقبول ڈشوں (کھانوں) میں ایک 'مغلیہ ڈش' ہے جو خالص اردو تہذیب کی دین ہے۔ ہندوستان میں چار طرح کے طریقۂ علاج رائج چلے آرہے ہیں۔ ایک آیورویدک، دوسرا یونانی، تیسرا ہومیوپیتھک اور چوتھا ایلوپیتھک۔ سو یقین کیجیے کہ ہندوستان میں یونانی طریقۂ علاج کو رائج کرنے اور فروغ دینے میں اردو زبان کا ناقابل فراموش حصہ ہے۔ اس کی بیشتر کتابیں اردو میں ہیں، نسخے اردو میں لکھے جاتے ہیں، اس کی زیادہ تر اصطلاحیں اردو کی ہیں اور دواؤں کے نام بھی۔

ہندوستان کے نوابین اور شاعر بادشاہوں نے صرف اردو شاعری کو تشبیہ واستعارات اور تلمیحات کے زیوروں سے آراستہ نہیں کیا، بلکہ ملک کی تعمیر وترقی میں بے بہا اضافے کیے، تہذیب وثقافت کو ثروت مند بنایا، اصول حکمرانی وضع کیے اور تعمیرات اور باغات سے ملک کو دلہن کی مانند سجایا، سنوارا۔ شاہ آفتاب عالم ثانی کی داستان 'قصہ مہر افروز ودلبر' محض ایک داستان نہیں، آداب شاہی اور اصول حکمرانی کی کتاب بھی ہے۔

ہمارے سامنے واجد علی شاہ کی تصویر ایک عیاش نواب کی صورت پیش کی گئی، جب کہ اس نے اردو شاعری، ڈرامہ نگاری اور اداکاری کو ایک نئی سمت دی جس نے بعد میں تھیٹر اور سنیما کے لیے زمین ہموار کی۔ جسے آگے چل کر اردو شاعر اور ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری نے تھیٹر کی صنعت کے بطور ترقی دی اور ہندوستان کے شیکسپیئر کہلائے۔ واجد علی شاہ ایک بہترین منتظم بھی تھے جنھوں نے متعدد انتظامی اصلاحات کیں اور پہلی بار فوج کی ڈرل کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح دکن کے بادشاہ اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ نے اپنی شاعری میں غالباً سب سے پہلے ملک کی محبت اور یہاں کی تہذیب و ثقافت کو بیان کیا، تشبیہ واستعارے کے لیے دیسی الفاظ کا استعمال کیا۔ عوام کے لیے ہسپتال، درسگاہیں اور خوبصورت عمارتیں بنوائیں، نہریں کھدوائیں، باغات لگوائے۔ اردو کے ایک اور شاعر علی عادل شاہ نے کئی راگ راگنیاں ایجاد کیں، راگوں کی دھن کو بنیاد بنا کر شاعری لکھی جو طریقہ اب فلمی گانے لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ علی عادل شاہ نے راگ، راگنیوں سے متعلق اردو میں کتاب 'نورس' بھی تحریر کی جو موسیقی کے فن پر بڑی ہی اہم اور انوکھی کتاب ہے۔ بہادر شاہ ظفر اردو کے آخری شاعر بادشاہ تھے۔ انھوں نے بے کسی اور ضعیف العمری کے باوجود انگریزوں کے خلاف مشترکہ عسکریت

دلی کالج کے استاذ ماسٹر پیارے لال کے محب وطن اور علی گڑھ سے سرسید احمد خاں کے جاری کردہ رسالے 'تہذیب الاخلاق' اور 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کو بھلا کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے کہ ان رسائل نے نئے تعلیمی، سیاسی، ادبی اور سائنسی خیالات عام کیے اور سماجی، معاشی اور معاشرتی اصلاح اور علوم کو فروغ دے کر ایک نئے ترقی یافتہ ہندوستان کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا۔

ملک کے پہلے اردو شاعر حضرت امیر خسرو نے وطن عزیز کو نہ صرف ایک نئی زبان میں صوفیانہ شاعری، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں دیں بلکہ ہندوستانی موسیقی کو اپنی ایجاد کردہ متعدد راگ راگنیوں سے سجایا، اسے مالا مال کیا۔

پسند ہندوستانی رہنماؤں کو ایک پلیٹ پر فارم پر جمع کیا اور 1857 کی جنگ آزادی کی قیادت سنبھالی۔

1857 کی جنگ آزادی کے ہندوستانیوں کے تیار کیے ہوئے غالباً تمام تر دستاویزات یا تو اردو میں ہیں یا پھر فارسی میں۔ 1857 سے لے کر 1947 تک وطن عزیز کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے میں مذہبی، سیاسی اور عسکری تنظیموں اور ان کے جانباز مجاہدین کی جدوجہد اور ان کی عظمتوں سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے، لیکن تسلیم کیجیے کہ ان کے ذہنوں میں وطن عزیز کی عظمت ووقار کی بحالی کے دیے اور دلوں میں آزادی کے چراغ روشن کرنے میں اردو زبان، اردو شاعری، اردو صحافت، آزادی وطن سے متعلق اردو کے مذہبی لٹریچر اور اردو شعر وادب نے غلام قوم کے جسم وجاں کی سوکھتی رگوں میں تازہ خون دوڑانے کا کام اور دلوں میں وطن کو آزاد کرانے کا شعلہ بھڑکایا۔ اردو زبان میں انگریزوں کے خلاف پوسٹر شائع کیے گئے، فتوے جاری کیے گئے، اخبارات نکالے گئے اور شعر وادب کے ذریعے دشمنوں کے خلاف ملک واسیوں کے دلوں میں جذبۂ جہاد اور آزادی کی دیوانگی پیدا کرنے کا کام کیا گیا۔ اردو زبان وادب نے یونانی شاعر سولن اور انگریزی شاعر بائرن کی نظموں اور 'بلیک لٹریچر' سے کہیں زیادہ زود اثر، پُرقوت اور جوشیلے طریقے سے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی ذہن سازی کی، انھیں منظم کیا، اور ان کے دلوں میں وطن عزیز کی آزادی کے حصول کے لیے تن، من، دھن کی بازی لگا دینے کا ولولہ بخشا۔

تسلیم کیجیے کہ دارالعلوم دیوبند جس کے بنیادی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ملک کی آزادی اور مجاہدین آزادی کی تیاری کا مشن تھا اسے اردو زبان کے معلمین و مصنفین نے قائم کیا۔ یہیں سے انگریزوں کے خلاف ریشمی رومال کی تحریک چلی اور جمعیۃ العلماء ہند جیسی تنظیم عمل میں آئی جو آج تک ملک وقوم کی خدمت میں مصروف ہے۔

دلی کالج کے استاذ ماسٹر پیارے لال کے محب وطن

اور علی گڑھ سے سرسید احمد خاں کے جاری کردہ رسالے 'تہذیب الاخلاق' اور 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کو بھلا کیسے فراموش کیا جاسکتا ہے کہ ان رسائل نے نئے تعلیمی، سیاسی، ادبی اور سائنسی خیالات عام کیے اور سماجی، معاشی اور معاشرتی اصلاح اور علوم کو فروغ دے کر ایک نئے ترقی یافتہ ہندوستان کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا۔

ہمارے عہد میں عورتوں کی تعلیم، تانیثیت اور نسائی ادب پر اونچے سروں میں گفتگو کرنے اور پہلا مضمون اور پہلی کتاب لکھنے کا دعوی کرنے یا انھیں مغرب کی دین سمجھنے والے شاید یہ نہیں جانتے کہ جب دنیا کے بیشتر ممالک بالخصوص ہندوستانی سماج میں عورتوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا تھا، انھیں حصول تعلیم بلکہ حروف شناسی تک سے دور رکھا جاتا تھا اس زمانے میں اردو ادیب اور اردو زبان وادب نے ہی عورتوں کی تعلیم کے لیے تحریک چلائی، ان کے پڑھنے کے لیے سازگار حالات اور اسباب وجواز فراہم کیے۔ ان میں تین نام بے حد اہم ہیں۔ ایک دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ مولوی ممتاز علی، دوسرا دلی کالج کے پڑھے ہوئے مولوی نذیر احمد اور تیسرا مولانا الطاف حسین حالی۔ مولوی نذیر احمد مغرب اور مغربی تعلیم سے بھی متاثر تھے، جب کہ مولوی ممتاز علی مغرب سے بے پرواخالص مشرقی اور مذہبی انسان تھے۔ مولوی ممتاز علی نے ہندوستان میں عورتوں کے لیے پہلی بار اردو زبان میں 'تہذیب نسواں' کے نام سے رسالہ جاری کیا، جس میں عورتوں کی تعلیم کی وکالت ہوتی، عورتوں کو تعلیمی حقوق سے آگاہ کیا جاتا تھا اور انھیں لکھنے پڑھنے کی طرف رغبت دلائی جاتی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ رسالے کی ایڈیٹر خاتون تھیں اور مضمون نگار بھی غالباً تمام یا بیشتر عورتیں ہی ہوتی تھیں۔ حقوق نسواں نام سے انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی جس میں عورتوں کے حقوق کو مردوں کے حقوق کے برابر ثابت کیا گیا ہے۔

مولوی ممتاز علی نے عورتوں کے لیے مشن چلایا، رسالے نکالے تو مولوی نذیر احمد نے پہلی بار لڑکیوں کے لیے 'مراۃ العروس' کے عنوان سے اردو کا پہلا باضابطہ ناول لکھا، ان کی تعلیم وتربیت کے لیے فکشن تحریر کیا۔ عورتوں کے حقوق کی بازیافت، ان کی سماجی اہمیت و وقار، ان کی تعلیم وتربیت اور ان کی خود مختاری کے حوالے سے ہندستان کے اولین ترقی پسندوں میں سے ایک بے حد اہم نام خواجہ الطاف حسین حالی کا ہے۔ یہ اپنے وقت کے عظیم اردو شاعر، ادیب اور مصلح ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے نہ صرف عورتوں کی تعلیم اور ان کے حقوق کی بحالی کی وکالت کی بلکہ 'چپ کی داد' اور 'بیوہ کی فریاد' لکھ کر بیوہ عورتوں کی دوسری شادی اور ان کے جنسی حقوق کی طرف بھی سماج کے ذہن کو متوجہ کیا۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے پہلا اسکول بھی اردو فکشن نگار رشید جہاں کے والد شیخ عبداللہ نے کھولا تھا جو خود علی گڑھ میں رچنے بسنے والی اردو تہذیب و ثقافت کے پروردہ تھے۔

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ملک سے عشق، ملک کے تیج تیوہاروں اور یہاں کے مختلف پیشوں سے محبت، آپسی یگانگت وشفقت، اتحاد واتفاق، میل جول اور بھائی چارے کے فروغ کی جیسی مثال اردو زبان، اردو شاعروں اور اردو شاعری نے قائم کی ایسی مثالیں دنیا کی کم زبانوں میں ملیں گی۔ اس حوالے سے نظیر اکبرآبادی، علامہ اقبال اور پنڈت برج نرائن چکبست کو روشنی کے مینار کہنا چاہیے۔

اردو زبان وادب کی پہلی باضابطہ اور منظم تحریک 'انجمن ترقی پسند مصنّفین' اپنے منشور میں شعروادب میں عوامی مسائل داخل کرنے، ان کے لیے لکھنے، ملک اور معاشرے سے تمام طرح کے کرپشن، نابرابری، توہم پرستی اور ظلم و زیادتی کو ختم کرنے کے علاوہ اس کا ایک اہم اور بنیادی مقصد وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا بھی تھا۔ ملک میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی ادبی تحریک تھی جس میں جنگ آزادی کو زبان وادب کا لازمی حصہ بنایا گیا اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس تحریک نے اپنا کام بخوبی ادا بھی کیا۔

ہندوستانی سنیما کو بے حد بڑی اور منفعت بخش انڈسٹری بنانے کا کردار اگر کسی نے ادا کیا ہے تو وہ ہے اردو زبان وادب۔ اردو زبان وادب نے فلم انڈسٹری کو صرف مالی منفعت اور روزگار فراہم کرنے کا ہی ادارہ نہیں بنایا بلکہ پیغام رسانی، مثبت سوچ کے فروغ، قانون کی بالادستی کے قیام، مشترکہ تہذیب وثقافت کے استحکام اور ملک وقوم کو ہر اعتبار سے تعمیر وترقی کی طرف گامزن کرنے کا ایک ایسا وسیلہ بنا دیا جس کی مثال نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

کے۔ آصف، کمال امروہوی، شہیر ریاض، مظفر علی، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، محمد رفیع، مجروح سلطان پوری، اور ساحر سے لے کر سلیم خان اور جاوید اختر تک نے فلم انڈسٹری کو ترقی کے جس بام عروج تک پہنچایا ہے اسے فلمی دنیا کی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ فلمی نغمے، محفلوں میں گائی جانے والی غزلیں اور مشاعروں نے موسیقی اور شاعری کے حوالے سے ہندوستان کی عالمی شہرت میں خاطرخواہ اضافہ کیا ہے۔ اسی طرح اردو زبان وادب نے ٹی۔ وی سیریلز کو ایک نئی فکر اور بلند مقام عطا کیا ہے اور عوام میں مقبول بنایا۔ اس تعلق سے رامانند ساگر اور راہی معصوم رضا سے لے کر علی سردار جعفری اور زماں حبیب تک کی خدمات قابل ستائش ہیں۔

یہ بھی تسلیم کیجیے کہ اردو زبان وادب نے زندگی گزارنے کا ایک طریقہ، نشست وبرخاست کے آداب اور گفتگو کا سلیقہ بھی سکھایا ہے۔

کچھ معصوم دوست یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ بعض معصوم دوست اسے پاکستان کی زبان مانتے ہیں۔

اب اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان یا غیر ملکی زبان کہنے والے معصوموں کو کون سمجھائے کہ یہ عربی اور فارسی زبان کی طرح نہ تو عرب اور ایران سے آئی ہے، نہ انگریزی کی مانند انگلینڈ اور امریکہ سے۔ خوب جان لیجیے کہ اردو دراصل مغربی ہندی کے بطن سے جنم لینے والی وہ زبان ہے جو صرف اور صرف ہندوستان میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور پھل پھول رہی ہے۔ اس زبان نے تمام لوگوں کی طرح تمام زبان کے لفظوں کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی اور اپنی خدمات ملک کے تمام شعبوں کے لیے وقف کیں، انھیں ثروت مند اور خود کفیل بنایا۔ خواہ عدلیہ ہو یا مقننہ، یا پھر انتظامیہ اور ذرائع ابلاغ۔ آج بھی عدلیہ اور فوجداری کی تمام تر نہ سہی بیشتر اصطلاحیں اردو زبان کی دین ہیں۔ سو اس زبان نے ملک کی محبت، اتحاد اور گنگا جمنی تہذیب کے قیام، حصول آزادی کی جدوجہد، مشرقی تعلیم، صحافت، سنیما اور ذرائع ابلاغ کے فروغ، وطنیت کے تصور اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی تشکیل اور ملک کی ہمہ جہت تعمیر وترقی میں جو کردار ادا کیے ہیں اس کا مکمل اظہار محض ایک مضمون میں بھلا کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔

■

Abu Bakar Abbad
Dept. of Urdu,Delhi University
Delhi - 110007
Mob.:9810532735
bakarabbad@yahoo.co.in

فیروز عالم

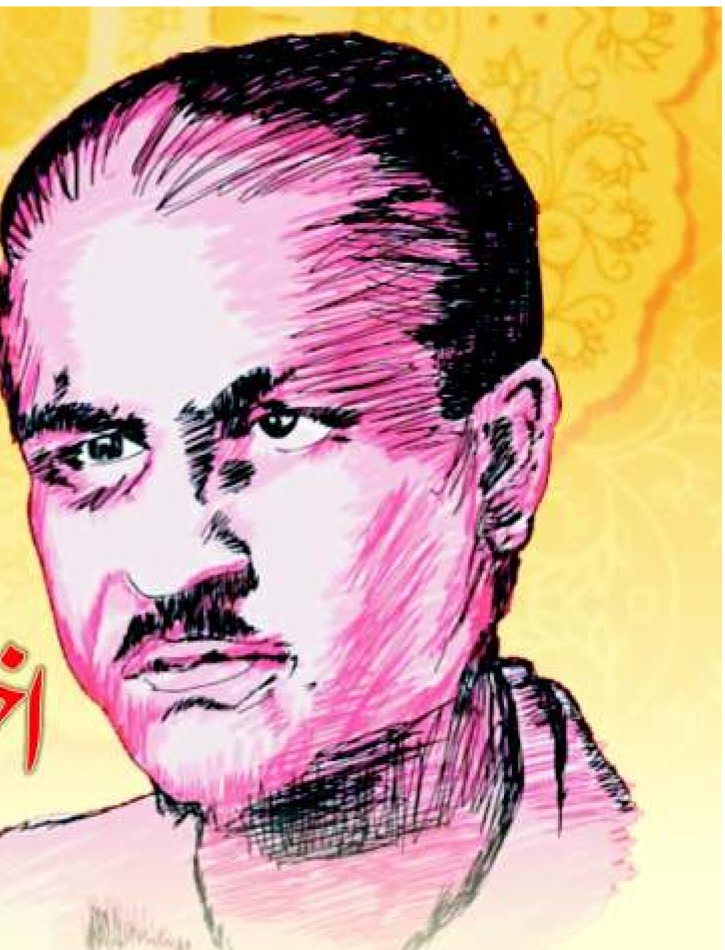

اختر شیرانی کی نظم نگاری

اردو میں رومانی شاعری کی ایک طویل روایت رہی ہے۔ اردو شاعری کے ابتدائی دور سے ہی دکن میں قلی قطب شاہ، ولی، سراج اور شمالی ہند میں فائز، مضمون اور یک رنگ کے کلام میں رومانیت کے نقوش ملتے ہیں۔ بعد کے دور میں غالب، مومن، اقبال، عظمت اللہ خاں، جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، روش صدیقی، اسرار الحق مجاز، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، معین احسن جذبی، جگر مرادآبادی، حسرت موہانی، فراق گورکھ پوری اور فیض احمد فیض کی شاعری میں بھی رومانی عناصر ملتے ہیں۔ لیکن اردو کا سب سے بڑا رومانی شاعر ہونے کا اعزاز اختر شیرانی کے سر ہے۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں وہ واحد ایسے شاعر ہیں جن کا پورا کلام رومانیت سے بھرپور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اردو شاعری میں رومانیت کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'پھولوں کے گیت' 1936 میں شائع ہوا جو بچوں کی نظموں پر مشتمل ہے۔ 'نغمۂ حرم' 1939 میں چھپا۔ اس میں عورتوں اور بچوں کے لیے نظمیں ہیں۔ تیرہ سانیٹ اور چار نظموں پر مبنی شعری مجموعہ 'شعرستان' 1941 میں اور رومانی نظموں کا مجموعہ 'صبح بہار' 1945 میں منظر عام پر آیا۔ 'اخترستان' (1946) اور 'لالۂ طور' (1947) میں نظمیں اور سانیٹ ہیں جبکہ 'طیور آوارہ' (1946) میں غزلیں، گیت اور رباعیاں اور 'شہناز' اور 'شہروز' (1949) میں نظمیں، غزلیں، ماہیے، نعتیں اور سانیٹ ہیں۔ اختر شیرانی (1905-1948) نے اگرچہ نہایت مختصر عمر پائی۔ وہ صرف 43 برس جیے لیکن اس عرصے میں انھوں نے اچھا خاصا کلام یادگار چھوڑا۔

اپنی تخلیقات کی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر وہ اپنے عہد میں مقبول ہوئے اور آج بھی پسند کیے جاتے ہیں۔

اختر شیرانی کی شاعری میں اگرچہ رومانیت کی تمام خصوصیات نہیں ملتیں لیکن جوش و جذبہ، فطرت سے لگاو، عشق و محبت اور خیال آرائی وغیرہ خوبیاں ان کے کلام میں کثرت سے موجود ہیں۔ اختر شیرانی کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں محبوبہ کے طور پر عورت کا ذکر تانیثی صیغے میں کیا اور اردو شاعری کو متعدد نسوانی کرداروں سے متعارف کرایا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کے زمانے میں اردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ عربی بھی سیکھی تھی اور عربی ادب کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ عربی شاعری کی روایت پر ان کی گہری نظر تھی۔ عربی شعر و ادب میں عورت سے اظہار عشق معیوب نہیں ہے۔ اختر شیرانی نے اس روایت سے استفادہ کرتے ہوئے اردو میں محبوبہ کو عورت کی جنس میں پیش کیا۔ ان سے قبل اردو شاعری میں محبوبہ کی جنس اس قدر واضح نہیں تھی۔ دبستان دہلی کے شعرا نے عشقیہ مضامین میں محبوب کی جنس واضح نہیں کی۔ لکھنوی شعرا نے محبوبہ کی جنس کی تخصیص ضرور کی لیکن انھوں نے جنس مذکر استعمال کی اور سراپا مونث کا پیش کیا۔ اختر شیرانی نے پہلی بار سلمیٰ، عذرا، ریحانہ اور شیریں وغیرہ ناموں کے ذریعے محبوبہ کی جنس واضح کی۔ سلمیٰ ان کا سب سے توانا کردار ہے جو ان کی زندگی کا مرکز و محور ہے۔ اختر شیرانی کی محبوبہ میں نسوانی حسن کی تمام خصوصیات ملتی ہیں۔ ان کی محبوبہ میں مشرقی تصور حسن و جمال، شرم و حیا، پاکیزگی اور ناز و ادا کی خوبیاں ملتی ہیں۔ اختر شیرانی نے اپنی نظموں میں عورت سے جس محبت کا اظہار کیا ہے اس میں خلوص، سچائی اور زندگی کو خوب صورت بنانے کا جذبہ ملتا ہے۔

اختر شیرانی کی شاعری میں عشق کا جسمانی تصور ملتا ہے۔ جس طرح ان کی محبوبہ گاؤں کی ایک الھڑ لڑکی ہے اسی طرح ان کا عشق اور ان کے جذبات و احساسات بھی عام انسان کے ہیں۔ انھوں نے عشق کے روایتی تصور کے بجائے فطری جذبات و احساسات کی عکاسی کی۔ ان کی شاعری میں عریانی اور فحاشی نہیں ملتی۔ وہ جنسی جذبات کا اظہار بھی مہذب انداز میں کرتے ہیں۔ وہ عشق کو گناہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے انسان کا فطری جذبہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عشق کی مختلف کیفیات مثلاً ہجر، وصال، انتظار اور درد و کرب کے ساتھ ساتھ صداقت اور والہانہ پن کا اظہار فطری انداز میں ملتا ہے۔ نظم 'اعتراف محبت' کا ایک بند بطور مثال پیش ہے۔

جب رات کی بے کس تنہائی میں، آپ کو تنہا پاتا ہوں
میں بربط دل سے سوز و گدازِ عشق کے نغمے گاتا ہوں
اتنا تو بتا دو تم بھی مجھے، کیا میں بھی کبھی یاد آتا ہوں
بتلاؤ کہ منت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

دیگر رومانوی شعرا کی طرح اختر شیرانی کی نظموں میں بھی تخئیل اور جذبات کی فراوانی ملتی ہے۔ان کے تخئیل کا محور حسن ہے۔وہ کبھی جنت سے زمین پر بہاریں بھیجنے کی گزارش کرتے ہیں، کبھی آسمان سے اپنے ستاروں کو زمین پر بچھانے کی التجا کرتے ہیں اور کبھی فطرت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بادل کے ٹکڑوں کو رقص کا حکم دے۔نظم' انتظار' میں کہتے ہیں۔

زمیں پر بھیج دے آج اے بہشت اپنی بہاروں کو
بچھا دے خاک پر اے آسماں اپنے ستاروں کو
خرام و رقص کا دے حکم فطرت ابر پاروں کو
وہ بے خود چاند کی نظروں سے گھبرائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

دردوغم اور جذبات کی عکاسی بھی اختر شیرانی کی نظموں کی اہم خصوصیت ہے۔'آج کی رات'،'اے عشق کہیں لے چل'، 'اودیس سے آنے والے بتا'اور'جہاں ریحانہ رہتی تھی' میں کچھ کھو جانے کا احساس اور درد انگیز فضا ملتی ہے۔نظم' آج کی رات' کا ایک بند بطور نمونہ درج ہے۔

ہم میں کچھ جرأت گویائی بھی ہوگی کہ نہیں
ہمت ناصیہ فرسائی بھی ہوگی کہ نہیں
شرم سے دور شکیبائی بھی ہوگی کہ نہیں
آج کی رات! اف اومیرے خدا، آج کی رات!

والہانہ پن اور بے خودی بھی اختر شیرانی کی نظموں کے نمایاں اوصاف ہیں۔ان کا کمال یہ ہے کہ وہ جس کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں اس کی ایسی تصویر لفظوں کے ذریعے کھینچ دیتے ہیں کہ قاری آسانی سے اس کیفیت سے آشنا ہو جاتا ہے۔وہ خارجی جذبات اور محسوسات کو بھی داخلی رنگ و آہنگ عطا کر دیتے ہیں۔وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں اسے فطری انداز میں جوں کا توں بیان کر دیتے ہیں۔نظم' انتظار' میں کہتے ہیں۔

تمنا اور حیا کی کش مکش کیوں کر مٹاؤں گا
میں اس کے یاسمیں پیکر کو کیسے گدگداؤں گا
اور اس کے لعل لب سے کس طرح بوسے چراؤں گا
وہ پھولوں اور ستاروں سے بھی شرمائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

سیدھے سادے انداز میں جذبات کی عکاسی کا یہ طریقہ اختر شیرانی کی نظموں کو تصنع سے محفوظ رکھتا ہے۔ان کی بات دل سے نکلتی ہے اور قاری کے دل میں بیٹھتی ہے۔

اختر شیرانی کی نظموں میں پیکر تراشی کے بھی عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ وہ ایسی تصویریں بناتے ہیں اور اس سلیقے سے کوئی منظر پیش کرتے ہیں کہ وہ پورا منظر قاری کی آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔نظم' اودیس سے آنے والے بتا' کے دو بند ملاحظہ کیجیے۔

اودیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر پنہاریاں پانی بھرتی ہیں
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر سب ماتھے پہ گاگر دھرتی ہیں
اور اپنے گھر کو جاتے ہوئے ہنستی ہوئی چہلیں کرتی ہیں
اودیس سے آنے والے بتا
اودیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی فجر دم چرواہے ریوڑ کو چرانے جاتے ہیں
اور شام کے دھندلے سایوں کے ہمراہ گھروں کو آتے ہیں
اور اپنی رسیلی بانسریوں میں عشق کے نغمے گاتے ہیں
اودیس سے آنے والے بتا

اختر شیرانی نے منظر نگاری کرتے ہوئے بے جان چیزوں میں بھی جان ڈال دی ہے۔

کھجوروں کے حسیں سائے زمیں پر لہلہاتے تھے
ستارے جگمگاتے تھے، شگوفے کھلکھلاتے تھے

اگرچہ اختر شیرانی کی شاعری کا بیشتر حصہ عشق اور واردات عشق پر مبنی ہے لیکن انھوں نے وطن دوستی، قوم پرستی اور فطرت نگاری پر بھی توجہ دی ہے۔'ساقی اٹھ تلوار اٹھا'، 'نذرِ وطن'، 'اے ابر رواں'، 'آزادی'، 'نغمۂ امن'، 'دلیران وطن'، 'وطن کے شہیدانِ جنگ' اور 'موسم بہار' اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ان کی مختصر نظم 'عشق و آزادی' کے مطالعے سے ان کی حب الوطنی کا اندازہ ہوتا ہے۔

عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے
عشق میری جان آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کردوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

'ساقی اٹھ تلوار اٹھا' اپنی نوعیت کی غالباً پہلی نظم ہے جس میں شاعر نے امن عالم کے قیام، جنگ وجدل اور خوں ریزی کے خاتمے اور وطن کی آزادی کے لیے تلوار اٹھانے کی تلقین کی ہے۔اختر شیرانی کو اپنے وطن اور اس کی مٹی سے بہت محبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں اپنی دھرتی کی سوندھی خوشبو ملتی ہے۔وطن کی ہر شے اور ہر نظارے پر ان کی نظر جاتی ہے۔کبھی وہ رہٹ کی آواز سننے کے متمنی نظر آتے ہیں، کبھی اسکول کے زمانے کے ساتھیوں کو یاد کرتے ہیں اور کبھی دیہاتی لڑکی کے شب و روز کا ذکر کرتے ہیں۔نظم 'نغمۂ سحر' کے چند اشعار دیکھیے۔

سنو یہ کیسی آواز آرہی ہے — کوئی دیہاتی لڑکی گا رہی ہے
اٹھی ہے شاید آٹا پیسنے کو — کہ چکی کی صدا بھی آرہی ہے
غموں سے چور اپنے ننھے دل کو — ترانہ چھیڑ کر بہلا رہی ہے

اختر شیرانی کی شاعری میں حالات سے فرار اور ہجرت کی آرزو ملتی ہے۔وہ اس دنیا سے دور ایک نئی دنیا بسانے کے آرزومند ہیں۔ان کی شاعری میں کوشش اور عمل کے جذبے کا فقدان ہے۔وہ یہ دنیا بدلنا تو چاہتے ہیں لیکن ان میں حالات کا مقابلہ کرنے کا جذبہ اور حوصلہ نہیں ہے۔وہ ناسازگار حالات سے پریشان ہو کر حسن و عشق کی دنیا میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔وہ ایک ایسی جگہ بسنا چاہتے ہیں جہاں عورت اور فطرت دونوں کا حسن موجود ہو۔

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہہ عالم سے، لعنت گہہ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے، اس نفس پرستی سے
دور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

فن کے اعتبار سے اختر شیرانی کی شاعری بہت اہم ہے۔ان کی نظمیں سبک اور شیریں الفاظ کے استعمال، موسیقیت اور غنائیت، دلکش تراکیب، تشبیہات کے خلاقانہ استعمال، پیکر تراشی، منظر نگاری اور مختلف ہیئتوں کے موزوں استعمال کی وجہ سے نمایاں نظر آتی ہیں اوراپنی انوکھی تاثیر رکھتی ہیں۔آتش لکھنوی کی طرح وہ بھی شاعری کو مرصع سازی کا فن سمجھتے تھے۔موسیقیت کو ان کے فن میں اہم مقام حاصل ہے۔لفظوں کے استعمال، بحروں کے انتخاب اور خیال کے اتار چڑھاو میں انھوں نے موسیقیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔وہ کبھی رواں، سبک اور شیریں الفاظ سے شعر میں موسیقیت پیدا کرتے ہیں، کبھی ہم قافیہ الفاظ کی تکرار سے اور کبھی ہندی کے نرم، لطیف اور مترنم الفاظ سے شعر کو غنائیت عطا کرتے ہیں۔

نئی تراکیب وضع کرنے اور انھیں اشعار میں خوب صورتی سے استعمال کرنے کا سلیقہ بھی اختر شیرانی کو خوب آتا تھا۔ان کی وضع کردہ چند تراکیب مندرجہ ذیل ہیں۔

شعلۂ مینا نشیں، دیدۂ افسانہ کار، دختر گردن دراز، فردوسِ وجود و رقص، بادہ نوشانِ تخئیل، بہار جنتِ ویرانہ، نغمۂ ویرانہ، ہم رنگ گلہائے حسیں، نظر آشوب، فردوس زار آرزو، سیارۂ بے آسماں، ہجومِ ریشم و کمخواب، مصر جمال ناز، حسنِ نوشابہ بینائی، کیف صہبائے غمِ روح، نسریں بدناں، کیف لرزاں، غزال دیدِ لیلائے نجد، چمن زار شعاع نور، کیف رواں، رخسارہ دہاں، مرکز انتظار آغوش، خوابستانِ مینا، دخترِ مینائی، آرام گاہ، گوشۂ داماں۔

سلمٰی کے جسم کو ہجوم ریشم و کمخواب، طوائف کو پامال شبستاں، محبوب کو عید پہلو اور نوروز نگاہ کا نام دینا اختر شیرانی کے اعلیٰ تخئیل اور جمالیاتی ذہن کا غماز ہے۔

اختر شیرانی نے خوب صورت تشبیہات سے بھی اپنی نظموں کو دلکشی اور اثر انگیزی عطا کی ہے۔نادر تشبیہات کی وجہ سے ان کی نظم 'وادی گنگا میں ایک رات' یادگار ہوگئی ہے۔ 'تیتری'، 'نغمۂ سحر' وغیرہ نظمیں بھی تشبیہات کے حسن استعمال کی وجہ سے نہایت مقبول ہیں۔ وہ بعض اوقات مرئی اشیا کو غیر مرئی اشیا سے تشبیہ دیتے ہیں۔

اک خواب نو مصورِ رنگیں طراز کا صورت نواز کا
یا ایک مطربہ کے دلِ پُر گداز کا لحن پریدہ ہے
گزرے ہوئے دنوں کی کوئی دلگداز یاد رنگیں طراز یاد
یا کیفِ عشق کی کوئی پُر سوز وساز یاد تلخی چشیدہ ہے

الفاظ کے صیغۂ جمع کے استعمال سے بھی اختر شیرانی نے جذبات کی شدت کا اظہار کیا ہے۔

غموں پہ کی ہیں فدا شادمانیاں ہم نے
خدا کے نام پہ تج دیں جوانیاں ہم نے
گزار دی ہیں یوں ہی زندگانیاں ہم نے
دمِ اخیر تو غم سے چھڑا بھی جا سلمٰی
بہار بیتنے والی ہے آبھی جا سلمٰی

اختر شیرانی کی شاعری میں ہیئت کے مختلف تجربے ملتے ہیں۔یہ تجربے شوقیہ نہیں، ضرورت کے تحت کیے گئے ہیں۔ان تجربوں کی وجہ سے نظموں کے حسن و تاثیر اور نغمگیت میں اضافہ ہوا ہے۔

اختر شیرانی کی شاعری کی ایک اور انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو کی شعری روایت کے برخلاف رقیب کو اپنا دوست اور ہمدم تصور کیا ہے۔نظم 'او دیس سے آنے والے بتا' میں کہتے ہیں۔

آخر میں یہ حسرت ہے کہ بتا　　وہ غیرتِ ایماں کیسی ہے
بچپن میں جو آفت ڈھاتی تھی　　وہ آفتِ دوراں کیسی ہے
ہم دونوں تھے جس کے پروانے　　وہ شمع شبستاں کیسی ہے
او دیس سے آنے والے بتا

اختر شیرانی کے بعد فیض احمد فیض واحد شاعر ہیں جنھوں نے رقیب کو روسیاہ اور دشمن سمجھنے کے بجائے ہمدرد و غم گسار اور ماضی کی یادوں کا شریک کار بنا کر پیش کیا ہے۔ اپنی نظم 'رقیب سے' میں کہتے ہیں۔

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے　　اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے　　جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

اختر شیرانی کی شاعری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے بعد آنے والی ایک پوری نسل اس سے متاثر ہوئی۔اس دور میں جتنے بھی نئے شاعر ابھرے اور شاعری میں نمایاں مقام حاصل کیا، وہ سب اختر شیرانی سے فیض یاب ہوئے۔پنجاب کے شعرا مثلاً فیض احمد فیض، ن م راشد، ساحر لدھیانوی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے کلام پر خاص طور سے اختر شیرانی کا اثر محسوس کیا جاسکتا ہے۔سردار جعفری، اسرار الحق مجاز اور روش صدیقی کی نظموں اور غزلوں میں بھی اختر شیرانی کا اثر موجود ہے۔ان تمام شعرا کے کلام میں عشق کا جسمانی تصور ملتا ہے۔ن م راشد کے پہلے مجموعہ کلام 'ماورا' میں نہ صرف عشق کا یہ تصور ملتا ہے بلکہ جس محبوبہ سے خطاب کیا گیا ہے وہ عورت ہے۔البتہ بعد میں ان کے نقطہ نظر میں تبدیلی آئی اور عورت کا یہ تصور ان کی شاعری میں باقی نہیں رہا۔فیض کی محبوبہ بھی ابتدا میں عورت ہی تھی لیکن بعد میں انھوں نے وطن اور آزادی کو عورت اور محبوبہ کی شکل میں پیش کیا۔

اختر شیرانی کی نمائندہ نظموں میں 'او دیس سے آنے والے بتا'، 'ایک نوجوان بت تراش کی آرزو'، 'تاثرات نغمہ'، 'سلمٰی'، 'عذرا'، 'انتظار'، 'گجرات کی رات'، 'اے عشق کہیں لے چل'، 'بستی کی لڑکیوں میں'، 'یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی'، 'اے عشق ہمیں برباد نہ کر'، 'ایک دیہاتی لڑکی کا گیت'، 'نذر وطن' اور 'وادی گنگا میں ایک رات' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

■

Dr. Firoz Alam
Asst.Professor of Urdu
Centre for Urdu Culture Studies (CUCS)
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500 032 (Telangana) India
Email: firozdde@gmail.com

ادا جعفری
بحیثیت نظم نگار

جمشید احمد

اردو کی نظمیہ شاعری میں جن شاعرات کو خصوصیت کے ساتھ اہمیت حاصل ہے ان میں ادا جعفری کا نام قابل قدر ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات خاصے وسیع ہیں۔ ان میں فرسودگی نہیں بلکہ جدت وندرت ہے۔ انھوں نے استعارات وتشبیہات کا بحسن وخوبی استعمال کیا ہے۔ ان کی نظمیں زبان و بیان اور غیر معمولی خود اعتمادی کی بنا پر قاری کو بے حد متاثر کرتی ہیں۔ ادا جعفری 22 اگست 1924 کو یوپی کے ایک مشہور شہر بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ ان کا اصل نام عزیز جہاں تھا۔ آغاز میں ادا بدایونی کے نام سے شعر کہتی تھیں۔ 1947 میں نورالحسن جعفری سے شادی ہوجانے کے بعد اپنا نام ادا جعفری لکھنے لگیں۔

ادا جعفری بلاشبہ ایک بے باک اور حوصلہ مند شاعرہ ہیں۔ وہ پروین شاکر کی پیش رو ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ نسائی احساسات و جذبات کے اظہار کو اگر پروین شاکر نے ایک بے مثل شعری پیکر عطا کیا ہے تو ادا جعفری اس جرات و حوصلہ مندی کی بنیاد گزار ہیں۔ ادا جعفری نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ آج کی طرح کھلی فضا یا آزاد روش کا نہیں تھا بلکہ اس زمانے میں تہذیب، ادب وآداب کے نام پر قدم قدم پر ایسی پابندیاں تھیں جس سے روگردانی کرنا گناہ عظیم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ان ناسازگار حالات میں بھی ادا جعفری نے غیر معمولی جرات اظہار کا ثبوت دیا۔ ان کی نظموں میں روایت کی بے جا پابندیوں سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد ہے۔ وہ ستائش اور صلے کی پروا کیے بغیر پرورش لوح وقلم میں مصروف رہیں اور جو ان کے دل پر گزرتی رہی اسے بغیر کسی تامل کے شعری پیکر عطا کرتی رہیں۔ ذیل کے یہ مصرعے اس کی ترجمانی کرتے ہیں:

دل ضدی ہے اسے کچھ نہ کہو
آنسو دل سے چہرے مانگے
اور ناکام پھرے
زخموں کی تپش سہتا ہے
کرچیاں، کنکر، کانٹے چن کر
خوش رہتا ہے
رو لینے دو
جو کہنا ہے کہہ لینے دو
اسے کچھ نہ کہو

ادا جعفری کی شاعری عشق ومحبت کی تلخ وشیریں واردات اور عورت کے فطری جذبات و احساسات سے عبارت ہے۔ وہ ایک دردمند دل لے کر پیدا ہوئی تھیں لہٰذا فطری جبلت یعنی درد عشق ومحبت ان کی نظمیہ شاعری میں خاص انداز سے جلوہ گر ہے۔ عشق میں صرف وصل کے مزے ہی نہیں ہوتے بلکہ ہجر کی المناکیاں بھی سہنی پڑتی ہیں اور ہجر کا یہ لمحہ کتنا کرب ناک ہوتا ہے، اس کا اظہار ادا جعفری اپنی ایک نظم میں کچھ اس طرح سے کرتی ہیں۔

ہاں ابر سیہ انجم رخشندہ پہ چھا جا
آنکھوں تلے پھرنے لگے ماضی کے نظارے
تاروں کی طرح میرے تصور میں ہیں روشن
وہ لمحے جو فردوس محبت میں گزارے
کیا بھول گئے ہیں وہ محبت کی کہانی
کیا یاد انھیں اب نہیں جمنا کے کنارے
میرے مہ تاباں سے ادا کون یہ پوچھے
تنہا کوئی کب تک شب مہتاب گزارے

ادا جعفری کی نظموں میں عشق ومحبت کا یہ حوالہ بہت دیر تک قائم نہیں رہتا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تانیثیت کا موقر اور معتبر حوالہ ان کے یہاں اس طرح رچ بس جاتا ہے کہ اسے ان کی زندگی اور شاعری کے محور کی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے۔ معاشرتی زندگی میں عورتوں کو جن مشکلات و مسائل کا سامنا ہے اس کا اظہار ادا جعفری بڑے ہی خلوص اور دردمندی کے ساتھ کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی جوئے شیر وتیشہ وسنگِ گراں کے مانند ہے۔ لہٰذا وہ زندگی کی الجھنوں اور پریشانیوں سے گھبراتی نہیں ہیں بلکہ اس سے نبرد آزما ہوتی ہیں اور دوسروں کو بھی جدوجہد کی دعوت دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظم 'پیش لفظ' ملاحظہ ہو۔

وہ کم عمری تھی
نادانی کے دن تھے
کہ میں نے وقت کے ساحر سے
پوچھا تھا پتہ اپنا
اور اس جادو کے لمحے نے
نہ جانے کیا کہا مجھ سے
نہ جانے کیا سنا میں نے
کہ میں اب تک سفر میں ہوں

ادا جعفری کے یہاں 'سفر' کم عمری و نادانی کے دن سے ہی شروع ہوجاتا ہے اور یہ کبھی ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کا سلسلہ صدی در صدی جاری رہتا ہے۔ ادا جعفری کے یہاں سفر

کا استعمال بطور علامت ہوا ہے۔ یہ سفر علامت ہے جہد مسلسل کی ناسازگار حالت سے نبرد آزماں ہونے کی، باطل سے ٹکرانے کی، بے جا پابندیوں سے آزادی حاصل کرنے کی۔ ان کے نزدیک یہ سفر ہی فکر و نظر کی تبدیلی اور کامیابی کا ضامن ہے۔

بتائیں کیا؟ ہمارے زخم کے گلاب
ماہ و آفتاب سب گواہ ہیں۔
کہ ہم نے کیا نہیں سہا
صعوبتوں کے درمیاں
ہمارے ساتھ اک یقیں رہا
گواہ یہ زمین و زماں رہے
نہ آج سوگوار ہیں
نہ کل ہی نوحہ خواں رہے
شرر جو کل لہو میں تھے
وہ آج بھی لہو میں ہیں
ہمارے خواب سانس لے رہے ہیں آج بھی
کوئی دیا بجھا نہیں
کہ ہم ابھی تھکے نہیں
اور اک صدی سے دوسری صدی تلک
سفر میں ہیں (سفر باقی ہے)

ادا جعفری کی نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نا مساعد حالات میں بھی یقین کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتیں۔ انھوں نے خواتین کے لیے بھی یہی پیغام دیا ہے کہ وہ اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی دنیا آپ پیدا کریں اور ہجوم غم میں بھی جہد و عمل کو اپنا شعار بنائیں۔ ادا جعفری کی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہوئے فیض احمد فیض نے لکھا ہے کہ:

''ادا کے لہجے میں ایسا تیقن اور ان کی آواز میں ایسی تمکنت ہے کہ جو شاعر کو جہد اظہار میں اپنا مقام ہاتھ آجانے کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے۔ ادا نے درد کا جو شہر تخلیق کیا ہے اس شہر کے در و دیوار ان کی ذات تک محدود نہیں، قریب قریب عالمگیر ہیں۔ اس درد میں حزن و یاس کا عنصر بہت کم اور عزم و استقلال کا دخل بہت زیادہ ہے۔''

(بحوالہ فضائے حیات و مسائل کائنات کی مرقع ساز: ادا جعفری، فاروق ارگلی، ماہ نامہ اردو دنیا، دہلی، جون 2015 ص 53)

ادا جعفری کی نظموں کے موضوعات خاصا وسیع ہیں۔ انھوں نے تانیثیت اور نسائیت کے علاوہ حیات و کائنات کے دیگر مسائل کو بھی شعری پیکر عطا کیا ہے۔ اس سلسلے میں اردو کے نامور ناقد ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اس سے انکار نہیں کہ ادا جعفری نے ایک خاتون کی حیثیت سے نسائیت کے بعض ایسے نفسیاتی کوائف اور جذبوں کی ترجمانی بھی کی ہے جو کسی مرد شاعر سے ممکن نہ تھا لیکن وہ اسی دائرے میں گھر کر نہیں رہ گئیں۔ انھوں نے نسوانی فضا سے آگے بڑھ کر ذات کے حصار سے باہر نکل کر عام انسانی فضا، حیات و مسائل کائنات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اس خوبصورتی اور تواتر کے ساتھ کہ ان کا شمار عصر حاضر کے نمائندہ و معتبر شعراء میں کیا جاتا ہے۔''

(بحوالہ فضائے حیات و مسائل کائنات کی مرقع ساز: ادا جعفری، فاروق ارگلی ماہنامہ اردو دنیا، دہلی، جون 2015 ص 53)

اس سلسلے میں ان کی نظم 'شہر آشوب' ملاحظہ ہو۔ جس کے مطالعے سے ادا جعفری کی وسعت نظر اور عصری آگہی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یوں تو یہ نظم پاکستان کے حالات پر مبنی ہے لیکن اس کا انداز بیان کچھ ایسا ہے کہ اس کو کسی بھی پر فتن شہر کے پس منظر میں دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی معنویت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ نظم اس طرح ہے۔

ابھی تک یاد ہے مجھ کو
میرے آنگن میں خیمے دعاؤں کے
یقین آئے نہ آئے میرے بچوں کو
گئے وقتوں کا قصہ ہے
کہ برگ گل کبھی قدموں تلے روندا نہ جاتا تھا
ہوا برگشتہ گام آتی نہ تھی پہلے
یقین اغوا نہ ہوتا تھا
میرے آنگن میں نقش پا سجے تھے
خون کے دھبے نہ ہوتے تھے
دھوئیں کے ناگ کا پہرہ نہ ہوتا تھا
گئے وقتوں کی باتیں ہیں
میرے بچوں کو شاید ہی یقین آئے
در و دیوار کے اوپر
کسی آسیب کا سایہ نہ ہوتا تھا
سبھی تنہا تھے لیکن یوں کوئی تنہا نہ ہوتا تھا
ابھی تک یاد ہے مجھ کو
(شہر آشوب)

ادا جعفری نے قومی مسائل کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی مسائل کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم 'مسجد اقصیٰ' بہت مشہور ہوئی جس میں انھوں نے فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر صدائے احتجاج بلند کیا ہے۔

ایسا اندھیرا تو پہلے نہ ہوا تھا لوگو
لو چراغوں کی تو ہم نے بھی لرزتے دیکھی
آندھیوں سے کبھی سورج نہ بجھا تھا لوگو
آئینہ اتنا مکدر ہو کہ اپنا چہرہ
دیکھنا چاہیں تو اعتبار کا دھوکا کھائیں
ریت کے ڈھیر پہ ہو محمل ارماں کا گماں
(مسجد اقصیٰ)

ادا جعفری کی شاعری بلا شبہ ساحری کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو مالا مال کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ میں ساز ڈھونڈتی رہی، شہر درد، غزالاں تم تو واقف ہو، ساز سخن بہانہ ہے، حرف شناسائی، اور سفر باقی ہے، ان کے یہ چھ شعری مجموعے اردو ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان سب کا مجموعہ 'موسم موسم' کے عنوان سے کلیات کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کی ادبی خدمات کا ایک عالم معترف ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں مختلف اعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ مثلاً ان کے مجموعہ کلام شہر درد پر آدم جی ایوارڈ، ان کی مجموعی ادبی خدمات پر تمغۂ امتیاز، کمال فن ایوارڈ، پرائڈ آف پرفارمنس، بابائے اردو ایوارڈ اور قائد اعظم ادبی ایوارڈ وغیرہ۔

ادا جعفری کی نظمیں پابند بھی ہیں اور آزاد بھی۔ انھوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں جو مقبول خاص و عام ہیں۔ ان کی ترکیبیں نئی اور دلکش ہیں۔ ان کا لسانی شعور بہت پختہ ہے۔ انھیں لفظوں کی جمالیات سے گہری واقفیت ہے جس سے ان کے کلام کی معنویت میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ ادا جعفری عہد حاضر کی ایک عظیم المرتبت شاعرہ ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کی بے لوث خدمت کی ہے جس کی بنا پر اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا رہے گا اور ان کے اشعار قاری کو ہر عہد میں رجائیت کا پیغام دیتے رہیں گے۔ میں اپنی بات ادا جعفری کی ایک نظم پر ختم کرنا چاہتا ہوں جس کا عنوان ہے، میراث آدم۔ نظم یوں ہے۔

وہ انسان ہیں
اک کلی کے لیے، اک کرن کے لیے
زہر پیتے رہے، جی گنواتے رہے
غم رسیدہ نہ ہو دل گرفتہ نہ ہو
آج کی موت بس آج کی موت ہے
زندگی موت سے کب خجل ہو سکی
تیرگی قسمت آب و گل ہو سکی

■

Dr. Jamshed Ahmad
Dept of Urdu, Pandeshwar College
Pandeshwar
Burdwan - 713342 (WB)
Mob.:9593664494
Email: jamshed78@gmail.com

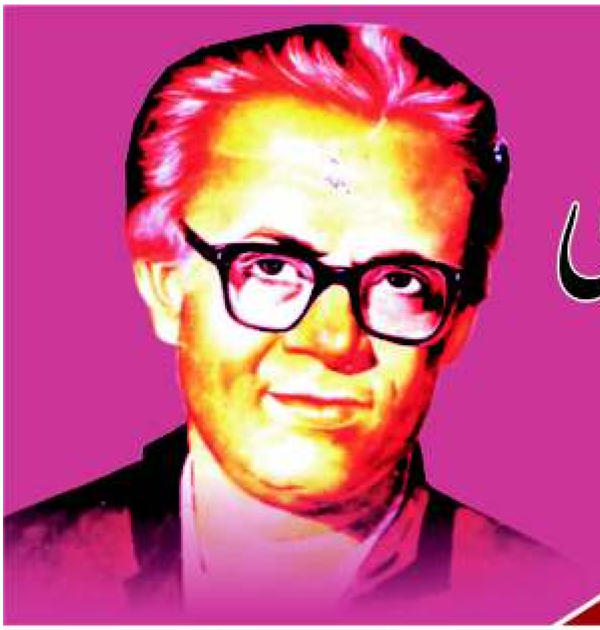

سہیل عظیم آبادی کی خاکہ نگاری

محمد منہاج الدین

اردو ادب کی تاریخ میں سہیل عظیم آبادی کی شناخت افسانہ نگار کی حیثیت سے مستحکم ہے، مگر سہیل عظیم آبادی کی خدمات کا دائرہ زبان و ادب کے سلسلے میں وسیع تر ہے۔ سہیل صاحب ایک فکشن نگار کے ساتھ ساتھ شاعر اور نامور صحافی بھی تھے، انھوں نے مختلف رسائل و جرائد اور روزنامے جاری کیے، ملک کے موٴقر رسائل اور روزنامہ کے مدیر بھی رہے۔ سہیل صاحب کو شاعری سے بھی شغف تھا، طالب علمی کے زمانے میں ہی شاعری کا شغف بڑھا تو سہیل جبیلی کے نام سے شعر کہنے لگے۔ یہ سلسلہ دراز نہ ہو سکا، علامہ جمیل مظہری کے مشورے پر شاعری ترک کر کے افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے اور سہیل عظیم آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ افسانہ ہی آپ کی اصل پہچان بنا اس لیے گزشتہ برسوں میں سہیل صاحب کی ادبی خدمات کو موضوع تحقیق بنا کر جتنے بھی کام ہوئے ہیں ان میں ہماری توجہ کا مرکز ان کی افسانہ نگاری ہی رہی، جبکہ سہیل صاحب نے افسانوں کے علاوہ ناول، ناولٹ، ڈرامے، مکتوبات، خاکے اور بچوں کی کہانیاں بھی لکھی ہیں، مگر افسوس کہ ان کی دوسری تخلیقات عدم توجہی کا شکار رہی ہیں جس سے سہیل صاحب کی تخلیقیت کے کئی اہم گوشے نمایاں نہیں ہو سکے ہیں۔ پروفیسر علیم اللہ حالی بھی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”افسانہ نگاری کے علاوہ سہیل عظیم آبادی کی کئی دوسری ادبی شقیں بھی روشن اور قابل ذکر ہیں“[1]۔ ان شقوں پر خاطر خواہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

سہیل عظیم آبادی کی انھیں روشن ادبی شقوں میں ایک اہم شق ان کے ادبی خاکے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی نے کئی ادبی شخصیات کے خاکے لکھے ہیں۔ تعداد کا تعین کرتے ہوئے پروفیسر اعجاز علی ارشد نے سہیل صاحب کے خاکوں کی تعداد اٹھارہ بتائی ہے، جن میں چودہ مطبوعہ ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور چار ایسے خاکے ہیں جو ریڈیو پر نشر ہوئے یا لکھے گئے مگر شائع نہ ہو سکے، اس طرح پروفیسر اعجاز علی ارشد کی تحقیق کے مطابق سہیل صاحب نے اٹھارہ خاکے لکھے ہیں[2]۔ ابھی چند سال قبل 2015 میں پٹنہ یونیورسٹی کی طالبہ شہناز بانو نے سہیل عظیم آبادی کے سترہ خاکوں کو جمع کیا اور انھیں بڑے سلیقے سے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔

سہیل عظیم آبادی نے خاکہ بہت زیادہ تو نہیں لکھا ہے مگر جتنے بھی خاکے آپ نے تحریر کیے ہیں ان کی بنیاد ذاتی تعلقات اور مخصوص ملاقاتیں ہی ہیں، بلکہ انھوں نے خاکوں میں جابجا شخصیت سے اپنے تعلقات کی وضاحت بھی کی ہے، مثلاً جگر مرادآبادی کے خاکہ کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

”جگر صاحب سے میری ملاقات ڈاکٹر سید اختر امام کی وساطت سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اختر امام کولمبو یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے اور اب وہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں پٹنہ، دہلی اور سری نگر میں۔“[3]

اور جن سے ملاقاتیں کم ہوتیں ان سے خط و کتابت کے ذریعے مراسم گہرے رہے، مثلاً خلیل الرحمٰن اعظمی، سلام مچھلی شہری وغیرہ سے آپ کے تعلقات۔ گویا کہ سہیل عظیم آبادی کے خاکے رسمی تعلقات کی بنا پر تحریر نہیں کیے گئے ہیں بلکہ شخصیت سے دیرینہ مراسم کی بنیاد پر یہ تحریریں وجود میں آئیں، جس کی وضاحت عظیم آباد کے معروف ناقد و محقق پروفیسر اعجاز علی ارشد نے بھی کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

”سہیل عظیم آبادی نے شخصی خاکے بھی کامیابی کے ساتھ لکھے ہیں، جن شخصیتوں پر انھوں نے قلم اٹھایا ان میں سے اکثر کے ساتھ ان کے دیرینہ مراسم رہے ہیں۔ کسی کے ساتھ بزرگانہ، کسی کے ساتھ دوستانہ اور کسی کے ساتھ مشفقانہ تعلقات کی جھلک ان کے خاکوں میں نمایاں ہے۔“[4]

سہیل عظیم آبادی نے جگر، مجاز، بسمل عظیم آبادی، جمیل مظہری اور پرویز شاہدی جیسے شعرا کا خاکہ لکھا ہے تو کرشن چندر، اختر اورینوی، خلیل الرحمٰن اعظمی، سجاد ظہیر جیسے نامور ادیبوں کی مرقع کشی بھی کی ہے۔ ایک خاکہ ڈاکٹر نذر امام جیسے گمنام ادب نواز کا بھی ہے جس میں انھوں نے دوستی کا بہترین حق ادا کیا ہے۔ اپنے خاکوں میں سہیل عظیم آبادی نے چند شخصیات کو اسم بامسمّیٰ بنا کر پیش بھی کیا ہے۔ اپنے رہنما اور اردو کے عظیم خدمت گار مولوی عبدالحق کو 'شرافت کا آئینہ' تو اپنے عزیز دوست محمد احمد ہنر کو 'مخلص دوست' کے وصف سے نوازا ہے۔ سب سے طویل خاکہ اپنے ایک عزیز معاون کا لکھا جسے آپ نے جس قدر چھوٹا بھائی سمجھا اس سے کہیں زیادہ اس نے آپ کو بڑے بھائی جیسی عقیدت اور عزت دیا، میں بات کر رہا ہوں 'زکی انور کی'۔ زکی انور کی بے وقت موت کے بعد زکی انور کا لکھا گیا یہ خاکہ زکی انور کی زندگی، ان کے جد و جہد اور حوصلے کی کہانی ہے تو ملک کی سالمیت کی شہادت کا نوحہ بھی ہے۔ زکی انور کا خاکہ یقیناً پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، بقول سہیل صاحب ”زکی کی زندگی بھی ایک سبق تھی اور موت بھی ایک سبق ہے“۔

سہیل صاحب کی زندگی میں جس نے بھی کبھی کسی طرح سے ان کی مدد کی ہو انھوں نے اسے کبھی فراموش نہیں کیا۔ آپ کی ذات اور کردار کی تعمیر و تشکیل اور ادبی پرورش و پرداخت میں جس کسی کا بھی عمل دخل رہا ہے آپ نے دل کھول کر واضح انداز میں اعتراف کیا ہے اور شخصیت سے اپنی عقیدت کے اظہار میں آپ کے یہاں مبالغہ آرائی بالکل نہیں بلکہ یہ سچ ہے کہ ایسے مواقع پر آپ کی زبان اور بیان میں عاجزی اور انکساری کا جذبہ غالب

نظر آتا ہے، خاکہ 'علامہ بھائی' کا یہ اقتباس دیکھیں:

''برادر مکرم حضرت علامہ جمیل مظہری کی ذات گرامی سے اپنی عقیدت اور ارادت کا اظہار کروں تو سوچنا پڑتا ہے کہ کیا لکھوں، آفتاب کی کرنیں ذروں پر پڑتی ہیں تو چمکنے لگتے ہیں، لیکن ہزاروں ذرے چمک کر بھی آفتاب کو کیا دے سکتے ہیں، برادر مکرم علامہ جمیل مظہری عظیم ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔ بہتوں نے ان سے فیض حاصل کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ شاد عظیم آبادی کے بعد تنہا ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے یہاں کے ادبی ماحول کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ ان کے بعد آنے والا شاعر ہو یا افسانہ نگار بالواسطہ یا بلا واسطہ ان سے متاثر ضرور ہوا ہے۔ اس کے برعکس میری ادبی شخصیت بہت چھوٹی ہے، اور اس چھوٹی سی ادبی شخصیت کی تعمیر میں بھی ان کی شفقتوں کو اتنا زیادہ دخل رہا ہے کہ اگر ان کو الگ کر دیا جائے تو کچھ بھی باقی نہ رہ جائے۔ یہ اقرار توصیفی مبالغہ نہیں بلکہ ایک بڑی حقیقت کا اعتراف اور اظہار ہے۔ اگر ابتدا میں ہی برادر مکرم علامہ جمیل مظہری کی قربت نصیب نہ ہوتی تو میں کچھ اور ہوتا لیکن ادیب اور افسانہ نگار نہیں ہوتا، میرے گھر میں علم تھا لیکن ماحول ادبی نہ تھا، اس لیے اس کی امید نہیں تھی کہ میں ادب کی طرف مائل بھی ہوتا۔ بچپن سے پڑھنے کا شوق تھا، پڑھتا رہتا اور زندگی کے دھندوں میں لگ جاتا، ادیب اور افسانہ نگار نہ بن پاتا۔''[5]

ان کی زندگی میں ایسا ہی ایک نام 'مسز سوباتی ٹوپو' کا ہے، مسز ٹوپو وہ آدی باسی خاتون ہیں جنھوں نے چھوٹا ناگپور کے آدی باسی علاقے میں اردو تحریک کو مستحکم کرنے اور اردو زبان کے فروغ میں سہیل صاحب کا بھرپور ساتھ دیا۔ 'سوباتی ٹوپو۔ محبِ اردو آدی باسی خاتون'' کے عنوان سے چھوٹا ناگپور اور رانچی کے مشکل ماحول میں اردو کے مشن کو فروغ دینے والی ایک بے لوث خدمات گار کا مختصر مگر جامع اور خوبصورت خاکہ ہے۔ اس بلند حوصلہ خاتون کے کارناموں اور اردو خدمات کو سہیل صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

''مسز ٹوپو گھر گھر جا کر لڑکوں اور لڑکیوں کو اردو پڑھنے پر آمادہ کرتی تھیں۔ ان کی کوششوں سے آدی باسی لڑکے اور لڑکیوں کی کافی تعداد ان دنوں مدرسوں میں اردو پڑھنے لگی۔''[6]

رانچی میں ہی سہیل صاحب کے ایک صحافی دوست تھے 'رادھا کرشنن'، جو کہانیاں بھی لکھا کرتے تھے۔ آپ کا خاکہ 'رادھا کرشنن' اسی دوست کو پیش کیا گیا بہترین خراج عقیدت ہے جس میں قدرے تفصیل سے ان کے حالات زندگی کو رقم کیا گیا ہے۔ رادھا کرشنن سے آپ کی اچھی ملاقاتیں رہی تھیں، رانچی قیام کے دوران مراسم اور گہرے ہوئے۔ رادھا کرشنن کی زندگی، معاشی اور خانگی حالات، ان کے افکار و نظریات کو نہایت سلیقے سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک بلند حوصلہ عام آدمی کو سہیل صاحب نے بڑا انسان بنا کر پیش کیا ہے، جس نے کبھی حالات سے سمجھوتا نہیں کیا۔ خاکہ 'رادھا کرشنن' سے یہ اقتباس دیکھیں:

'' 1940 سے 1945 تک دوسری جنگ عظیم کی گرما گرمی رہی اور رانچی بڑا فوجی مرکز بنا رہا۔ یہ زمانہ تھا جب رانچی میں روپے کی بارش ہو رہی تھی۔ کام کرنے والوں اور روپے بٹورنے والوں کی ضرورت تھی لیکن رادھا کرشنن سخت کانگریسی تھے۔ وہ جنگ میں انگریزوں کی کسی قسم کی بھی مدد کرنے کو گناہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے کچھ کام نہیں کیا۔ حالانکہ ان کے بعض خوشحال دوستوں نے کچھ کام کرنے پر آمادہ کرنا چاہا اور مالی امداد کا وعدہ بھی کیا لیکن وہ اپنی جگہ رہے اور کبھی انگریزوں کی مدد کر کے روپے کمانے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ ان کی مالی حالت جیسی غیر اطمینان بخش پہلے تھی ویسی ہی رہی اور جن حالات سے وہ گزر رہے تھے اس کی بھی کبھی شکایت نہیں کی۔ پڑھتے رہے اور لکھتے رہے اور اخباروں اور رسالوں سے جو کچھ مل جاتا اسی پر قانع رہے۔''[7]

چونکہ ذاتی تعلقات سہیل عظیم آبادی کے خاکوں کا نمایاں پہلو ہے، آپ نے جن شخصیات کے خاکے لکھے ہیں ان سے آپ کی قربت خاص اور دیرینہ مراسم رہے ہیں، لہذا سہیل صاحب کے خاکے منفی نہیں ہیں، نہ ہی کوئی منفی بات ہوتی ہے اور نہ ہی منفی واقعات، شخصیت کی برائی کہیں کسی بھی خاکہ میں نظر نہیں آتی، آپ نہ ہی شخصیت کی تنقید کرتے ہیں اور نہ نقائص کی تلاش و جستجو میں اپنی قوت صرف کرتے ہیں۔ دراصل سہیل صاحب کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی کہ انھوں نے سب سے صرف محبت ہی کی تھی، اس لیے خاکوں میں بھی آپ شخصیت کی تعریف و توصیف ہی کرتے نظر آتے ہیں اور اس کی انفرادیت مسلم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے دوست اختر اورینوی کا خاکہ کچھ اس طرح ختم کرتے ہیں:

''اختر کی ذات قدیم و جدید اعلی قدروں سے مرکب ہے۔ بزرگوں کا احترام، دوستوں سے محبت اور خلوص، عزیزوں کے ساتھ شفقت، ہر لمحہ دوسروں کے جذبات کا خیال۔ یہ ایسی خوبیاں ہیں جو مٹتی جا رہی ہیں لیکن اختر کی ذات میں بھرپور ہیں، اور شاید ہر روز ان خوبیوں میں عمر کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

جو لوگ اختر سے ملے ہیں ان کو اندازہ ہے کہ اختر کی ذات میں کتنی محبوبیت ہے۔ جتنا زیادہ ملیے اتنی زیادہ ان کی محبوبیت نکھرتی نظر آئے گی۔ میں تو جب بھی اختر کی شخصیت کے بارے میں سوچتا ہوں تو حافظ شیرازی کا شعر دماغ میں گونجنے لگتا ہے:

من نمی یابم مجال اے دوستاں
گرچہ او، دارد جمال بس جمیل ''[8]

یہاں تک کہ اگر کسی ادیب اور فنکار کے فن پر باتیں کی تو اس میں بھی نمایاں اوصاف کی نشاندہی کرتے ہوئے شخصیت کے فن اور ذات کی اہمیت کا اعتراف زیادہ کیا ہے، کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی بالکل نہیں کی ہے۔ خاکہ 'سلام مچھلی شہری' کا یہ اقتباس دیکھیں:

''سلام کی نظموں میں نیا پن ہوتا تھا، کبھی کبھی تو اتنا زیادہ نیا پن ہوتا تھا کہ قدامت پسند لوگ منہ لٹکا لیتے تھے۔ لیکن ان نظموں میں رس ہوتا تھا، شگفتگی ہوتی تھی، غنائیت ہوتی تھی، شعریت ہوتی تھی اور شاعری کے سارے لوازمات ہوتے تھے۔ سلام کی شاعری کی ایسی خوبیوں نے جلد ہی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور وہ کم عمری ہی میں ملک گیر شہرت کے مالک ہو گئے تھے۔''[9]

خاکہ حقیقت نگاری کا متقاضی ہوتا ہے، شخصیت کی عادات و اطوار، خصلت و فطرت، افکار و نظریات، ذاتی یا ادبی تعلقات وغیرہ کے ذکر میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی کو خاکہ کے لیے فنی خامی تصور کیا جاتا ہے۔ سہیل صاحب حقیقت پسند ادیب تھے، حقیقت بیانی ان کا نمایاں وصف ہے، انھوں نے خاکہ نگاری میں بھی واقعات کی پیشکش اور شخصیت کے کردار کی عکاسی میں بناوٹی باتوں اور مبالغہ آرائی سے گریز کیا ہے، سادہ اور عام فہم انداز میں خاکے لکھے ہیں جن کے واقعات حقیقی اور کردار غیر مصنوعی ہیں۔ انھوں نے شخصیت کی ہو بہو، من و عن، جیسا دیکھا، جیسا سمجھا، جیسا پایا ویسی ہی تصویر کشی کی ہے۔ آپ خود اردو تحریک کا اہم حصہ رہے، بابائے اردو مولوی عبدالحق کے رفیق کار اور معاون تھے، بابائے اردو کا جو خاکہ آپ نے پیش کیا ہے اس سے کسی صاحب اردو کو انکار نہیں ہو سکتا:

''بابائے اردو نے اردو کے لیے سب کچھ کیا، ان سے جو بھی ممکن تھا۔ وہ جن لوگوں میں اردو کی خدمت کا جذبہ پاتے تھے ان کے لیے آنکھیں بچھا دیتے تھے، خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا آدمی کیوں نہ ہوتا لیکن اگر کوئی اردو کے معاملے میں ان کے نقطۂ نظر کی مخالفت کرتا (خواہ اردو زبان کا مخالف نہ بھی ہو) تو اس سے ٹکر لینے کو تیار رہتے تھے۔ راشٹر بھاشا پریشد کے اجلاس ناگپور کے بعد

مہاتما گاندھی سے ان کا اختلاف مشہور ہے۔ حالانکہ وہ مہاتما گاندھی کے بڑے مداح تھے۔ انھوں نے اپنے خرچ سے مہاتما گاندھی کے سوانح حیات لکھوائے تھے۔ لیکن جب اردو کے معاملے میں اختلاف ہوا تو مہاتما گاندھی سے دور ہوتے چلے گئے۔..................
یعنی بابائے اردو کی محبت اور نفرت کی بنیاد بھی اردو تھی۔ جو اردو کا حامی بابائے اردو اس کے حامی اور مداح، جو اردو کا مخالف اس کے وہ مخالف۔ جو اردو کی طرف سے بے پروا اس کی طرح سے وہ بے پروا اور اس معاملے میں وہ بڑی سے بڑی شخصیت کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔"10

سہیل عظیم آبادی کے خاکوں کے اسلوب پر نظر ڈالیں تو افسانوی رنگ ان کے خاکوں پر غالب نظر آتا ہے، اختصار میں جامعیت ان کا اہم وصف ہے، زبان عام فہم سادہ اور سلیس ہے، واقعات کو نپے تلے الفاظ میں ربط و تسلسل کے ساتھ دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ حقیقت اور اختصار کا امتزاج سہیل صاحب کے خاکوں کو پر لطف بنا دیتا ہے، مثلاً جگر مرادآبادی کے خاکہ کے یہ جملے دیکھیں:

"لیکن وہ بڑی بے نیاز طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ ان کو کون (مشاعروں میں) بلاتا ہے اور کون نہیں بلاتا۔ حالانکہ ان کا ذریعہ معاش مشاعروں سے ملنے والی رقم کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ شروع میں وہ عینک کی تجارت کرتے تھے لیکن وہ بھی رندی اور شاعری کی نذر ہو گئی تھی۔

میں نے سنا ہے کہ کئی ایسے لوگ بھی تھے جو حد درجہ دیندار اور محتاط زندگی گزارتے تھے، لیکن جب جگر صاحب ان کے یہاں قیام کرتے تھے تو وہ جگر صاحب کے لیے شراب کا انتظام بھی کرتے تھے۔"11

سہیل عظیم آبادی کے افسانوی طرز کے چھوٹے چھوٹے خاکے شخصیت کے امتیازی اوصاف اور کارہائے نمایاں پر مبنی بے حد جامع ہیں۔ زندگی کے اہم واقعات اور یادگار کے توسط سے سہیل صاحب نے نہایت سلیقے سے ہر شخصیت کا جامع اور متحرک خاکہ تحریر کیا ہے، جن میں کہیں کہیں پر لطف لطیفے بھی ہیں، تاریخی واقعات بھی ہیں اور کردار کی خوبصورت پیکر تراشی بھی ہے۔ خاکہ 'میرا دوست مجاز' میں ایک جگہ مجاز کے لطیف انداز کا ذکر ایک پر لطف لطیفے سے کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"روش صدیقی مرحوم اچھے شاعر اور بے حد شریف طبیعت انسان تھے۔ ان کا شمار بھی مقبول شاعروں میں تھا۔ مجاز مرحوم کے بھی دوستوں میں تھے۔ ایک بار ملاقات ہوئی تو مجاز نے ان سے کہا: روش صاحب اب شادی کر لیجیے۔ کب تک لنڈورے پھریے گا۔ روش مرحوم نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا: بھائی میں بھی سوچ رہا ہوں۔ لیکن اب عمر زیادہ ہو چکی ہے۔ کسی کم عمر لڑکی سے شادی کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ سوچ رہا ہوں کسی بیوہ سے شادی کروں۔ مجاز نے چھوٹتے ہی کہا: آپ فکر نہ کیجیے۔ شادی کر لیجیے وہ بیوہ ہو جائے گی۔"12

شخصیت کی پیکر تراشی میں بھی آپ نہایت اختصار سے کام لیتے ہیں، چند خاکوں میں ہی آپ نے شخصیت کے عادات و اطوار اور مزاج کی خصوصیت کے ساتھ شخصیت کا پیکر بیان کیا ہے، ان مخصوص خاکوں میں ہی ایک خاکہ معروف ترقی پسند ادیب کرشن چندر کا ہے۔ خاکہ 'کرشن چندر: ایک محبوب شخصیت' میں مختصر جملوں میں خوبصورتی سے کرشن چندر کے پیکر کو یوں تراشا گیا ہے کہ ان کے ظاہر و باطن کی ایک مکمل تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے، اقتباس دیکھیں:

"کرشن چندر کے بارے میں ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ بہت ہی پیاری شخصیت کے مالک ہیں۔ مسکراتا ہوا چہرہ، متین اور سنجیدہ، نہایت دلآویز انداز گفتگو، پلکیں جھکی ہوئی، جیسے رات بھر کی جاگی ہوئی آنکھیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خشک آدمی ہیں۔ شوخی اور شرارت بھی کرشن چندر میں موجود ہے۔"13

مجموعی طور پر سہیل عظیم آبادے کے خاکوں کے تعلق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خاکہ نما یادگاری مضامین ہیں جو شخصیت سے ذاتی روابط اور رشتے کی بنیاد پر ان کے خصائص اور نمایاں کارناموں کو یاد کرتے ہوئے لکھے گئے ہیں۔ جن میں افسانے کی لذت بھی ہے اور انشائیے کی لطافت بھی۔ سہیل عظیم آبادی بنیادی طور افسانہ نگار ہیں جن کی فکر اور فن دونوں پریم چند سے متاثر ہے، وہ حقیقت کی ترجمانی کے لیے شستہ، سلیس اور عام فہم زبان کو ترجیح دیتے ہیں، غیر مانوس الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں، محاورے اور ضرب الامثال بھی روز مرہ کے ہوتے ہیں، لہٰذا آپ کے خاکوں کی زبان بھی بالکل صاف اور رواں دواں ہے، جہاں قاری کو بے جا الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، یعنی آپ کا افسانوی اسلوب خاکوں میں بھی نمایاں ہے۔ بقول سہیل صاحب:

"بیتے دنوں کی یاد عجیب ہوتی ہے، جب آتی ہے تو دل کو تڑپا جاتی ہے اور کبھی کبھی تو کسی پیاری اور خوشگوار یاد کے آتے ہی دل اقبال کے لفظوں میں بے اختیار پکار اٹھتا ہے:

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

لیکن گردش ایام کی رفتار مقرر ہے، وہ پیچھے کی طرف کبھی نہیں لوٹتی، ماضی کی طرف اپنا رخ کبھی نہیں کرتی۔"14

بے شک وقت پیچھے کی طرف کبھی نہیں لوٹتا مگر جس خوبصورتی سے آپ نے اپنے نہاں خانے میں محفوظ صحیفے کی ورق گردانی کر کے اسے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے وہ قابل صد احترام ہے۔ صاحب علم و فن میری اس بات سے قطعاً انکار نہیں کر سکتے کہ سہیل عظیم آبادی کے خاکے اگرچہ اردو خاکہ نگاری میں اضافہ نہ ہوں مگر اردو خاکہ نگاری کا اہم حصہ ضرور ہیں۔

حواشی

(1) سہیل عظیم آبادی اور ان کے خاکے: شہناز بانو: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی: 2015: ص 7
(2) ایضاً: ص 20
(3) ایضاً: ص 24
(4) مضمون: سہیل عظیم آبادی اور ان کی تحریریں: ایک تحقیقی جائزہ: از پروفیسر اعجاز علی ارشد: ماہنامہ 'آج کل': شمارہ: نومبر 1981: ص 36
(5) سہیل عظیم آبادی اور ان کے خاکے: شہناز بانو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی: 2015: ص 38-37
(6) ایضاً: ص 16
(7) ایضاً: ص 159
(8) ایضاً: ص 125-124
(9) ایضاً: ص 50-49
(10) ایضاً: ص 91
(11) ایضاً: ص 25
(12) ایضاً: ص 43
(13) ایضاً: ص 58
(14) ایضاً: ص 31

Md Minhajuddin
Dept of Urdu
Patna University
Patna - 800005 (Bihar)

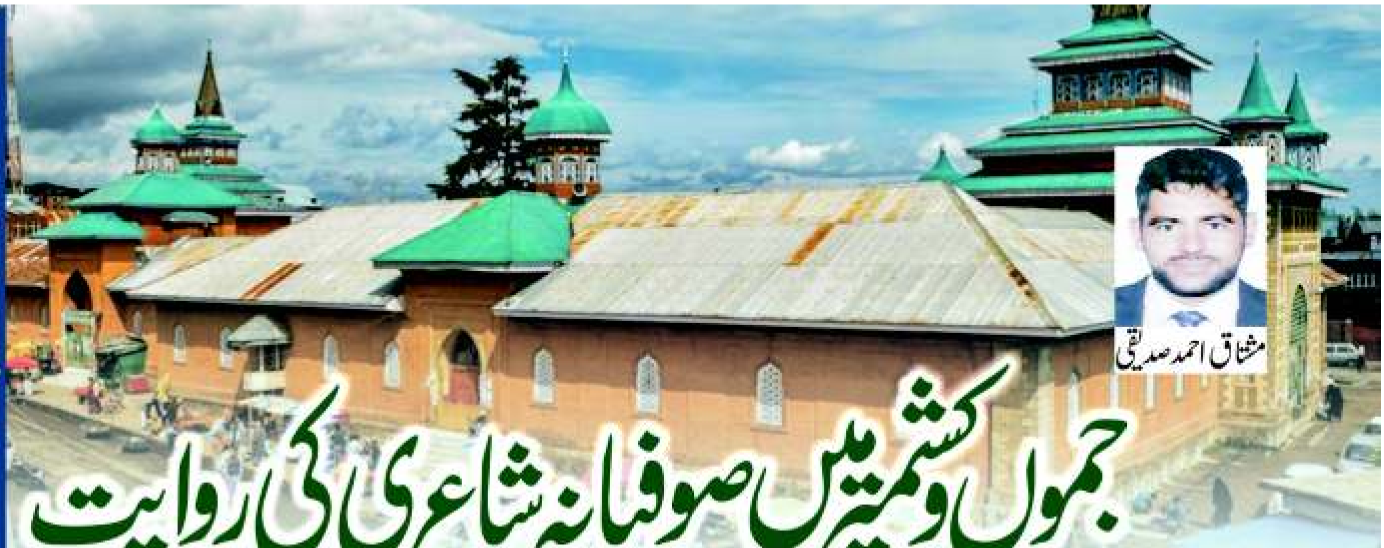

مشتاق احمد صدیقی

جموں و کشمیر میں صوفیانہ شاعری کی روایت

لفظ 'صوفی' کے بارے میں لوگوں کی مختلف آرا ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک صوفی کا لفظ اصل میں 'صفوی' تھا، جو کثرت استعمال سے صوفی بن گیا۔ ابوالحسن کے مطابق صوفی کا لفظ 'صفا' سے بنا ہے۔ جس کا مطلب ان لوگوں سے ہے جنھیں خداوند قدوس نے اوائل ہی سے بشری کدورتوں اور غلاظتوں سے پاک رکھا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ جو لوگ سادگی کی وجہ سے صوف یعنی اون یا موٹا کپڑا پہنتے تھے وہ صوفی کہلاتے تھے۔ حضرت شیخ فریدالدین عطار نے 'تذکرۃ الاولیا' میں اس لفظ کی ایجاد کا سہرا بغدادیوں کے سر باندھا ہے۔ علامہ ابوریحان البیرونی نے اپنی کتاب 'کتاب الہند' میں صوفی کے معنی 'فلاسفر' کے لکھے ہیں اور صوف کے معنی فلسفہ کے۔ بقول اُن کے اسلام میں ایک جماعت ایسی تھی جس کا مسلک یونانی صوفیوں کے قریب قریب تھا، اس لیے ان کا نام صوفی پڑ گیا۔ مختصراً یہ کہ لفظ 'صوفی' صوف سے مشتق ہو یا صفا سے، وہ مذہبی اور اخلاقی عالم میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے:

تصوف صوفیا کا ایک طریقہ ہے۔ اس طریقے پر چل کر وہ تزکیہ نفس سے پاکیزگی قلوب کا اہتمام کرتے ہیں اور تمام طریقوں کو شرع محمدی کے دائرے میں رہتے ہوئے اپناتے ہیں۔ تصوف کی بنیاد دراصل ذاتی احساسات، تجربات اور خیالات پر مبنی ہے۔ صوفیا نے اپنے اپنے وجدان اور تجربے و ذوق سے جو محسوس کیا اسے اپنے اپنے انداز میں بیان کر دیا۔ سبھی تعریفیں بالآخر ایک ہی نتیجے پر پہنچتی ہیں، سب کے انداز اور طریقے نرالے ہیں۔ حقیقتاً سب کا حصول قرب الٰہی اور معرفت الٰہی ہی ہے۔

پنڈت کلہن (مورخ) نے تو اپنی زمانہ مشہور کتاب 'راج ترنگنی' کے پہلے ہی باب میں اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ ہمارے وطن جموں و کشمیر کو نخی ہاتھوں نے ایسے فطری حسن اور کشش سے نوازہ ہے کہ اس کے برف پوش پہاڑوں، گھنے، سرسبز جنگلوں، صاف و شفاف اور میٹھے پانی کے چشموں، جھرنوں اور آبشاروں کے نزدیک بسنے والے کسی بھی دور میں روحانیت اور مذہب پسندی سے دور نہیں رہ سکتے۔ گویا اس مورخ کی یہ سوچ تھی کہ وطن عزیز کے سبھی نیک دل اور حساس انسان مذکورہ بالا چیزوں میں خدا کی وحدانیت کا جلوہ کسی نہ کسی طرح دیکھتے رہے ہیں۔ اوراق تاریخ سے بھی ہمیں یہی علم ملتا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں ترکستانی یا وسط ایشیائی اور ایرانی صوفیوں کی جماعتیں مختلف کاروانوں کی صورت میں اگرچہ وطن عزیز پہنچیں، تاہم ان سے بہت پہلے یہاں رشیوں، سنتوں، سادھوؤں نے تصوف رُبھگتی کے سلسلے کو جاری رکھا تھا۔ ان کی تپسیا، ریاضت، اور دھیان و گیان کی روایت نے لاکھوں دلوں کی زمینوں کو اس قدر ہموار کر رکھا تھا کہ کوئی بھی عاجزانہ، مخلصانہ اور دردمندانہ بحث اور زاہدانہ عمل اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ حالانکہ مشکل یہ بھی تھی کہ صدیوں پرانی رشیوں اور سنتوں کے ہاں رائج سریت، برصغیر میں زیادہ تر منفی رجحانات، رہبانیت اور ترک دنیا کی تعلیم دیتی رہی اور گھر بار چھوڑ کر گیان پانے کی وکالت کرتی رہی۔

اوائل ہی سے بدھ مت کے یہاں گہرے اثرات رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی صدی عیسوی میں ہی یہاں عالمی بدھ کانفرنس منعقد کی گئی تھی، جس میں بادشاہ وقت کے علاوہ کئی عقیدت مند بدھ بھکشوؤں نے شرکت کی۔ ہمارے اسلاف اس کانفرنس کی ایک خاص بات کا برملا اظہار کرتے آئے ہیں۔ بقول اُن کے اس بدھ کانفرنس کی تمام تر تفصیلات بدھوں نے تانبے کی ایک 'پتر' پر کندہ کروا کر کسی مقام پر دفن کر دیا تھا۔ تاریخ کے اوراق میں مانی کا قیام اس لحاظ سے یقینی ہو جاتا ہے کہ اس نے بھی اپنی تعلیمات کا خلاصہ ترک دنیا و لذات مادی دیا تھا جو متصوفانہ نظام کی ترجمانی کرتا ہے غرض یہ کہ مانی اپنی تعلیمات کی تبلیغ میں بے حد فعال اور متحرک رہا ہے۔ ریاست میں جب شومت کا پرچار ہوا، تو ان کے نظریات اور خیالات بھی اسی رجحان کو تقویت پہنچانے والے معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل بدھ دھرم اور ویددھرم کی تعلیمات کی آمیزش کے نتیجے میں خدا پرستی کا ایک نیا فلسفہ وجود میں آیا۔ جسے کشمیری 'شیودرشن' کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد نویں صدی عیسوی میں رشی سومانند نے رکھی تھی اور کشمیری شیومت کو سمجھانے کے لیے 'شیوسارتر' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ شیومت کے حامی اس بات کے قائل ہیں کہ سنسار یعنی دنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ 'شو' ہی ہے۔ اسلامی تصوف دنیا کی تمام چیزوں کو جدا نہیں مانتا بلکہ ان میں اس کے ظہور ہونے کی تائید کرتا ہے۔ غرض یہ کہ کشمیری شیومت ایک مکمل مذہبی اور اخلاقی فلسفہ ہے جسے 'ترک شاسترز' بھی کہتے ہیں اس فلسفے کی روح سے انسان کو اپنے وجود، اپنی اصل اور بنیادی فطرت کو پہچاننا چاہیے تاکہ وہ اسی طرح زندگی گذار سکے جیسی زندگی گذارنے کا اسے حکم ملا ہے۔ شیومت میں پرتی بھگیا کا لفظ آیا ہے جس کے معنی اپنی اصل کو پرکھنے کے ہیں۔

1319 کے آس پاس ایک ایرانی سوداگر شاہ میر کے کشمیر آنے کا ذکر ملتا ہے جو آخری ہندو راجہ سدیوراج کے دربار سے منسلک ہو گیا تھا 1320 میں لداخ کا شہزادہ جس کا نام چن گیالپو رنچن تھا، اپنے باپ کی زیادتیوں سے تنگ آ کر کشمیر آیا اور راجہ کے سپہ سالار رام چندر رینہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ بعدازاں تاتاری شہزادے کا کشمیر آنا، ہندو راجا کو شکست دینا، رنچن اور شاہ میر کا رینہ کو قتل کرنا، رنچن کا رانی کے ساتھ شادی ہونا اور کشمیری برہمنوں کا برہم ہونا وغیرہ مذکور ہے۔ المختصر یہ کہ راجہ کے مسلمان ہو جانے کے بعد اس کے درباری اور رعایا بھی تیزی سے ایمان لانے لگے اور یوں وادی کشمیر میں دین اسلام کی روشنی پھیلتی رہی، سلطان حیدرالدین رنچن شاہ کے بعد شاہ میر نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی جو تاریخ میں

شمس الدین کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اس شاہ کے خاندان کو تاریخ کشمیر میں 'شاہ میری' خاندان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس خاندان نے کشمیر پر تقریباً 330 سال تک حکومت کی ہے۔ بابا بلبل شاہ (شمس الدین) کے بعد پیر پنجال کے راستے سے تشریف لائے۔ وہ امیر کبیر حضرت میر شیخ سید علی ہمدانی ہیں، جن کو کشمیریوں نے عقیدت ومحبت اور لطف عنایت سے 'شاہ ہمدان' کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور آج بھی زیادہ تر شہرت ان کے اسی نام سے ہے۔ اگر چہ کہ اس بزرگ کا تعلق تصوف کے کبرویہ سلسلہ اور شافعی مسلک سے تھا، پھر بھی وسعت قلبی اور اخوت نوازی کی آبیاری کے لیے آپ نے بابا بلبل ترکستانی کے رائج کردہ سلسلہ اور مسلک (حنفی) کو جوں کا توں جاری رہنے دیا اور ان کا تزکیہ نفس فرمایا۔ صوفی چونکہ مذہبی اور مسلکی رواداری کے قائل ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ ایک ایسے محبت بھرے سماج کی تشکیل چاہتے ہیں جہاں تہذیب وتمدن کے ساتھ محبوب حقیقی اور مخلوق خداوندی سے عشق کیا جائے۔ شاہ ہمدانی نے اپنے والد محترم کے تصوف پر لکھے گئے رسالوں کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد تصوف پر بذات خود کئی رسالے لکھے جن میں 'شمسیہ' بھی ایک تھا۔ غرض یہ کہ چودھویں صدی کے عظیم مبلغ اسلام معمار تقدیر امم اور سالار عجم میر سید علی ہمدانی کی شخصیت اور ان کے داعیانہ کارنامے کی کئی صدیاں گذرنے کے باوجود کشمیری قوم اور امت مسلمہ کے ذہنوں میں آج بھی تروتازہ ہیں۔ جنھوں نے کشمیری قوم کو راہ توحید و سنت دکھا کر ایمان واخلاق کی بے پناہ دولت سے فیضیاب کیا۔ وہ محسن کشمیر تھے ان کی تعلیمات، احسانات اور تابندہ زندگی آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ علامہ اقبال بھی کشمیری تھے ان کے الفاظ دیکھیے

سید السادات سالار عجم　　خطہ را آن شاہ دریا آستیں
دست او معمار تقدیر امم　　در علم وصنعت وتہذیب ودیں

تاریخ کے بغور مطالعہ سے یہ علم ہوتا ہے کہ جموں و کشمیر میں زمانۂ قدیم سے ہی روحانیت کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہاں بدھ بھکشوؤں، سنتوں، اور صوفیوں نے ہر دور میں تصوف کا پرچار کیا اور اپنی زندگی کا لائحۂ عمل طے کیا۔ اپنے اپنے دور میں رائج رہی زبانوں کا مواد آج بھی اسی موضوع سے بھرا پڑا ہے۔ ریشت نے کشمیری شاعری میں تصوف رنگت کی جو شعری روایت قائم کی اس کی اعلی ترین مثالیں ہمیں آج بھی لل دید کی شاعری میں ملتی ہیں۔ لل دید کے خاندان، پیدائش اور پرورش کے بارے میں ابھی تک کوئی خاطر خواہ معلومات دستیاب نہیں۔ موروخوں اور تحقیق کاروں نے اپنی اپنی آگاہی کے مطابق اُن کی پیدائش کی نشاندہی کی ہے۔ لل دید کو، لل شیوری اور لل ماں یا ماجی بھی کہتے ہیں ان میں کچھ ایسی کرامات تھیں جو ہر ایک کے ہاں انھیں اپنا ہونے کا یقین دلاتی تھیں۔ اگر چہ کہ اس کے مذہب کا لب لباب شو اور شکتی ہے لیکن اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اس کے دل کا آئینہ ملت ومذہب کے تفرقوں کے رنگ سے پاک ہو چکا تھا۔ ذات پات، رنگ ونسل اور مذہبی رسومات ان سے کوسوں دور ہو چکی تھیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ ہندوؤں کے ہاں پیدا ہوئی وہیں پلی بڑھی اور مذہبی تعلیم پائی۔ مگر شو کے خیالوں نے ایسا گم کر دیا کہ وہ صوفیوں سے بھی کچھ دور نہ رہی۔ ان کے روحانی فیض سے مستفیض ہوئیں اور اپنے کارنامے سے بھی ان کو متوجہ کیا۔ غرض ان کی کرامات سے متعلق بہت کہانیاں کشمیر میں مشہور ہیں۔ جن میں شیخ نور الدین ولیؒ کو دودھ پلانا اور میر سید علی ہمدانی کی ملاقات جیسے واقعات زیادہ مشہور ہیں۔

علمدار کشمیر (حضرت شیخ العالم شیخ نور الدین نورانی) کی ذات بابرکات سے وادی کشمیر کا کون سا شخص ناواقف ہوگا۔ مسلمانوں میں نند ریشی اور ہندوؤں میں نہرانند کے نام سے یاد کیا جانے والا یہ عظیم المرتبت ریشی، چرار شریف میں اب بھی لوگوں کے لیے ہدایت ورہبری اور سکون کی مشعل روشن کیے ہوئے ہے۔ جموں وکشمیر کے علما اور شعرا نے شیخ العالم کی حیات اور ان کے پیغام کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرنے اور ان کے کلام کی تدوین وتفسیر کے سلسلے میں کئی جتن کیے ہیں۔ لل دید اور نند رشی کے بعد حبہ خاتون کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اپنی بے پناہ صلاحت اور کرامات کی بناء پر ان کا شمار صف اول کی شاعرہ میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد ریاست میں شاعری کا سب سے قد آور نام محمود گامی کا ہے۔ جس نے حبہ خاتون کے چلائے ہوئے مشن کو نقطۂ عروج پر پہنچایا۔ بعض لوگ شاید اسی حوالے سے ان کو ریاست کا ابتدائی شاعر بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا کلام کشمیری میں ہے۔ ان کے کلام کی عام خصوصیات بے ساختگی، جذبات کی عمومیت، زبان کی سلاست اور طرز بیان کی سادگی ہے۔ ان کی شہرت اور مقبولیت کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔ ان کی غزلوں کے دو حصے ہیں۔ صوفیانہ اور عاشقانہ۔ محمود گامی کا ہم عصر شاعر ولی متو تھا۔ جس کے کلام میں بھی متصوفانہ اشعار کی چاشنی ملتی ہے۔ محمود گامی اور ولی اللہ کے بعد رسول میر کا نام آتا ہے۔ جن کا اردو کلام بھی ملتا ہے۔ اس دور میں نعت گوئی کو بہت فروغ ملا۔ اس دور کے شعرا میں ایک اہم نام شناء اللہ کا بھی ہے، جنھوں نے اپنے ذہن رسا اور معنی یاب طبیعت سے شاعری کو نئے تقاضوں سے ہمکنار کیا۔ گلریز، گریست نامہ اور پیر نامہ اس بات کے شواہد ہیں۔ حضرت میاں محمد بخش صاحب اپنے کلام کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ ان کا کلام انھیں کسی محدود جگہ تک نہیں رکھتا۔ جس جگہ جاؤ وہ وہیں کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے متصوفانہ اشعار بڑی تعداد میں لوگوں کو زبانی یاد ہیں۔ وہ کوئی معمولی انسان نہیں تھے۔ آپ کی ریاضت، عبادت، کشف وکرامات مع دیگر صفات کے سلف صالحین کا نمونہ ہیں۔ گویا وہ اللہ والوں میں سے تھے۔ ان کا کلام اتنا مقبول ہے کہ اگر کسی کو کچھ نہ یاد ہو، اس کو بھی میاں صاحب کا کوئی قول، مصرع یا پھر پورا شعر ضرور یاد ہوگا۔ ان کے متصوفانہ کلام سے اخذ کیے گئے اشعار ملاحظہ ہوں۔

قدرت تھیں جس باغ بنائے جگ سنسار تمامی
رنگ برنگی بوٹے لائے کچھ خاصی کچھ عامی
مالی دا کم پانی دینا، بھر بھر مشکاں پاوے
مالک دا کم پھل پھل لانا لاوے یا نہ لاوے
مشکل دی کنجی یارو، مرداں دے ہتھ آئی
مرد نگاہ کرن جس ویلے مشکل رہے نہ کوئی
دنیائے جو کم نہ آیا اوکھے سوکھے ویلے
اس بے فیضے سنگی کولوں بہتر یار اکیلے

مختصراً یہ کہ آپ ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ آپ نے وحدت الوجود کے نظریہ کی تائید کی۔ آپ کے اشعار خاص وعام میں پسند ہیں۔ جموں وکشمیر میں متصوفانہ شاعری کی روایت کو آپ نے بہت فروغ دیا۔ سرزمین کشمیر سے تعلق رکھنے والے دو سگے بھائی، جن کو کشمیر کے دو ادیب سے بھی دنیائے ادب میں جانا جاتا ہے، بھی تصوف رنگت سے کافی متاثر تھے۔ ہر چیز میں انھیں بھی خداوند قدوس کا عکس رجلوہ نظر آیا۔ جس کا برملا اظہار انھوں نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔ 1889 میں اردو کو جب سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوئی تو بہت سارے شعرا جو مقامی اور علاقائی زبانوں کی شاعری میں اپنے مذہب اور حق کے پیغامات کو عام کر رہے تھے، اردو کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے مذہب اور عقائد کی تبلیغ کی۔ لوگ شاعری کے دلدادہ تھے۔ عوام الناس میں شاعری سنی اور پسند کی جاتی تھی۔ دوسری شاعری کی بہ نسبت متصوفانہ شاعری کو زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔

نگاہِ ولی میں وہ تاثیر دیکھی
بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

لوگ اس طرح کی شاعری سے مچل پڑتے تھے۔ علماء، فضلاء، امراء، ادبا اور شعرا کو داد دیتے تھے۔ محفلیں، اور مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ بیرون ریاست سے ایسے

شعرا و ادبا کو دعوت دی جاتی تھی جو تصوف رُبھگتی کے نکات ومسائل سے پوری طرح واقف ہوتے تھے۔ 1914 میں 'بزم مشاعرہ' کے نام سے جموں میں ایک ادبی تنظیم قائم کی گئی تھی۔ جس میں شیخ غلام نقشبندی جیسے لوگوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان مشاعروں میں جو غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ انھیں گلدستہ کی صورت میں شائع کرنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ 'بزم مشاعرہ' جموں میں حصہ لینے والے زیادہ تر مذہبی اور سیاسی نقطۂ نظر کے لوگ تھے۔ اس لیے قلیل عرصے کی مدت میں یہ بزم اپنا استحکام کھو بیٹھی اور صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ لیکن اس بزم مشاعرہ کی وجہ سے بھی متصوفانہ شاعری کی روایت کو قابل قدر فروغ ملا۔ جموں و کشمیر کے ان دو ادبی مراکز یعنی جموں اور کشمیر کے علاوہ خطۂ پیر پنچال اور چناب ویلی کے شعرا کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ یہ دونوں علاقے مذہبی نوعیت کے اعتبار سے کافی اہم رہے ہیں۔ آستان عالی پر شعروسخن کا پرانا رواج آج بھی بدستور جاری وساری ہے۔ ہر سال عرسِ اولیا کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں متصوفانہ اشعار کو خوب گایا جاتا ہے۔ جموں وکشمیر میں ابتدائی دور کے شعراء میں عبدالغنی بیگ زینب بی بی، شیو ناتھ کول منتظر، پنڈت ٹھاکر پرشاد، وانچو مفتوں، پنڈت پرمانند، پنڈت نرنجن ناتھ رینہ، حسن ڈار اور سید محمود انور شاہ وغیرہ کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن کا اردو کلام ملتا ہے جو زیادہ تر مذہبی نوعیت کا ہے۔ ریاست کے مشہور مورخ محمد دین فوق اور عبدالقادر سروری نے ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ جموں وکشمیر میں اردو کی متصوفانہ شاعری کی روایت میں نشاط کشتواڑی کا نام کافی اہم ہے۔ غلام رسول نام، نشاط تخلص اور کشواڑی، کشواڑ کی مناسبت سے کہلائے جو صوبہ جموں کا ایک ضلع ہے۔ لیکن ادبی حلقوں میں ان کی شہرت نشاط کشواڑی کی وجہ ہی سے ہے۔ شعروشاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا اور جلد ہی ایک فاضل استاد اور عالم دین صوفی منش بزرگ حضرت مولانا محمد حبیب اللہ صاحب پونچھی حنفی نقشبندی سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا تو جلد ہی شعروشاعری کے گُر سیکھ لیے۔ ان کے کلام کا زیادہ تر حصہ منظومات پر مشتمل ہے۔ ان کی مذہبی نظموں کے دو مجموعے 'نعتِ سرکار دو عالم' اور 'مناجاتِ اولیا' منظر عام پر آکر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ نشاط ایک تازہ لوح صوفی منش انسان ہیں۔ اس لیے ان کے تصور حیات اور نظریہ تصوف وقتِ حاضرہ میں کسی تعریف سے بالاتر ہیں۔ وہ جہاں یادِ الٰہی میں دست بہ دعا ہوتے ہیں وہیں شاعری کے الفاظ میں بھی، ان کی دعاؤں سے ایک خاص رنگ جھلکتا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ترے در پہ اک بے نوا الٰہی
اٹھاتا ہے دستِ دعا یا الٰہی

آزادی کے بعد پرانے شعرا کے دوش بدوش نئے شعرا کا ایک بڑا قافلہ نظر آتا ہے۔ جن میں امین حزین، کرشن سمیلپوری، ایم۔ ڈی تاثر، صادق علی صادق، وشو ناتھ درماں، آزاد عسکری، میر خورشید احمد، ذبیح راجوری، ضیاء الحسن ضیاء، حبیب اللہ کوثر، رعنا نظامی، امر چندولی، مرزا غلام حسین، بیگ عارف اور حبیب کیفوی وغیرہ کے نام کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان شعرا کے ہاں فکری ندرت اور اظہار کے نئے اسلوب اور سانچے ملتے ہیں۔ 1960 کے بعد شعری ادب میں حلیم منظور، عابد مناوری، راز مناوری، ودیارتن عاصی، محمود الحسن، رہبر جاوید، پرتپال سنگھ بیتاب، محمد رمضان منٹو، بشیر احمد، کے۔ ڈی مینی، فاروق مظفر، خورشید بسمل، احمد شناس، ہشیار راجوروی، فدا کشتواڑی، مرغوب بانہالی منشور بانہالی اور ڈاکٹر صابر مرزا وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ جن کے کلام میں تصوف کی ہلکی سی چاشنی ملتی ہے۔ تمام شعرا کسی نہ کسی مسلک اور مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے اپنے مسلک اور مذہب کی تبلیغ کے لیے بعض اشعار کہے ہیں جن میں خدا کی وحدانیت اور مخلوقِ خدا میں اس کا عکس نظر آتا ہے۔ میر غلام رسول نازکی کی شاعری کا آغاز آزادی سے پہلے ہو چکا تھا لیکن آزادی کے بعد انھوں نے اپنے اسلوب اور لہجے کی وجہ سے ریاست کے شعرا میں ممتاز مقام بنا لیا۔ میر غلام رسول نازکی بیسوی صدی عیسوی کے کشمیر کے علمی، ادبی، سماجی، روحانی اور سماجی منظر نامے کا ایک درخشاں ستارہ ہیں۔ آپ کی ہمہ جہت شخصیت کا ہر ایک گوشہ اور پہلو سنجیدہ اور فکر مطالعے کا متقاضی ہے۔ وہ بیک وقت ایک اعلیٰ پایہ کے استاد، مقرر اور عالم تھے میر غلام رسول نازکی کا اکثر کلام روحانی تجربات کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے نعتیں بھی کہی ہیں۔ جن میں انھوں نے نبی کریمؐ کی بلند ترین اور عظیم ترین شان کو پیش نظر رکھ کر اپنی استادانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہر کیا ہے۔ میر غلام محمد طاؤس اور سیفی سوپوری کے کلام میں بھی تصوف کے نکات ومسائل کی ہلکی پھلکی چاشنی ملتی ہے۔ چھوٹا کشمیر کے نام سے موسوم ضلع پونچھ نے کئی سخنور پیدا کیے ہیں۔ اپنی علمی استعداد کے مطابق اردو شعروادب کے فروغ میں مصروف عمل ہیں اور مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ ان سخنوروں میں تحسین جعفری بھی ایک تھے تحسین جعفری ضلع پونچھ، تحصیل حویلی اور محلہ منگناڑ کے رہنے والے تھے۔ شاعری کا ملکہ ان کی فطرت میں ودیعت تھا۔ آپ کی شاعرانہ فکر، گل وبلبل کے نغمات سے محترز ہوکر روحانی جذبہ، اخلاقی پاکیزگی اور فنی پختگی قابل داد تھی۔ خطہ پیر پنچال کا جدید ترین شعری منظر نامہ جن آوازوں سے معمور ہے۔ ان میں حسام الدین، خورشید کرمانی، لیاقت جعفری، شام طالب، عبدالغنی جاگل، مولوی ریاض احمد ضیائی، فتح محمد عباسی، شہباز راجوروی، پرویز ملک اور دوسرے کئی ان گنت شعرا اپنی اپنی استعداد کے مطابق اردو شعروادب کے فروغ میں مصروف عمل ہیں اور مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ ان شعرا کے کلام میں صوفیانہ اشعار کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اگرچہ ان میں سے صوفی کوئی نہیں تاہم انھوں نے لطیف پیرائے میں دنیا کی بے ثباتی، لوگوں کی خود غرضی، پیر ومرشد کی بزرگی، خدا کی عظمت حضرت رسولؐ سے والہانہ عشق وعقیدت کا اظہار کیا ہے۔

حاصل مطالعہ یہ کہ جموں وکشمیر کو رشیوں، منیوں، سنتوں، اولیا اور عارفوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ جہاں تک اسلامی تاریخ کا تعلق ہے تو یہاں حضرت بلبل شاہ اور حضرت شاہ ہمدان کی بدولت اسلام پھیلا اور کشمیر کو ''ایران صغیر'' کا نام دیا گیا۔ وادی چناب میں حضرت شاہ محمد فرید الدین بغدادی کی تشریف آوری کے سلسلے میں کشتواڑ کو بغداد ثانی اور ڈوڈہ کو فرید آباد کا نام دیا گیا۔ گویا کشمیر 'پیرواری' تو جموں 'صوفی نگر' بن گیا۔ اس کی روشن مثال کھٹ کے مقام پر جموں شہر میں صوفی بزرگ حضرت پیر روشن شاہ ولی کی زیارت عالیہ 'نوگذہ قبر' مرجع خلائق ہے جنھیں ہندوستان میں آنے والا پہلا صوفی بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اس دور میں عربی اور فارسی صوفیانہ شاعری کو بہت فروغ ملا۔ جہاں تک صوبہ جموں کا تعلق ہے تو یہاں پر بھی سنتوں اور سادھوؤں کو ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ مندروں اور پاٹھ شالاؤں میں روحانی تعلیمات دی گئیں۔ یہ صوبہ آج بھی مندروں کے شہر جموں کے نام سے بہت مشہور ہے۔ یہ لوگ لل دید کے متصوفانہ کلام کو مندروں میں بڑے شوق سے گاتے ہیں اور بھگوان کی وحدانیت کے قائل ہیں۔ لل دید کے علاوہ محمود گامی، ولی متو، حبہ خاتون اور مجبور کا صوفیانہ کلام متصوفانہ صفت سے بھرا پڑا ہے۔ تاہم زیادہ تر کشمیری شاعری کی صورت میں ہے۔ بعد ازاں یہی شعرا جب اردو کی طرف متوجہ ہوئے تو اردو میں بھی باضابطہ طور پر تصوف کا آغاز ہوگا۔

■

Mustaque Ahmad Siddiqui
Room No-45,
Sabarmati Hostel
JNU, New Delhi-67

ڈاکٹر اقبال جاوید کی شخصیت کی نمایاں جہتیں

ابواللیث جاوید

نسل انسانی کتنے ہی دشوار گزار مراحل سے گزر کر تہذیبی سطح پر مہذب کہلانے کے قابل ہوئی ہے۔ لاشعوری کے دور میں وہ گھنے جنگلوں، بلند و بالا پہاڑوں کی برفیلی گزرگاہوں میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ کبھی جنگلی جانوروں کا شکار کر کے اپنے پیٹ کی آگ بجھائی ہے تو کبھی بھوک اور پیاس کی شدت لیے جنگل، جنگل صحرا صحرا، بھٹکتی ہے۔ انسان جبکہ اشرف المخلوقات پیدا ہوا مگر اسے یہ مقام اس وقت تک نصیب نہ ہوا جب تک وہ ذہنی طور پر حساس اور فکری طور پر محتاط نہ ہوگیا۔ یہی وہ عناصر تھے جس نے اسے جنگلی جانوروں جیسی زندگی سے نکال کر انسان جیسی زندگی گزارنے کے لیے بستیوں میں لاکھڑا کیا۔ یہ تمام عوامل مل کر ایک لمبی مدت میں برپا ہوئے اور آدمی کو انسان بنا سکے۔ اس کے علاوہ ذہنی ارتقا کے لیے جذبۂ خیر و شر بھی اہم رہا۔ محض انسان ہو جانا کافی نہ رہا بلکہ اس کے اندر وہ تمام خوبیاں جب تک یکجا نہ ہوئیں جو اسے جانوروں کے زمرے سے الگ کرتی ہیں تب تک وہ انسان کہلانے کا حقدار نہ ہوا۔ یہ تمام خوبیاں جذبۂ خیر سے متعلق تھیں جس میں باہمی مروت، ہمدردی، آپسی محبت، رواداری، صلہ رحمی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہی وہ انسانی قدریں ہیں جن سے اچھے معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے ورنہ جذبۂ شر سے تو دنیا برباد ہوئی ہے اور قدرت کی برہمی کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے۔ انسانی تاریخ میں خیر کا معاملہ کم ہی نظر آتا ہے مگر شر کی حشر سامانیاں ہر عہد کی پیشانی پر درج ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ شر کی زندگی مختصر رہی ہے اور وہ خیر کی برکتوں سے اپنے عبرت ناک انجام کو جلد ہی پہنچ گئی ہے۔ دنیا کے تمام ممالک، تمام معاشروں میں خیر کی ہی تعلیمات کو پسند کیا گیا ہے اور قدرت نے بھی خیر کو ہی بحال رکھنے کے اشارے کیے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں، ہر سماج میں خیر کی بحالی کے لیے ہی پیغمبروں، ولیوں، رشی، منیوں کا نزول ہوتا رہا ہے اور سدا ہی صداقت فاتح رہی ہے۔ اگر صداقت کسی بھی منفی طاقت سے زیر ہوتی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ دنیا بربادی کی طرف بڑھ رہی ہے اور آخر کار انجام بڑا ہی عبرت ناک ہوتا ہے۔

غور کیا جائے تو ظلم و استبداد کے بلند ترین مقام پر پہنچتے ہی دنیا کے حالات ناگاہ تبدیل ہوگئے ہیں اور حق و صداقت کے مضبوط ہاتھوں نے اس کا گلا گھونٹ ڈالا ہے۔ یہ بات دیگر کہ ظلم کی آندھیوں نے کچھ دیر کے لیے دنیا کا چین و سکون درہم برہم کر ڈالا ہے۔ خوش قسمت ہے وہ خطۂ ارض، وہ معاشرہ، وہ سماج جہاں حق و صداقت کی آوازیں بلند کرنے والی ہستیاں موجود ہوتی ہیں۔ ان ہستیوں کی خاموش سی دلکش مسکراہٹوں نے ہی ہر طرح کی برائی کو زیر و زبر کر ڈالا ہے اور پورے سماج کو راحت و سکون بخشا ہے۔ ہر امن پسند انسان اپنے اردگرد ایسا ہی پرسکون، پرمسرت اور پربہار ماحول چاہتا ہے جس میں انسانیت کسی کرب میں مبتلا نہ ہو۔ آج بھی ہمارا مسئلہ امن اور صرف امن کا ہی ہے۔ غور کیا جائے تو پوری دنیا کے حالات سازگار بالکل نہیں ہیں۔ دہشت گردی جیسی لعنت نے پوری دنیا کو خوف زدہ کر دیا ہے۔

ایسے سلگتے ماحول میں امن و سکون کی تلاش قدرتی ہے اور یہ شاید اسی وقت ممکن ہے جب معاشرے میں سنجیدہ ذہن کے لوگ ہوں۔ اچھی سوچ سے ہی اچھے سماج کا تصور ممکن ہے۔ اب صرف ایک علم و آگہی کا ہی راستہ نظر آتا ہے جس سے سماج کی افراتفری، بے چینی اور لایقینی کو دور کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم یافتہ سماج شاید اس کی ضمانت دیتا ہے۔ پروفیسر اقبال جاوید کا تعلق یقیناً انھیں سنجیدہ لوگوں میں سے ہے جنھوں نے سماج کو اپنی صالح سوچ، ذہانت اور بلند ترین اخلاق سے وہ سب کچھ عطا کیا جس کی اس کو ضرورت تھی۔ پروفیسر موصوف ایک معروف علمی گھرانے سے متعلق ہیں۔ ان کا بچپن ان کے لائق والد پروفیسر جاوید نہال کی نگرانی میں گزرا۔ ظاہر ہے ان کی پرورش ایک ایسے علمی ماحول میں ہوئی جہاں پروفیسر موصوف جیسا مہذب، بااخلاق اور باشعور انسان ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ ان کی ذہانت بچپن سے ہی ظاہر ہونے لگی تھی اور اپنی عمر سے بڑے عمر والوں جیسا کارنامہ انجام دینے لگے تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی ادب، اسپورٹس اور دوسری سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ کالج تک آتے آتے ایک ہونہار طالب علم، بڑوں کا احترام، چھوٹوں سے محبت اور ضرورت مندوں سے ہمدردی رکھنے والے کی حیثیت سے شہرت حاصل کرلیا۔ یہی وہ اوصاف حمیدہ تھے جوان کے وجود کا خمیر تھے جسے زندگی بھر برتتے رہے۔

کالج میں ایک ذہین اور فعال طالب علم رہے اور اپنے تمام اساتذہ کے محبوب نظر بھی۔ اردو ادب سے جنون کی حد تک عشق رہا جس کے نتیجے میں 'تحقیق و تنقید'، 'متاع ادب'، 'نقش جاوید'، 'مرقع جاوید'، 'آغا حشر کاشمیری- حیات و خدمات' اور 'کاغذ کا گھر' جیسی تخلیقات منظر عام پر آگئیں۔ 'کاغذ کا گھر' سائنسی مضامین پر مشتمل ہے جس سے ان کی سائنس سے بھی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے تحقیق کا موضوع 'شاکر کریمی- حیات و خدمات' رہا جس پر انھیں 'بھیم راؤ امبیڈکر بہار یونیورسٹی' سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ 'وشو بھارتی' سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مختلف علمی و تعلیمی اداروں سے منسلک رہے جس میں مغربی بنگال اردو اکادمی، کلکتہ، ابوالحسن ہائی اسکول، فضل الحق ہائی اسکول قابل ذکر ہیں۔ مسلم پروگریسو سوسائٹی اور کلکتہ مسلم یتیم خانہ کی سرگرمیوں میں بھی قابل قدر خدمات پیش کیں۔ کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی اور NCERT دہلی کے ایک مدت تک رکن رہے اردو صحافت میں بھی گہری دلچسپی رہی۔ اردو ڈرامہ سے خاص شغف رہا اور متعدد اور ڈرامے قلم بند کیے۔ 1976 میں یک بابی ڈرامہ 'ایڈیٹر صاحب' لکھا جسے مولانا آزاد کالج، کلکتہ میں اسٹیج کیا گیا۔ اس ڈرامہ میں اداکاری بھی کی اور ہدایت کار بھی رہے۔ اسی طرح علامہ اقبال صد سالانہ جشن کے موقعے پر انھوں نے دوسرا ڈرامہ 'اقبال کی واپسی' تحریر کیا۔ اس کا مرکزی کردار ادا کیا اور ہدایت بھی دی۔ تیسرا ڈرامہ 'انتقام' تحریر کیا جسے سینٹ انتھونی اسکول، کلکتہ میں اسٹیج کیا گیا اور بے حد مقبول ہوا۔ دوردرشن کلکتہ کے لیے ایک دستاویزی فلم 'یتیم خانہ کلکتہ' پروڈیوس کی اور اسی مرکز سے نشر کی گئی۔ اس طرح ڈاکٹر اقبال جاوید ایک نہایت کامیاب ڈرامہ نویس، اداکار، ہدایت کار اور پروڈیوسر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ انھیں ان خدمات کے لیے انعامات سے بھی نوازا گیا۔ دستاویزی فلم کے لیے 1995 میں نیشنل ایوارڈ، ڈرامہ کے لیے

مغربی بنگال اردو اکادمی کا 2003 کا 'آغا حشر کاشمیری ایوارڈ' اور 2008 کا پرویز شاہدی ایوارڈ قابل ذکر ہے۔

ڈاکٹر اقبال جاوید نے اپنے لیے درس تدریس کے قابل احترام پیشے کو انتخاب اس لیے کیا کہ ان کے خیال میں آگے آنے والی نسلوں کی ذہنی، اخلاقی، تہذیبی اور سماجی، تربیت کے لیے اس پیشے سے بہتر اور دوسرا کوئی پیشہ نہیں۔ یہی جذبہ خدمت خلق انھیں دوسرے لوگوں سے منفرد بناتا ہے۔ اس کار خیر میں سرگرم عمل رہ کر انھوں نے واقعی قوم وملت کی بہت بڑی خدمت انجام دی۔ نئی نسل جو زمانے کی سرد وگرم سے متاثر ہو کر بھٹکتی جاری تھی اس کی نہایت مناسب رہنمائی کی اور اس میں اپنے معاشرے، اپنی ثقافت اور اپنی زبان سے محبت کا جذبہ پیدا کیا۔ یہی کام معاشرے کی اصلاح کا ہمارے اسلاف نے ہمیشہ انجام دیا تھا اور اپنی نسلوں کو برباد ہونے سے بچایا تھا۔ آج اس جذبے کا فقدان ہے۔ ضرورت ہمیں ڈاکٹر اقبال جاوید کی سوچ جیسے ذمے دار لوگوں کی ہے جن میں قوم وملت کی فلاح کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہو۔ درس وتدریس کے ذریعے موصوف نے بہت عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس پیشے سے منسلک ہو کر پوری دیانت داری اور ملی خدمت کے جذبہ کے ساتھ ترقیاں بھی کیں اور ایک معروف کالج سریندر ناتھ ایوننگ کالج کے پرنسپل کے پروقار عہدے پر معمو رہوئے جو شاید کلکتہ کی تعلیمی تاریخ کی تابناک مثال تھی۔

پرنسپل کے عہدے پر رہ کر انھوں نے اپنی ذہانت اور ہوش مندی سے کالج کی انتظامیہ کو کافی بلندی پر پہنچا دیا اور اپنے تمام ماتحتوں، طالب علموں اور اساتذہ کا دل ایسا جیتا کہ ہر قدم پر ان لوگوں کو ان کی بیش بہا رہنمائی کی ہی خواہش ہوئی۔ اتنی شہرت اور اتنی مقبولیت شاید ہی کسی پرنسپل کو نصیب ہوئی ہو۔ عموماً کالجوں میں گروپ بندی، مخالفت اور پرنسپل کی زیادتیوں کے خلاف احتجاج ہوتے رہتے ہیں مگر پرنسپل ڈاکٹر اقبال جاوید کے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ انھوں نے اپنے کالج کی فضا کو ایسی کسی بھی علت سے پاک رکھا اور اپنے حسن اخلاق اور حکمت عملی سے اپنے دشمنوں (اگر کوئی ہو بھی تو) کے دلوں پر بھی راج کیا۔ ان کے تمام طالب علم ان کے اتنے گرویدہ رہے کہ ان کی ہر طرح کی خدمت کے لیے ہمہ تن تیار رہتے اور ان کے حکم کے منتظر رہتے۔ ان کا چیمبر ہر خاص وعام کے لیے ہر وقت کھلا رہتا۔ ایسا عموی نظام آج عنقا ہے۔ کالج کے نظم ونسق میں توازن اس لیے بھی برقرار رہا کہ ان کا کوئی Secrat Agenda نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے تمام اسٹاف کا اعتقاد حاصل کر لیا تھا۔ ان کے حسن اخلاق کی بلندی اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ان سے ملنے والا ہر شخص خود کو ہی سب سے زیادہ ان کے قریب تصور کرنے لگتا تھا۔ یہ ایک اچھے اور کامیاب Administrator کا وصف ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ یقیناً ان کی کامیابیوں کا ذکر ہر محفل میں ہے اور رہے گا۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک اچھے اسپورٹس مین تھے۔ کرکٹ میں انھیں اچھی مہارت تھی۔ اردو صحافت کے میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اردو کے متعدد ڈراموں کے علاوہ ان کی دیگر ادبی تصنیفات مقبول ہوئیں۔ سائنس میں ان کی دلچسپی اس قدر تھی کہ چند سائنسی مقالوں پر مشتمل ان کی کتاب 'کاغذ کا گھر' کافی مقبول ہوئی۔ میں ڈاکٹر موصوف کی تصنیف 'آغا حشر کاشمیری۔ حیات وخدمات' کا خصوصیت سے ذکر کرنا چاہوں گا۔

آغا حشر کاشمیری اردو ڈرامہ کی دنیا کا ایک محترم نام ہے۔ انھیں اردو ڈراموں کا شیکسپیئر کہا گیا ہے۔ اقبال جاوید نے ان کی حیات اور کارناموں پر تحقیقی مقالہ لکھ کر یقیناً ایک بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ آغا حشر کاشمیری کے والدین سری نگر سے نقل مکانی کر کے شہر بنارس میں سکونت پذیر ہوگئے تھے جہاں 1879 میں ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ اردو، فارسی، عربی اور دینیات کی تعلیم بنارس کے معروف استاد حافظ عبدالصمد سے حاصل کی۔ سولہ پارے بھی حفظ کیا۔ ابتدا سے ہی شاعری سے رغبت رہی۔ پڑھنے میں جی نہیں لگا۔ کم عمری میں ہی بغیر والدین کی اجازت حاصل کیے ہوئے ممبئی کا رخ کیا۔ بنارس میں ہی 17-18 سال کی عمر میں پہلا ڈرامہ 'آفتاب محبت' لکھ ڈالا تھا۔ دوسرا ڈرامہ ممبئی میں 'مرید شک' 1899 میں لکھا جب ان کی عمر 20 سال کی تھی۔ آغا صاحب جلد ہی کالوجی تھیٹر یکل کمپنی اور 'سہراب جی ادا گری تھیٹر یکل کمپنی' سے منسلک ہوگئے۔ اسی درمیان اپنے مشہور ڈرامے 'مار آستین'، 'اسیر حرص' اور 'شہید ناز' خلق کیے۔ 1905 تا 1908 ان کے مشہور ڈرامے 'سفید خون' اور 'صید ہوس' منظر عام پر آئے اس کے بعد 'خواب ہستی' اور 'خوبصورت بلا' کی تخلیق ہوئی۔ اہلیہ کی بے وقت رحلت سے دل برداشتہ ہوگئے اور 1918 میں کلکتہ چلے گئے۔ کئی برسوں تک قیام رہا مگر صرف دو ڈرامہ تحریر کیے 'ترکی حور' اور 'رستم سہراب' متعدد دیگر ڈراموں کی تخلیق کے بعد آغا صاحب نے بمبئی کی فلمی دنیا کا رخ کیا اور 'شیریں فرہاد'، 'عورت کا پیار'، 'چندن داس' اور 'یہودی کی لڑکی' جیسی فلمیں بنا کر شہرت حاصل کی۔ انھوں نے 'حشر پکچرز' نام کی ایک فلم کمپنی بھی قائم کی مگر کوئی فلم نہ بنا سکے۔ خرابی صحت کی وجہ سے لاہور چلے گئے جہاں 1945 میں انتقال ہو گیا۔

آغا حشر کاشمیری کی زندگی کے بہت سے تاریک گوشوں کو منظر عام پر لانے کی اقبال جاوید نے کوشش کی ہے اور مختلف محققوں کے حوالے سے اسے ہم تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ تحقیق کا کام نہایت انہماک طلب ہوتا ہے جس میں اقبال جاوید کھرے اترتے نظر آتے ہیں۔

آغا حشر کاشمیری کی پیدائش سے موت تک کے حالات کا بڑی خوبصورتی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے خاندانی حالات، تعلیمی مراحل، سفر بمبئی اور فلموں سے وابستگی، ڈرامہ نگاری، ہدایت کاری، اداکاری، شاعری وغیرہ کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کی زندگی میں آنے والے نشیب وفراز، تھیٹر یکل کمپنی میں ملازمت، اپنی کمپنی کا آغاز، ناکامی، اہلیہ کی بے وقت موت سے مایوسی، معاشی تنگی وغیرہ کی تفصیل بڑی خوبصورتی سے پیش کی گئی ہے۔ آغا حشر کاشمیری اپنے ابتدائی تعلیمی دور میں بہت بے فکرے اور کھلنڈرے نظر آتے ہیں لیکن ان کی تخلیقی صلاحیت اس وقت بھی عروج تھی جس کے نتیجے میں انھوں نے اشعار کہنے بھی شروع کر دیے تھے۔ بہت کم لوگ واقف ہوں گے کہ وہ سولہ پاروں کے حافظ بھی بچپن میں ہی ہو گئے تھے۔ یہ ان کی بے پناہ ذہانت کا ہی ثبوت ہے۔ ان کی زندگی میں بلا کی تیز رفتاری تھی۔ اپنی کم عمری میں ہی انھوں نے اس زمانے کے معروف ڈرامہ نگار مہدی حسن احسن لکھنوی کو ان کے کامیاب ڈرامہ 'چندراولی' کو چیلنج کیا اور اس سے زیادہ کامیاب ڈرامہ 'کتاب محبت' 1897 میں لکھ ڈالا۔ یہ شاید ان کی زندگی میں آنے والی کامیابی کی پیشین گوئی تھی اور ان کی اس تخلیقی صلاحیت نے انھیں بین الاقوامی ڈرامہ نگار بنا دیا۔ ان کی شہرت ملکی حدود سے نکل کر دور دراز ملکوں میں پھیل گئی۔ اردو ادب میں ڈرامہ نگاری کو جو بلند مقام حاصل ہوا ہے وہ صرف اور صرف آغا حشر کاشمیری کی ہی ذات اعلیٰ صفات سے ہی ممکن ہو سکا۔

ڈاکٹر اقبال جاوید کا یہ تحقیقی کام آغا حشر کاشمیری پر کیے گئے دیگر کاموں میں اہم اور اسے احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا رہے گا۔ آگے آنے والی نسلیں اس کام سے یقیناً مستفیض ہوں گی۔ ڈاکٹر موصوف ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کے ادبی کارنامے، اخلاقی بلندیاں اور تنظیمی کارکردگیاں انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ ایسی ہستیاں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں اور دل ودماغ میں کسک پیدا کرتی ہیں۔ ایک سچا فنکار کبھی نہیں مرتا وہ اپنی تخلیقات میں سانسیں لیتا رہتا ہے اور فن وادب کی فضاؤں میں تیرتا رہتا ہے۔

■

Abul Lais Javed
H-17, Ali Apts, 2nd Floor
Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Cell:9873070412/9717147885

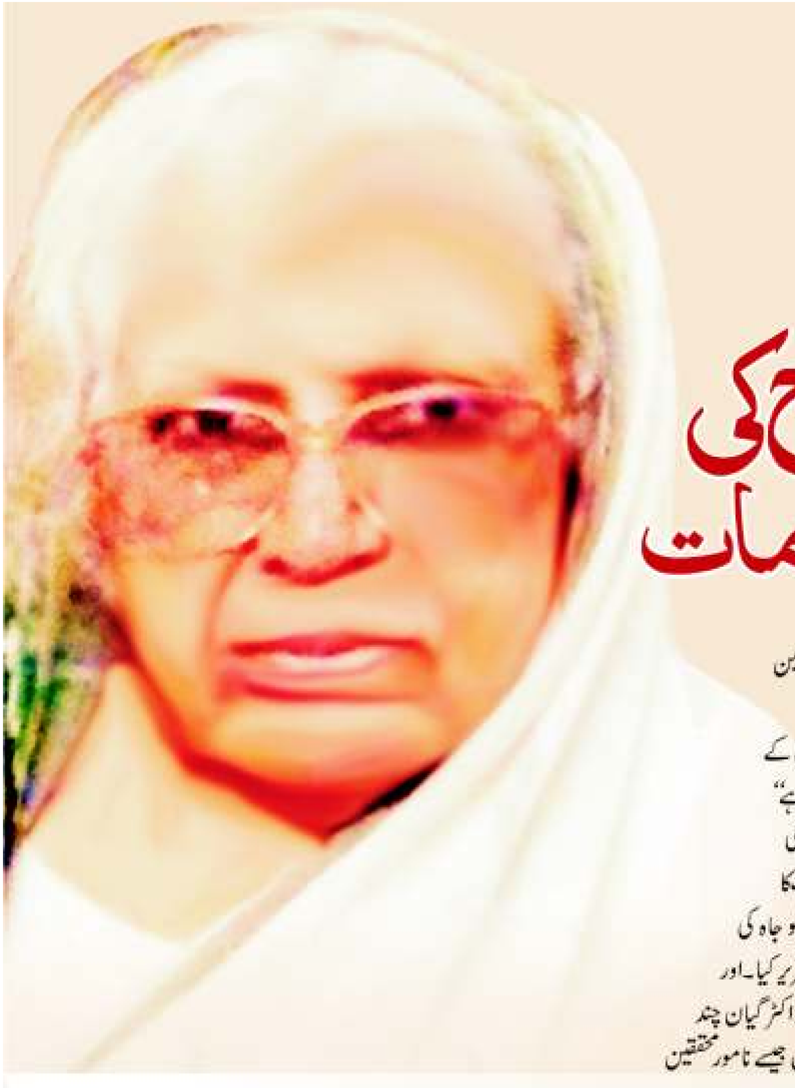

قمر النساء

لئیق صلاح کی علمی و ادبی خدمات

علاقہ حیدرآباد کرناٹک کی خواتین قلمکاروں میں ایک ایسی قلمکارہ بھی شامل ہیں جن کو اگر اس علاقے کی خواتین قلمکاروں کی ملکہ عالیہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا اور یہ شاہانہ جاہ و جلال اور شان و شوکت ان کے نام اور کام میں بھی شامل تھی وہ ادب کی ایک ایسی ملکہ رہی ہیں جو اپنے فن کے ذریعے اس خطے کی ادبی دنیا میں آن بان اور شان سے پچھلے کئی سالوں سے ابھی کچھ وقت پہلے تک حکومت کرتی رہیں۔ اپنے حسن سلوک، شائستہ مزاجی، خوش رو و نرم گفتاری، شفقت، محبت اور ہمدردانہ سلوک سے ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ سرخ و سفید رنگت، پر وقار چہرہ، شائستہ مزاج، خلوص و محبت کا پیکر، ہمدردی اور شفقت کا سمندر اور اردو کی فلاح کا دوسرا نام تھا پروفیسر لئیق صلاح۔

حیدرآباد کرناٹک کی یہ ملکہ عالیہ 10 فروری 1938 کو حیدرآباد دکن کے القعیطی خاندان میں جلوہ افروز ہوئیں۔ آپ کے جد امجد عمر بن عوض القعیطی ناصر الدولہ نظام چہارم کے عہد میں عرب سے یہاں تشریف لا کر حیدرآباد دکن میں سکونت اختیار کی۔ وہ نظام سرکار کے عہد میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور ان کے کارناموں اور خدمات سے خوش ہو کر انھیں شمشیر الدولہ اور جنگ بہادر کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔ 'عصمت النساء بیگم' لئیق صلاح کی نانی خود ایک شاعرہ تھیں اور ان کا تخلص باقرہ تھا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم ان ہی کے زیر نگرانی ہوئی۔ بچپن سے ہی علمی و ادبی ماحول میسر ہوا اور سات سال کی عمر میں اپنا پہلا مضمون لکھا۔ نامپلی سے اسکول اور پی یو سی کی تکمیل کے بعد ویمنس ڈگری کالج سے بی اے، علی گڑھ سے ایم اے کی تعلیم حاصل کی۔ اس وقت شعبہ اردو کے صدر کے عہدے پر پروفیسر آل احمد سرور فائز تھے۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم فل 'میر شمس الدین حیات اور کارنامے' کے عنوان سے ڈاکٹر سیدہ جعفر کی زیر نگرانی پر مغز مقالہ تحریر کیا اس مقالے کے بارے میں مسعود حسین خان کو یہ کہنا پڑا کہ:

"یہ مقالہ ایم فل کے معیار سے بلند تر مقالہ ہے"

اور سیدہ جعفری کی زیر نگرانی میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ بعنوان عہد ارسطو جاہ کی علمی و ادبی خدمات تحریر کیا۔ اور ان مقالوں کے ممتحن ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر محمد حسن جیسے نامور محققین اور نقاد تھے۔

وہ ایک مہذب معزز اور شائستہ مزاج خاتون تھیں۔ مشرقی اقدار کی پاسداری کرنے والی، اعلیٰ ذہن وفکر رکھنے والی، بلند پایہ محقق، بے مثل تنقیدی شعور رکھنے والی، کامیاب طنز و مزاح نگار، عمدہ تبصرہ نگار، تجربہ کار اور ہر دلعزیز استاد اور اردو کی خاموش خدمت گزار تھیں۔ لئیق صلاح کی شخصیت پر صغریٰ عالم لکھتی ہیں۔

"لئیق صلاح کی شخصیت پر اظہار کرنا تفصیل طلب امر ہے یعنی کہ ایک گلشن کے تمام احوال بیان کرنا ہے، فطری انداز گفتگو پر کیف لہجے میں شان افتخاری سے افہام و تفہیم کی مخلصانہ فضا پیدا کرتی ہیں ہر بات نپی تلی ہوتی، متوازن ہموار اور روشن انداز گفتگو، پھول بکھرتے ہوئے لب و لہجہ کی اپنی مثال آپ رہی ہیں۔"

ڈاکٹر لئیق خدیجہ جو ادبی دنیا میں لئیق صلاح کے نام سے مشہور ہیں پیشۂ تدریس سے وابستہ تھیں۔ مختلف کالجس میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے پھر 1983 میں بحیثیت اردو لیکچرر شعبہ اردو گلبرگہ یونیورسٹی میں تقرر عمل میں آیا۔ ریڈر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں اور 1995 میں بحیثیت پروفیسر شعبہ اردو سے ایک نیا دور شروع ہوا۔ 1997 تک صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے کام کرتی رہیں اور اپنے دور صدارت میں بہت سے کام انجام

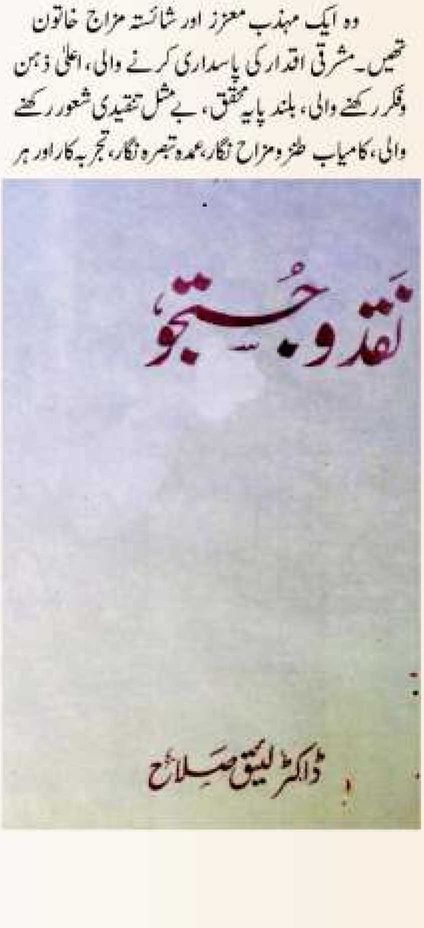

دیے، نئی نسل کو روزگار سے جوڑنے کے لیے صحافت اور کمپیوٹر کو اپنے نصاب میں شامل کرنے کا سہرا آپ کے ہی سر جاتا ہے۔ کئی سیمینار، ادبی اجلاس منعقد کروائے اور اردو کے ریفریشر کورس کا انعقاد کیا۔ ارمغان نامی مجلّے میں اس کورس کے لیکچرز اور ساری روداد کو شائع کرکے اسے دستاویزی شکل دی۔ وہ صرف شعبہ اردو کی ہی صدر نہیں رہیں بلکہ کرناٹک اردو اکادمی کے صدر کے عہدے پر بھی فائز رہیں۔ وہ اکادمی کی پانچویں صدر تھیں اور کرناٹک اردو اکادمی کی خواتین صدور میں دوسری خاتون صدر ہیں۔ ایک خاتون ہوتے ہوئے بحیثیت صدر کے دو مختلف ذمے داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیتی رہیں۔ مختلف ادبی جلسوں کا انعقاد کروایا ریاست کے تقریباً تمام اضلاع تک اکادمی کی ساری سرگرمیوں کو پہنچایا۔ فصیل کے چھ شمارے (1) مضامین وشاعری نمبر (2) ابوالکلام آزاد نمبر (3) جنوبی ہند میں اردو کانفرنس (4) خبرنامہ (5) گلبرگہ اردو سیمینار نمبر (6) توسیعی خطبات نمبر شائع کروائے۔ یہی نہیں انھوں نے مستحقین کو ایوارڈ سے نوازا ان کی تخلیقی اشاعت کو شائع کروایا اور ایسے ہی بے شمار علمی وادبی سرگرمیوں کے ذریعے اکادمی کے ہر شعبے میں ایک نئی روح ایک نئی فضا ایک نئی سوچ ایک نئی فکر عطا کی۔ سیمینار، ادبی مقابلے، کانفرنس اور تہذیبی پروگرام، مشاعرے، سمپوزیم، بحث ومباحثہ وغیرہ کا انعقاد کروایا۔ انھیں اردو زبان سے بے پناہ محبت تھی اور ان کی کاوشیں ان کی اردو سے محبت اور اردو کی بقا کی ضامن بن گئیں اور ان کی خدمات ناقابل فراموش بن گئیں۔

ڈاکٹر حمیرا جلیلی آپ کی صفات کے متعلق رقمطراز ہیں:

"ڈاکٹر لئیق صلاح نہ صرف ایک نامور ادیبہ، بہترین استاد بلکہ ایک نہایت مہذب خاتون ہیں جہاں کہیں بھی ڈاکٹر لئیق صلاح کا ذکر آتا ہے وہاں کے ماحول میں سنجیدگی، شرافت، نفاست اور شائستگی کی رعنائیاں جلوہ افروز رہا کرتی ہیں۔ آداب گفتگو، شرافت کی خوشبو، فکر وخیال کی روشنی اس بات کی غماز ہیں کہ وہ مہذب معاشرہ کی ایک معزز خاتون ہیں۔"

وہ صرف شعبہ اردو کی ہی صدر نہیں رہیں بلکہ کرناٹک اردو اکادمی کے صدر کے عہدے پر بھی فائز رہیں۔ وہ اکادمی کی پانچویں صدر تھیں ور کرناٹک اردو اکادمی کی خواتین صدور میں دوسری خاتون صدر ہیں۔ ایک خاتون ہوتے ہوئے بحیثیت صدر کے دو مختلف ذمے داریوں کو بحسن و خوبی انجام دیتی رہیں۔ مختلف ادبی جلسوں کا انعقاد کروایا ریاست کے تقریباً تمام اضلاع تک اکادمی کی ساری سر گرمیوں کو پہنچایا۔ فصیے

بحیثیت صدر جہاں ان کی خدمات لائق تحسین ہیں تو وہیں ان کی تصنیفات اردو زبان وادب کے لیے باعث افتخار ہیں۔ ادب میں آپ نے بحیثیت طنز ومزاح نگار اپنی منفرد چھاپ چھوڑی ہے۔ حیدرآباد کرناٹک کے مزاحیہ ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ڈاکٹر لئیق صلاح کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ سنی سنائی سے ہوتا ہے۔ جس میں مصنفہ اپنی طنز ومزاح نگاری کے متعلق بعنوان 'کوئی بتلاؤ کہ' کے عنوان سے لکھتی ہیں:

"ہمارا اور مزاح کا تعلق پیدائشی ہے۔ جیسے جیسے شعور پختہ ہوتا گیا اس کی نشوونما ہوتی رہی اور جب پڑھنے لکھنے کی سوجھ بوجھ پیدا ہوئی تو زیادہ تر وہی کردار پسند آیا کرتے تھے جن میں مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا۔ پھر شوکت تھانوی، شفیق الرحمٰن، پطرس، رشید احمد صدیقی اور مجتبیٰ حسین نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ لیکن ان سب سے زیادہ جس شخصیت نے متاثر کیا، وہ ہیں زینت آپا (ڈاکٹر زینت ساجدہ) اس لیے کہ وہ تمام فن کار ہم سے دور تھے آپا کا ہمارا ساتھ قدم قدم پر رہا کرتا تھا۔ پڑھاتیں تو پر لطف جملوں سے محظوظ کرتیں۔ اسی طرح قلم بھی جب رواں ہوتا تو مزاح کا طوفان امنڈ پڑتا اس تصنیف میں جو خاکے ہیں وہ ان ہی کے پیش کردہ خاکوں سے متاثر ہوکر لکھے گئے ہیں۔"

سنی سنائی 1981 میں شائع ہوئی۔ جس کا مقدمہ مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے وہ ڈاکٹر لئیق صلاح کی طنز ومزاح نگاری کے متعلق رقمطراز ہیں:

"لئیق صلاح کے مزاحیہ مضامین میں بلند بانگ قہقہوں کی گنجائش نہیں البتہ تبسم زیر لب کی خوشگوار رو سارے مضامین میں جاری وساری ملے گی۔ لئیق صلاح ایک باشعور مزاح نگار کی طرح سماج کے بے ہنگم پن اور بے اعتدالیوں پر ہنسی ہنسی میں چوٹ کرتی ہوئی گزر جاتی ہیں اور یہی مزاح نگار کا سب سے بڑا فرض منصبی ہے وہ ایک دردمند دل رکھتی ہیں اسی لیے ان مضامین میں ان کی ہمدردیاں سماج کے کچلے ہوئے انسانوں کے ساتھ ہیں جہاں وہ کسی کردار کا مضحکہ اڑاتی ہیں وہیں اس کے کردار سے ہمدردی بھی رکھتی ہیں۔"

سنی سنائی میں کہیں مکالماتی انداز ہے تو کہیں بعض مضامین پر انشائیہ کا گمان ہوتا ہے جیسے 'آج کا اخبار' اور 'نے جاتے نہ تھے' وغیرہ یہ مضامین انشائیے کی صنف میں فٹ بیٹھتے ہیں بعض تحریریں دل کو چھو لیتی ہیں اور شروع سے آخر تک قاری کے لبوں پر تبسم جاری رکھتے ہیں اور یہی دراصل مزاح ہے۔

مضمون 'آج کا اخبار' سے ایک اقتباس:

"بے چارے جٹے پرکاش نارائن بے موت مارے گئے سمجھ میں نہیں آتا کہ بعد کی زندگی کو دوسرا جنم کہیں یا نہیں؟ خیر جانے دیجیے ان کی والی بات تو بعد میں ہوگی پہلے اس خبر رساں ایجنسی کی خبر لینی چاہیے جس نے

لئیق صلاح: سوانحی کوائف

نام: ڈاکٹر لئیق خدیجہ
قلمی نام: لئیق صلاح
تاریخ اور جائے پیدائش: 10 فروری 1938، حیدرآباد
والد اور والدہ کا نام: صلاح بن شمشیر یاور جنگ، خیر النساء
تعلیم: ایم اے (علی گڑھ)، ایم فل، پی ایچ ڈی (جامعہ عثمانیہ) ڈپلوما ان فارسی

تصانیف اور تالیفات: میر شمس الدین فیض حیات اور ادبی کارنامے (تحقیق) 1980، سنی سنائی (مزاحیہ مضامین انشائیہ خاکے) 1981، عہد ارسطو جاہ علمی وادبی خدمات (تحقیق) 1984، عکس در عکس (تحقیقی وتنقیدی مضامین) 1992، ارسطو جاہ از: تمکین کاظمی (ترتیب) ڈاکٹر لئیق صلاح 1993، نقد وجستجو (تحقیقی وتنقیدی مضامین) 1994، تار نفس (انشائیے اور خاکے) 2011، دیدہ وشنیدہ (مضامین وانشائیے) 2012، خدا لگتی (کئی چاند تھے سرِ آسماں از: شمس الرحمٰن فاروقی تبصروں کی ترتیب وتدوین
تاریخ وفات: 20 دسمبر 2017

22 مارچ 1978 کو ہی جئے پرکاش کو آنجہانی بنادیا تھا اس کا خمیازہ بھی مہنگا پڑا۔ دراصل بے موت جئے پرکاش جی مرے نہیں بلکہ وہ مرگیا"

دیدہ وشنیدہ کے نام سے ڈاکٹر لئیق صلاح کے مضامین کا مجموعہ 2012 میں منصۂ شہود پر آیا۔اس میں شامل مضامین سے آپ کی وسعت مشاہدہ کا اندازہ ہوتا ہے بحیثیت عورت کہیے یا بحیثیت مصنفہ اپنے ماحول اور معاشرے کو جس نگاہ سے دیکھا اس کو بیان کر دیا۔

دیدہ وشنیدہ سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''بس کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے لوگوں میں بے تحاشا اسی طرح کا اضافہ ہوتا گیا جس رفتار سے ہندوستانی آبادی میں ہورہا ہے اس آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیے فرقہ وارانہ فسادات یا سیلاب وغیرہ نہ ہوتے تو پتہ نہیں اور کیا حال ہوتا۔''

طنز ومزاح کے ساتھ ساتھ نصاب پر بھی ان کی نگاہ گہری تھی۔'آؤ اردو سیکھیں' کے عنوان سے نصابی کتابوں کا سلسلہ پہلی تا چوتھی جماعت اپنے دیگر ساتھیوں کی مدد سے SCERT گورنمنٹ آف کرناٹک بنگلور کے زیر اہتمام تالیف کر کے اردو زبان و ادب کی اہم خدمت انجام دی۔ دیوان ولی کو بھی NCPUL کے زیر اہتمام اضافوں اور حوالوں کے ساتھ مرتب کیا۔ 2013 میں 'خدا لگتی' تبصروں پر مشتمل تصنیف منظر عام پر آئی۔

ڈاکٹر لئیق صلاح نے تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی تحریر کیے جو مختلف اخبارات ورسائل میں اکثر شائع ہوتے رہتے تھے۔ 1992 میں آپ کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ 'عکس در عکس' شائع ہوا اور 1994 میں 'نقد وجستجو' منظر عام پر آیا۔ جو آپ کی تنقیدی فکر اور تحقیقی کاوشوں کا بین ثبوت ہے۔

تحقیق کے میدان میں پروفیسر لئیق صلاح کی دو کتابیں میر شمس الدین فیض: حیات اور کارنامے اور دوسری عہد ارسطو جاہ کی علمی وادبی خدمات مقبول عام ہو چکی ہیں انھوں نے تحقیق کے میدان میں بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ہے اگر چہ یہ دونوں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے ہیں جو کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔

آپ کے ایم فل کا مقالہ میر شمس الدین حیات اور کارنامے میں مصنفہ نے شخصیت کا بھر پور جائزہ لیا ہے ان کے حالات زندگی، پیدائش، تعلیم وتربیت، درباروں سے وابستگی اور ان کی شاعری کا مکمل احاطہ کیا ہے آپ کی اس تصنیف کے متعلق جناب مہدی عباس حسینی رقمطراز ہیں۔

''لئیق صلاح نے اپنی کتاب میر شمس الدین فیض میں یہی خدمت انجام دی ہے انھوں نے ایک شخصیت نہیں ایک دور کے رخ سے پردہ اٹھایا ہے.... انھوں نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے اس کو مرتب کیا ہے اور فیض کے فن کا اس طرح تنقیدی جائزہ لیا ہے کہ ادب میں ان کے مرتبے کا تعین ہو جاتا ہے اگر چہ یہ کتاب ایک تحقیقی مقالہ ہے جو ایم فل ڈگری کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی میں پیش کیا گیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ مصنفہ یہ مقالہ اتنی محنت اور سلیقے سے لکھا ہے اور ہر طرح کے تعصبات سے بلند ہو کر فیض اور ان کے معاصرین کے بارے میں غیر جانبدارانہ اور بے لاگ تبصرے کیے ہیں کہ مقالہ اردو کے بہترین تحقیقی کاموں کی فہرست میں شامل ہونا چاہیے۔''

عہد ارسطو جاہ علمی وادبی خدمات آپ کی دوسری تصنیف ہے۔جس کو انھوں نے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے پہلا باب سیاسی وادبی پس منظر دوسرا غزل گوئی (جس میں عہد ارسطو جاہ کے غزل گو شعرا کا جامع تعارف مع نمونہ کلام) تیسرا باب قصیدہ نگاری (عہد ارسطو جاہ کے اہم قصیدہ گو شاعرہ) چوتھا باب مثنوی نگاری (پانچواں باب تاریخ نویسی (10 تاریخ نویسوں کی کتابوں کا تجزیہ) چھٹا باب تذکرہ نویسی، ساتواں باب متفرقات نظم ونثر، آٹھواں باب لسانی جائزے سے متعلق ہے غرض انھوں نے اس کتاب میں عہد ارسطو جاہ کے علم وادب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔آپ کی تحقیق کاوش کے متعلق پروفیسر سیدہ جعفر کے خیالات پیش ہیں:

"ڈاکٹر لئیق صلاح نئی پود کی ان باشعور ادبی شخصیتوں میں سے ہیں جن میں تحقیق کا سچا ذوق موجود ہے۔وہ اس کے آداب سے بخوبی واقف ہیں...زیر نظر کتاب ڈاکٹر لئیق صلاح کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس میں انھوں نے ارسطو جاہ اور ان کے ہم عصر شعرا کی علمی وادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔"

ان دونوں تحقیقی وتنقیدی کتابوں کے علاوہ سید تمکین کاظمی کے غیر مطبوعہ مقالے 'ارسطو جاہ' کو بھی ڈاکٹر لئیق صلاح نے مرتب کیا ہے۔ جو کام سید تمکین کاظمی نے کیا تھا، ڈاکٹر لئیق صلاح نے اس کو ترمیم واضافے کے ساتھ شائع کیا جس پر مرتبہ نے 71 صفحات کا طویل اور مفصل مقدمہ لکھ کر اس موضوع کے تئیں اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا ہے۔

پروفیسر لئیق صلاح کی شخصیت اور علمی وادبی خدمات پر یونیورسٹی آف حیدرآباد سے نشاط تہنیت (بیدری) نے پروفیسر انورالدین کی زیر نگرانی ایم فل کا مقالہ تحریر کیا اور سند حاصل کی۔جبکہ گلبرگہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر حبیب تنویر نے ڈاکٹر جلیل تنویر کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

پروفیسر لئیق صلاح جب تک درس وتدریس سے

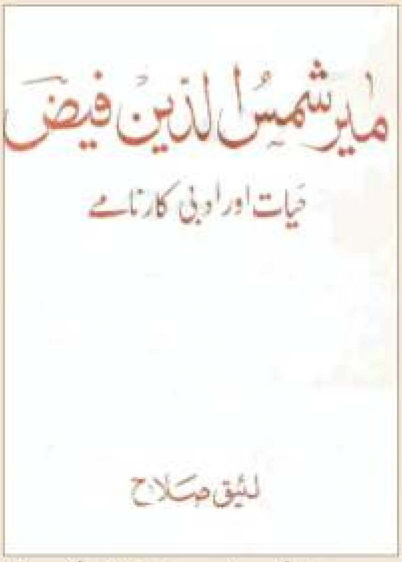

وابستہ رہیں طلبہ کی رہبری اور ریسرچ اسکالرز کی سرپرستی فرماتی رہیں۔اس کے ساتھ لکھنا، پڑھنا، مطالعہ، ادبی گفتگو آپ کا وطیرہ رہا۔ وظیفہ حسن خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ادبی مشاغل جاری رہے اشاعتی سلسلہ تیز تر رہا اس طرح آپ کی بہت ساری تصانیف منظر عام پر آئیں۔

راقمہ کو بھی پروفیسر لئیق صلاح سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ پروفیسر لئیق صلاح میرے استاد محترم عبدالرب استاد کی استانی رہ چکی ہیں۔سر کی اپنی استانی سے دلی وروحانی وابستگی تھی سر کی اکثر باتوں اور لیکچرز میں میڈم کا ذکر ہوتا تھا۔ اسی لیے ہمارے دل میں میڈم سے ملاقات کی چاہ جاگی اور صرف ایک ہی ملاقات میں پروفیسر لئیق صلاح نے محبت، اپنائیت، شفقت اور خوش گفتاری سے اپنا گرویدہ بنالیا ہم نے اپنے استاد محترم سے ہمیشہ اپنی استانی کے لیے خلوص محبت اور تعظیم ہی دیکھی اس قدر خلوص اور تعظیم وتکریم دیکھ کر ہمارے دلوں میں اپنے اساتذہ کے ساتھ ساتھ پروفیسر لئیق صلاح کے لیے بھی عزت بڑھتی چلی گئی۔

پروفیسر لئیق صلاح نے بحیثیت استاد اپنے شاگردوں کے دلوں میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں تو دوسری طرف بحیثیت فنکار اردو دنیا پر اپنی علمی وادبی وفنی خدمات کے دیرپا اثرات ثبت کیے ہیں جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے غرض لئیق صلاح ایک شخصیت نہیں اس خطے کا ایک عہد ہیں ایک عورت کی اتنی خدمات ہم تمام اردوداں طبقے کے لیے باعث افتخار ہے اور حالیہ دنوں ان کی موت نے اردو طبقے میں ایک خلا سا پیدا کر دیا ہے اردو کی فلاح کے لیے لڑنے والی دوسری لئیق صلاح ملنا مشکل ہے۔

■

Qamerunnisa (RS)
Dept of Urdu & Persian
Gulbarga University - 585106 (Karnataka)
Mob: 7259673569

ظہیر حسن ظہیر

ذرا سی دیر میں برسوں کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

سانسوں اور رشتوں کی ڈور کس قدر نازک ہوتی ہے اس کا اندازہ مجھے 17 اکتوبر کو اس وقت ہوا جب میرے مشفق استاد، مخلص رہنما، ہمدرد وغمگسار اور خیر خواہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی برسوں کی رفاقت کو چند لمحوں میں توڑ کر ایسی جگہ ہجرت کر گئے جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ میں اور بیٹی عدیلہ نسیم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دست شفقت سے محروم ہوگئے۔

انسانی زندگی میں سانحات کا رونما ہونا تو عام بات ہے، لیکن کچھ سانحے ایسے ہوتے ہیں جو انسان کے ذہن و دل پر نقش ہو جاتے ہیں اور تا حیات وقت کے سرد و گرم حالات کے باوجود ذہن و دل سے محو نہیں ہوتے اور جس کی یاد برسوں تک تازہ رہتی ہے۔ ایسے ہی ایک عظیم سانحے سے 17 اکتوبر 2019 کو ہم سب دو چار ہوئے۔ ایک طرف چمن سرسید میں سرسید علیہ الرحمہ کی پیدائش کا جشن منانے کی تیاری زوروں پر تھی اور شام کا انتظار شدت سے ہو رہا تھا کہ پورے چمن کو برقی قمقموں سے روشن کیا جائے اور دوسری طرف سرزمین سرسید پر ہی انھیں کا ہم خیال ایک شخص سہ پہر کے وقت موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا اور چند گھنٹے کی جد و جہد کے بعد آخر کار موت فتحیاب ہوگئی اور زندگی ناکام۔ یعنی اردو زبان و ادب کا ایک بے لوث خادم، علمی، ادبی دنیا کی ایک محترم و معتبر شخصیت ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی اپنے ہزاروں چاہنے والوں کو چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہوگئے (انا للہ و انا الیہ راجعون) مسیحاؤں کی تمام کوششیں رایگاں ہوگئیں، تمام مسیحا مل کر بھی ایک ساعت کا اضافہ نہیں کر سکے۔ اپنی اہلیہ رضوانہ خاتون، بیٹی عدیلہ نسیم اور مجھے ادھورا چھوڑ کر چلے گئے۔ حالانکہ ابھی ہم دونوں کی زندگی میں کئی مرحلے ایسے تھے کہ ان کی موجودگی ہم دونوں کے لیے لازمی تھی لیکن مشیت ایزدی کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ اس موقع پر کرشن بہاری نور لکھنوی کا شعر یاد آ رہا ہے جس میں زندگی و موت کے فلسفے کو بیان کیا گیا ہے۔

زندگی موت تیری منزل ہے
دوسرا کوئی راستہ ہی نہیں

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جس شخص کے ساتھ قلبی لگاؤ ہوتا ہے اس کے خلاف کسی بھی طرح کی بری خبر سننے کے لیے ذہن تیار نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم لوگوں کا دل بھی کسی طرح سے یہ بات ماننے پر راضی نہیں ہو رہا تھا کہ جو شخص چند گھنٹے پہلے تک مسکرا کر گفتگو کر رہا تھا وہ اتنی جلدی ہم سے رخصت ہو جائے گا۔ لیکن موت ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اور اسے کسی بھی حال میں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ بہر حال بڑی مشکلوں سے میں نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کیا اور فوراً ہاسپٹل سے باہر نکل گیا، پھر تو آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا۔ اسی حالت میں سب سے پہلے انتقال کی خبر میں نے حکیم وسیم احمد اعظمی صاحب کو دی جو مرحوم سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور ان کی صحت کو لے کر کافی فکر مند بھی رہا کرتے تھے۔ انھوں نے افسوس کا اظہار کیا اور فون پر مجھے تسلی دیتے رہے۔ پھر میں نے پروفیسر مولا بخش صاحب کو اس جانکاہ حادثے کی خبر دی جس کو سن کر وہ بھی رنجیدہ ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ ہاسپٹل پہنچ گئے۔ شام کو تقریباً چھ بجے کے آس پاس میں نے ڈاکٹر عنبر آفاقی صاحب کو فون پر اس المناک حادثے کی خبر سنائی کہ ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے کہا کہ کیا کہہ رہے ہو؟ نسیم بھائی کا انتقال ہو گیا؟ انھیں جیسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ چوں کہ علی گڑھ آنے سے دو روز قبل موصوف نے گھنٹوں بیٹھ کر ان سے گفتگو کی تھی۔ آخر عمر میں وہ اکثر و بیشتر مرحوم کے پاس آتے تھے اور گھنٹے دو گھنٹے بیٹھ کر مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے تھے جس سے مرحوم کی طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی تھی۔ گھر پر مرحوم کو جب بھی کسی قسم کی پریشانی لاحق ہوتی تھی تو میں ان سے رجوع کرتا تھا اور وہ کوئی نہ کوئی یونانی دوا تجویز کر دیتے تھے۔

شام تک سوشل میڈیا کے توسط سے ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کے انتقال کی خبر مئو اور قرب وجوار کے ساتھ ساتھ پوری ادبی و علمی دنیا میں پھیل گئی اور میرے پاس متعلقین اور احباب کے فون آنے لگے۔ 17 / اکتوبر کو تقریباً سات بجے کے آس پاس ہم لوگ مرحوم کا جسد خاکی لے کر مئو کے لیے روانہ ہوئے اور اگلے روز صبح آٹھ بجے مئو پہنچے۔ میت کے گھر پہنچتے ہی کہرام سا مچ گیا۔ سوگواروں کی بڑی تعداد مرحوم کے آخری دیدار کے لیے جمع ہو گئی۔ گھر پہنچ کر جب میں نے الیاس الاعظمی صاحب کو فون کیا تو وہ بے ساختہ رو پڑے اور مجھے فون پر ہی پرسہ دیتے رہے۔ موصوف خود کافی دنوں سے علیل ہیں، لیکن تمام پریشانیوں کو گوارا کرتے ہوئے وہ مرحوم کے آخری دیدار کے لیے جمعہ کی نماز سے قبل گھر پر حاضر ہوئے اور اپنے دیرینہ رفیق کو کفن میں بے حس و حرکت دیکھ کر زار و

قطار رونے لگے۔ 18 اکتوبر کو بعد نماز جمعہ مرحوم کو ان کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ جس شخص کی ذرا سی بھی تکلیف مجھے گوارا نہ ہوتی تھی وقت نے ایسی کروٹ لی کہ آج اس کے جسم پر تین مٹھی خاک ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ زبان حال سے شکوہ کر رہے ہیں کہ:

اس بھیڑ میں کچھ میری حقیقت نہیں لیکن
دب جاؤں گا مٹی میں تو سب یاد کریں گے

تقریباً ایک سال سے وہ علی گڑھ کے میڈیکل کالج میں زیر علاج تھے۔ 8 / اکتوبر 2019 کو میں انھیں علی گڑھ لے آیا۔ اور دنوں کی بہ نسبت اس بار طبیعت کچھ زیادہ ہی مضمحل تھی۔ 9 اکتوبر کو ڈاکٹر سے ملے اور اپنی کیفیت بیان کی، ڈاکٹر نے دوا تجویز کی پھر ہم لوگ روم پر آ گئے۔ اگلے روز صبح پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ انھوں نے اپنی اہلیہ اور بیٹی عدیلہ سے گفتگو کی اور کہا کہ میری طبیعت بہتر نہیں ہے آپ دونوں علی گڑھ آ جائیں۔ اس درمیان ان کی تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی، بعد ازاں بڑی مشکل سے میڈیکل کالج پہنچے۔ وہ بار بار مجھ سے کہہ رہے تھے کہ مجھے ایڈمٹ کر دو، پھر میں نے ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو انھوں نے ایڈمٹ کر لیا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ انھوں نے یہ بات کئی بار مجھ سے کہی کہ اب میں ٹھیک ہو جاؤں گا تبھی روم پر جاؤں گا، تم ڈاکٹر سے جانے کے لیے مت کہنا، میں نے انھیں تسلی دی کہ جب آپ خود کو بہتر محسوس کریں گے تبھی ہم یہاں سے جائیں گے۔ علاج و معالجہ حسب معمول ہوتا رہا۔ کسی دن طبیعت بہتر معلوم ہوتی اور کسی دن پریشانی میں اضافہ ہو جاتا۔ ایک دن ان کی طبیعت قدرے بہتر تھی تو میں نے کہا کہ میں ہاسٹل جا رہا ہوں، تو انھوں نے کہا جاؤ لیکن جلدی آ جانا۔ مجھے آنے میں جب تھوڑی تاخیر ہوئی تو ان کا فون آیا کہ جا کر مجھے بھول گئے ہو کیا؟ میں فوراً بھاگتا ہوا آیا تب انھیں سکون ملا۔ تھوڑی دیر کے لیے بھی مجھے اپنے سامنے سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ 17 / اکتوبر کی صبح بھی انھوں نے معمول کے مطابق ناشتہ کیا۔ تھوڑے وقفے کے بعد میں نے انھیں دوا کھلائی۔ اس درمیان ڈاکٹر آئے تو انھوں نے اپنی پریشانی بھی بتائی اور کہا کہ اب مجھے تھوڑا اطمینان ہو گیا ہے۔ پھر ان کی بیٹی عدیلہ نے انھیں بسکٹ اور کیلا کھلایا، اور وہ آرام سے بیٹھ کر اپنی اہلیہ سے گفتگو کرتے رہے۔ وارڈ میں مریضوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے انھیں پریشانی محسوس ہو رہی تھی جس کے سبب انھیں سائڈ روم میں لایا گیا، ابھی ایک گھنٹہ کے قریب وقت گزرا تھا کہ اچانک ان کا دم گھٹنے لگا اور ہم لوگ پریشان ہو گئے۔ اسی پریشانی کے عالم میں ہم لوگ انھیں ایک پرائیویٹ ہاسپٹل میں لے گئے لیکن تمام کوششوں کے باوجود ناکامی ہی ہاتھ لگی اور سہ پہر کے وقت تقریباً ساڑھے تین بجے کا وقت رہا ہوگا جب ڈاکٹر نے مایوسی کا اظہار کیا۔ پھر تو سارا منظر ہی بدل گیا اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ ایک عورت بیوہ ہو گئی، ایک بیٹی یتیم اور ایک بیٹے جیسے شاگرد کے تمام ارمان خاک میں مل گئے۔

والدین کے بعد مرحوم سے جو شفقت و محبت مجھے ملی اب شاید اس دنیا میں کوئی نہیں دے سکتا۔ وہ مجھے بے حد عزیز رکھتے۔ ان کی خواہش رہتی تھی کہ میں زیادہ تر وقت ان کے ساتھ ہی گزاروں۔ شہر میں کسی سے ملنے جانا ہو یا کسی تقریب میں شرکت کرنا ہو وہ مجھ کو ساتھ لیے بغیر نہیں جاتے تھے۔ گھر پہ رہیں یا جونپور ان کا روز کا معمول تھا کہ دو چار گھنٹے کے وقفے سے خیریت دریافت کرنے کے لیے خود ہی فون کرتے تھے اور پوچھتے تھے کیا حال ہے، کیا کر رہے ہو؟ میں انھیں اپنی خیریت سے مطلع کرتا، پھر ایک دو منٹ کام کی باتیں کر کے فون رکھ دیتے۔ میرا بھی روز کا معمول تھا کہ صبح اٹھنے کے بعد سب سے پہلے ان کی خیریت دریافت کرتا۔ اگر کسی وجہ سے مجھے فون کرنے میں تاخیر ہو جاتی تو فون کر کے یہ جملہ ضرور کہتے تھے بھول گئے تھے کیا مجھ کو۔ اس جملے میں اتنی اپنائیت ہوتی تھی مجھے رشک آتا تھا، اب کون مجھ سے انداز میں گفتگو کرے گا اور میں کس سے اپنا دکھ درد بیان کروں گا۔ ایسے مخلص اور خاکسار لوگ اس دنیا میں خال خال ہی آتے ہیں۔

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی سے میری پہلی ملاقات آج سے تقریباً اٹھارہ سال قبل ہوئی تھی۔ موصوف کا نام اکثر و بیشتر لوگوں کی زبانی سنا کرتا تھا، لیکن کبھی ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ ان کے نام کے ساتھ اعظمی کی نسبت سے میں انھیں اعظم گڑھ کا سمجھتا تھا۔ شعر و ادب سے دلچسپی کے سبب اخبار میں عموماً شعری نشستوں کی کارروائی پر زیادہ نظر رہتی تھی۔ حسنِ اتفاق ایک دن اخبار میں مئو کی کسی بزم کے تحت منعقدہ ایک شعری نشست کی کارروائی پر نظر پڑی۔ یہ شعری نشست موصوف کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی اور انھیں کا شعر اخبار کی سرخی بھی بنا تھا۔ اس شعر نے مجھے بے حد متاثر کیا اگرچہ وہ شعر بر وقت میرے ذہن میں نہیں ہے۔ چنانچہ میرے دل میں موصوف سے ملنے کا مزید اشتیاق پیدا ہوا۔ میرے گھر سے تقریباً ایک کیلو میٹر کے فاصلے پر طیب اختر کی دوکان تھی۔ وہاں شام کو شعراء، ادبا اور ادب نواز حضرات بیٹھتے تھے۔ چوں کہ میرے محلے کے دوستوں میں میرا کوئی ہم مزاج نہیں تھا، چنانچہ میں بھی اپنے ذوق کی تسکین کے لیے شام کو مذکورہ جگہ پر پہنچ جاتا تھا۔ ایک دو گھنٹے شعر و ادب پر گفتگو ہوتی اور پھر سب اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتے۔ ایک دن میں وہاں پہنچا تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب مئو میں کس کے یہاں آتے ہیں، تو انھوں نے بتایا کہ وہ محلہ ڈومن پورہ کے رہنے والے ہیں اور جون پور میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، وہ ہر جمعرات کو اپنے گھر آتے ہیں۔ اب میرے دل میں ان سے ملنے کی مزید خواہش پیدا ہوئی۔

حسب معمول ایک دن میں مذکورہ جگہ پہنچا تو کئی لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ رواج کے مطابق سلام کر کے میں بھی بیٹھ

گیا۔ ادب کے کسی اہم موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک نئے چہرے کو دیکھ کر ان کے بارے میں جاننے کے لیے طبیعت بے چین تھی۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کوئی اہم شخصیت ہے۔ مجھ سے رہا نہ گیا، وہاں بیٹھے ہوئے ایک شخص سے میں نے پوچھا یہ کون صاحب ہیں تو اس نے مجھے بتایا کہ یہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب ہیں۔ گفتگو ختم ہونے کے بعد اشفاق منیم صاحب نے میرے نانا کے حوالے سے میرا تعارف کرایا۔ میرے نانا بھی شاعر تھے اور موصوف سے ان کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ پوچھا کیا کرتے ہو، میں نے بتایا کہ میں نے درجہ آٹھ تک تعلیم حاصل کی ہے اور گھریلو حالات سازگار نہ ہونے کے سبب میرا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ انھوں نے کہا ابھی تمھاری پڑھنے کی عمر ہے۔ تم شعر و شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھو۔ ان کے اخلاق کریمانہ اور انداز گفتگو نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ پہلی ہی ملاقات میں ان کا گرویدہ ہو گیا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ منشی کا فارم بھرا جا رہا ہے، تم کل جا کر فارم بھر دو، پھر بتاؤں گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ حسب حکم میں نے فارم بھر دیا۔

ایک ہفتے بعد جمعرات کو مذکورہ جگہ پر ان سے ملاقات ہوئی، تو میں نے انھیں بتایا کہ فارم بھر دیا ہے، انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور میرے روشن مستقبل کے لیے دعائیں دیں نیز مطالعہ جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ ان کی شفقت و محبت نے میرے اندر تعلیم جاری رکھنے کا حوصلہ بڑھایا۔ دوسری ملاقات میں انھوں نے مجھے گھر آنے کی دعوت دی۔ اب میں جمعرات کا شدت سے انتظار کرنے لگا۔ اگلی جمعرات کو میں ان کے گھر پہنچا۔ میں نے دستک دی، انھوں نے خود دروازہ کھولا اور بڑی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ جس کمرے میں بیٹھا تھا وہاں صرف کتابیں اور رسائل نظر آ رہے تھے۔ مجھے لگا کہ یہ کوئی لائبریری ہے، میں نے ان سے پوچھا تو بتایا کہ یہ میری ذاتی کتابیں ہیں۔ پھر ان سے گفتگو ہونے لگی۔ انھوں نے مجھ سے میرے گھر کے حالات دریافت کیے۔ میں نے انھیں بتایا تو میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا کہ زندگی میں ایسے حالات آتے رہتے ہیں تم گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

موصوف سے تعلق ہونے کے بعد میں ان سے ادبی رسائل اور کتابیں مطالعے کے لیے مانگ کر لاتا تھا اور وہ مجھے کتابیں اور رسائل دیتے ہوئے اس بات کی تاکید کرتے تھے کہ اسے پڑھنے کے بعد اپنی رائے لکھ کر لانا۔ چنانچہ میں مطالعہ کرنے کے بعد اپنی ٹوٹی پھوٹی

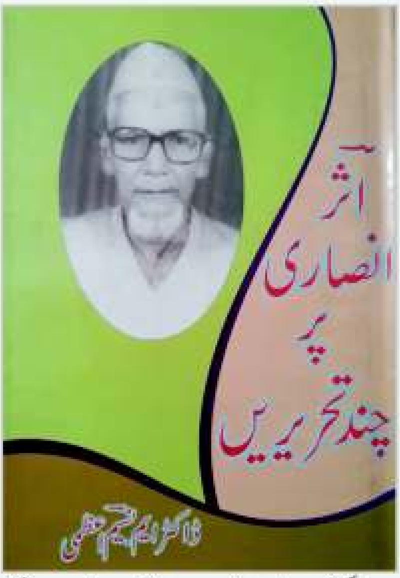

رائے لکھ کر لے جاتا تو وہ بہت خوش ہوتے اور اس کی اصلاح فرما دیتے، پھر اسے شائع ہونے کے لیے خود ہی بھیج دیتے تھے۔ اس طرح میرا حوصلہ بڑھتا گیا اور میں نے قلم پکڑنا سیکھا، اور آج ٹوٹا پھوٹا جو کچھ لکھتا پڑھتا ہوں وہ مرحوم کی ہی دین ہے۔

رفتہ رفتہ موصوف سے اس قدر قربت ہو گئی کہ انھوں نے مجھے اپنے گھر کا ایک فرد سمجھ لیا اور پھر اسی انداز سے ان کا ہمدردانہ رویہ میرے ساتھ روز بہ روز بڑھتا گیا۔ اپنے گھر کی چھوٹی سے چھوٹی تقریب میں مجھے شامل کرتے، ان کی اہلیہ اور بیٹی کے مطابق ہر وقت ان کی زبان پر میرا ہی ذکر ہوتا تھا۔ پھر آپس میں گھریلو تعلقات قائم ہو گئے اور وہ بھی میرے گھر آنے جانے لگے۔ جو تعلق مرحوم سے قائم ہوا تھا اس کو انھوں نے 17 را کتوبر تک اسی انداز سے نبھایا جیسا کہ پہلے دن سے قائم ہوا تھا۔ ان کی شخصیت عباس تابش کے اس شعر کے مصداق تھی۔

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہر جمعرات کو موصوف سے ملاقات کا معمول بن گیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی مجھے فون کرتے۔ میں بھی منتظر رہتا تھا، میں ایک دو گھنٹے کے وقفے سے ان کے یہاں حاضر ہو جاتا۔ گھنٹے دو گھنٹے بیٹھ کر ان سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے ذہنی سکون بھی ملتا تھا اور میری معلومات میں اضافہ بھی ہوتا تھا۔ روز بہ روز ان کی نظر کرم میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور مجھے بھی ان سے قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی زیر نگرانی میرا تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔ ایم اے کرنے کے بعد مجھے انھیں کے توسط سے جونپور کے شاہانہ انٹرنیشنل اسکول میں تین سال تک تدریسی خدمات انجام دینے کا بھی موقع

ملا، اس تین سالہ مدت میرا قیام انھیں کے ساتھ رہا اس طرح مجھے اب شب و روز ان سے استفادہ کا موقع ہاتھ آ گیا، موصوف کے ہی توسط سے جونپور کے ادبا و شعرا اور ادب نواز حضرات سے ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ حالاں کہ اس سے قبل بھی موصوف مجھے دو بار ایک پروگرام کے سلسلے میں جونپور بلا چکے تھے، اور اسی اثنا میں احمد نثار جونپوری، محمد عرفان جون پوری، محمد طفیل انصاری، بزرگ شاعر اسلم سہیل، مرحوم ایس۔ ایم عباس ایڈوکیٹ اور ابوذر انصاری جیسے مخلصین سے بھی میری ملاقاتیں کرائیں جن سے آج بھی میرے تعلقات قائم ہیں۔ 4را کتوبر کو محمد عرفان جون پوری اور ابوذر انصاری ان سے ملاقات کی غرض سے مئو آئے تھے، انھوں نے گھنٹوں بیٹھ کر گفتگو کی، ابوذر انصاری نے دو مضامین بھی سنائے اور انھوں نے کچھ مشورے بھی دیے لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ جہاں وہ ایک اچھے ادیب، شاعر، نقاد، صحافی اور ماہر تعلیم تھے وہیں وہ ایک شریف النفس انسان اور مشفق باپ بھی تھے۔ ان میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک بھلے انسان کا خاصہ ہوا کرتی ہیں۔ وہ عجز و انکساری کے پیکر اور امن و آشتی کے خوگر بھی تھے۔ ان کی شخصیت پر تسنیم فاروقی کا شعر بالکل صادق آتا ہے کہ ۔

میں ہوں دریا مجھے خدمت میں لگے رہنا ہے
میں اگر سوکھ بھی جاؤں گا تو بالو دوں گا

میرا اپنا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ان کی ذات سے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔ وہ ایک بے ضرر انسان تھے، اور ہر حال میں جینے کا ہنر جانتے تھے۔ خوش مزاجی اور خوش سلیقگی ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ ان کی گفتگو میں بھی بڑی شائستگی ہوتی تھی، ہمیشہ نرم لہجے ہی میں گفتگو کرتے تھے۔ میں نے کبھی انھیں تیز آواز میں گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ فون پر بھی وہ بڑی مختصر گفتگو کیا کرتے تھے۔ وہ بڑی کشادہ طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت ”میں تو رستے کا دیا ہوں مرے سب اپنے ہیں“ کے مترادف تھی۔ انھوں نے خود کو کبھی کسی خانے میں محصور نہیں کیا ان کی شخصیت نئی نسل کے لیے ایک نمونہ تھی۔ وہ ایک تعمیری سوچ اور تعمیری فکر لے کر پیدا ہوئے تھے اور پوری زندگی اس کا عملی ثبوت بھی فراہم کیا۔ عبرت مچھلی شہری کا درج ذیل شعر بھی ان کی ذات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔

کچھ تو بس کنبے گھرانے کے لیے ہوتے ہیں
اور کچھ لوگ زمانے کے لیے ہوتے ہیں

موصوف کی شخصیت ان کی اپنی ذات تک محدود نہیں تھی

بلکہ وہ ہمیشہ لوگوں کی بھلائی کے بارے میں سوچتے تھے،اور اکثر یہ کہا بھی کرتے تھے کہ اگر میری زندگی کا کوئی لمحہ کسی کے کام نہ آسکے تو میری زندگی بیکار ہے۔ان کے دل میں قوم وملت کا بے پناہ درد تھا جس کا اظہار وہ اکثر و بیشتر کیا کرتے تھے، چنانچہ اسی کے پیش نظر انھوں نے تعلیم کو اپنا مقصد زندگی بنا لیا تھا،اور ان کی سب سے پہلی کتاب تعلیم کے ہی موضوع پر 'تعلیمی تجزیے' کے نام سے 2002 میں منظر عام پر آئی تھی۔ان کو بس ایک ہی فکر لاحق تھی کہ کس طرح ہماری قوم کے بچے تعلیمی میدان میں آگے بڑھیں اور وہ اس کے لیے تحریری طور اپنا کام کرنے کے ساتھ ہی عملی طور پر بھی اس کی کوششیں جاری رکھتے تھے۔جس بچے کے اندر بھی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ہوتی تھی اس کی ہر لحاظ سے مدد کرتے تھے،اگر اس کو داخلہ لینے میں کسی قسم کی دشواری پیش آتی تو وہ اس کے لیے خود جا کر اسکول انتظامیہ سے بات کرتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ عدم رہنمائی کے سبب جو کچھ میں حاصل نہیں کر سکا میں نہیں چاہتا کہ اس سے کوئی بھی دوسرا بچہ محروم رہے۔

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے مئو ناتھ بھنجن جیسے دور افتادہ علاقے میں بیٹھ کر اپنی 61 سالہ زندگی میں اردو زبان و ادب اور تعلیمی میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔انھوں نے کبھی صلہ و ستائش کی تمنا نہیں کی بلکہ پوری زندگی خسارے میں گزاری۔اگر یہ کہا جائے کہ وہ اس عہد کے انسان نہیں تھے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ انھوں نے کبھی کسی صاحب اقتدار کی جی حضوری نہیں کی اور نہ کسی اکیڈمی یا ادارے کے سربراہوں سے کسی قسم کی سفارش کی بلکہ وہ خاموشی کے ساتھ یہ سوچ کر اپنا کام کرتے رہے کہ:

کبھی تو کوئی پڑھے گا لکھا ہوا میرا
کبھی تو کام یہ شوق فضول بھی دے گا

موصوف نے مئو ناتھ بھنجن سے لے کر جونپور تک علم و آگہی کے چراغ کو روشن رکھا۔وہ جہاں بھی رہے اردو کی بقا اور اس کے فروغ وارتقا کی کوششیں کرتے رہے۔وہ قصبہ گورا بادشاہ پور کے ایک اقلیتی ادارے میں تدریسی خدمات انجام دینے پر مامور تھے۔معلمی کا پیشہ ان کے مزاج سے بالکل ہم آہنگ تھا۔اللہ نے انھیں دینے والا مزاج عطا کیا تھا اور وہ چاہتے تھے جو کچھ میرے پاس ہے وہ سارا علم و ہنر میں طالب علموں میں تقسیم کر دوں اور انھیں اس طرح نکھار دوں کہ وہ کندن بن جائیں۔ چنانچہ وہ بارگاہ ایزدی میں دعا گو تھے کہ:

مجھے تدریس کا پیغمبرانہ دے ہنر یارب
گہر بن جائیں، آجائیں جو کنکر میری مٹھی میں

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی مئو ناتھ بھنجن کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ان کا گھریلو ماحول بھی تعلیمی نہیں تھا۔لیکن انھوں نے اپنی محنت و لگن سے اپنا تعلیمی سفر کئی مرحلوں میں طے کیا تھا۔گھر کے نامساعد حالات کے باوجود ان کے پایۂ استقلال میں لغزش نہیں آئی، ان کا جذبۂ صادق رنگ لایا اور انھوں نے تعلیمی میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ نیز اپنے استاد اثر انصاری مرحوم پر ڈاکٹر منور انجم کی زیر نگرانی اپنا تحقیقی مقالہ 'اثر انصاری: حیات اور خدمات' کے موضوع پر تحریر کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔اپنی اکلوتی بیٹی عدیلہ نسیم کو جو ان کی زندگی کا اصل سرمایہ ہے اسے بھی اپنے برابر ہی تعلیم دلوائی۔اس نے بنارس ہندو یونیورسٹی سے 'قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری' کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے، مگر افسوس کی موصوف کی زندگی میں اس کو ڈگری تفویض نہیں ہو سکی جس کا قلق انھیں بھی تھا،اور ان کی حسرت پوری نہ ہو سکی۔راقم کو بھی زندگی بھر اس بات کا افسوس رہے گا کہ ان کی زندگی میں اپنا تحقیقی مقالہ مکمل نہیں کر سکا۔وہ ہم دونوں کے لیے بے حد فکر مند رہا کرتے تھے اور بارہا کہتے بھی تھے کہ تم دونوں جلدی سے اپنا کام مکمل کرکے کسی اچھی ملازمت سے لگ جاؤ تاکہ میری زندگی کا مقصد پورا ہو جائے اور مجھے ذہنی و قلبی سکون حاصل ہو جائے۔لیکن قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔

موصوف کی شخصیت ان کی اپنی ذات تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ ہمیشہ لوگوں کی بھلائی کے بارے میں سوچتے تھے ,اور اکثر یہ کہا بھی کرتے تھے کہ اگر میری زندگی کا کوئی لمحہ کسی کے کام نہ آسکے تو میری زندگی بیکار ہے .ان کے دل میں قوم و ملت کا بے پناہ درد تھا جس کا اظہار وہ اکثر و بیشتر کیا کرتے تھے ,چنانچہ اسی کے پیش نظر انہوں نے تعلیم کو اپنا مقصد زندگی بنا لیا تھا,اور ان کی سب سے پہلی کتاب تعلیم کے ہی موضوع پر تعلیمی تجزیے کے نام سے 2002 میں منظر عام پر آئی تھی۔

مرحوم کے ساتھ مجھے ہندوستان کے مختلف شہروں میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔کئی بار ان کے ساتھ دہلی بھی گیا۔انھیں کے توسط سے میری ملاقات پروفیسر مظفر حنفی اور حقانی القاسمی سے ہوئی۔بعد ازاں مظفر حنفی صاحب سے کئی ملاقاتیں بھی رہیں۔ 2015 میں خاکسار نے 'ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات' کے نام سے کتاب مرتب کی تو میری گذارش پر انھوں نے بطور تبرک چند سطریں بھی تحریر کیں۔حقانی القاسمی صاحب سے بھی موصوف کے بڑے اچھے مراسم تھے۔اکثر و بیشتر ان سے فون پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔چند ماہ قبل حقانی صاحب کی بیٹی انیقہ کے انتقال کی خبر ملی تو فوراً تعزیت کے لیے فون کیا اور گفتگو کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے۔

مرحوم تضیع اوقات کو زندگی کا سب سے بڑا خسارہ سمجھتے تھے۔چنانچہ یہی سبب تھا کہ انھوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ اپنے مقصد کی تکمیل اور زبان و ادب کی خدمت میں گزارا،جس کے نتیجے میں مرحوم نے 16 بیش بہا تصانیف و تالیفات یادگار چھوڑی ہیں۔''اثر انصاری: فکر و فن کے آئینے میں،نوائے سروش، تعلیمی تجزیے، تعلیمی جہات، اثر انصاری : حیات اور خدمات (تحقیقی مقالہ) مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات، نقد سخن (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) میزان آگہی (شعری مجموعہ) تعلیم اور تعلیمی افکار، اثر انصاری پر چند تحریریں، تعلیمی نکات، تعلیمی اشارات، اردو کے چند فکشن نگار: تنقید و تجزیہ، راجا رام موہن رائے اور ان کے تحریکی و تعلیمی کارنامے، فیضان آگہی (شعری مجموعہ) اختر الایمان کی نظم نگاری: تنقید و تجزیہ۔وغیرہ کتابیں ان کے تنقیدی، تحقیقی و تعلیمی نظریات و افکار اور اسلوب و انداز کو سمجھنے میں بڑی معاون ہیں۔مذکورہ تمام کتابیں تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے طلبا اور تحقیق و تنقید سے تعلق رکھنے والوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ابھی ان کے ذہن میں کئی ایک کتابوں کے منصوبے تھے جس پر وہ کام کرنا چاہتے تھے لیکن زندگی نے وفا نہیں کی اور سارے منصوبے ادھورے رہ گئے۔ان شاء اللہ ان کے عزائم، منصوبوں اور ان کے ادھورے کام کو راقم اور عدیلہ نسیم مل کر پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہم صدق دل سے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت مرحوم کے کار خیر کو قبول فرمائے،ان کی سیئات کو حسنات سے مبدل فرمائے اور ان کی روح کو چین و سکون نصیب فرمائے۔مجھے اور ان کی بیٹی عدیلہ نسیم کو ان کا کوئی نعم البدل عطا فرمائے اور اہل خانہ اور تمام لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔آمین ثم آمین

لوگ اچھے ہیں بہت دل میں اتر جاتے ہیں
بس یہی ایک خرابی ہے کہ مر جاتے ہیں

■

Zaheer Hasan Zaheer
Mughal Pura Near Masjid Zubair
Maunath Bhanjan
Distt: Mau - 275101 (UP)
Distt: 8736992810

محمد اقبال

جپ جی
گورونانک کا عظیم شاہکار

مختلف مذاہب کے مذہبی صحیفوں اور مقدس کتابوں نے انسانوں کی رہنمائی، کردار سازی اور اصلاح کے لیے ہمیشہ موثر کردار ادا کیا ہے۔ مقصدِ حیات سے آشنا کرنے اور زندگی گزارنے کے لیے ان کتابوں کی حیثیت مسلم ہے۔ ہمارے لیے یہ ضابطۂ اخلاق اور دستورالعمل ہیں۔ نیک و بد کی تمیز، کامیابی و ناکامی کے راستوں سے متعارف کراتی ہیں۔ انسانی افعال اور حدود کا تعین بھی کرتی ہیں۔

سکھ مذہب کے بانی گورونانک دیو ایک ریفارمر، مبلغ اور شاعر کے طور پر قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ 'جپ جی' ان کی شہرہ آفاق تخلیق ہے جسے مختلف دانشوروں نے ان کا عظیم شاہکار کہہ کر یاد کیا ہے۔

'جپ جی' کی ابتدا مول منتر سے ہوتی ہے جس میں خدا کی تیرہ صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔

اک اونکار،
ست نام، کرتا پرکھ، نربھؤ
نرویر، اکال مورت
اجونی سیبھنؤ، گر پرساد

اک اونکار یعنی رب صرف ایک ہے، اس کا نام سچ ہے، ہمیشہ رہنے والا ہے، تمام مخلوق کا خالق ہے۔ وہ خوف و رقابت سے بے نیاز ہے۔ اس کا وجود زمان و مکاں اور فنا سے ماورا ہے۔ مراد اسے دوام حاصل ہے۔ وہ جونوں کے چکر میں نہیں پڑتا۔ (پیدائش و موت سے آزاد ہے)۔ لافانی، لاولد ہے، وہ سراپا نور ہے۔ مذکورہ اوصاف و خوبیوں کا مالک رب گورو کی عنایت سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

جپ جی کی متعدد خوبیوں کے سبب اسے گورونانک صاحب کا شاہکار تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے پارکھوں، مفسرین، مفکرین، ناقدین اور مصنفین نے اس کی عظمت اور انفرادیت کو تسلیم کیا ہے۔ مشہور ہندوستانی مفکر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اسے ان کی سب سے مشہور اور مقبول تخلیق تسلیم کیا ہے۔ بلاشبہ یہ ان کے افکار کی کلید اور ان کے تخلیقی فن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کے موضوع کی آفاقیت، وسعت، کشادگی، ہیئت کی انفرادیت، مخصوص لب و لہجہ، اندازِ بیان کی سادگی نے اسے ایک زندہ جاوید شاہکار بنا دیا ہے۔

گورونانک رہبانیت اور گوشہ نشینی کے قائل نہ تھے بلکہ وہ خانگی ذمے داریوں کو منصفانہ طریقے سے خوش اسلوبی کے ساتھ کرنے پر زور دیتے ہیں۔ بابا نانک نے عملی زندگی سے راہِ فرار اختیار کرنے کے طرزِ عمل کی سخت مخالفت کی۔ نجات ترکِ دنیا سے حاصل نہیں ہوتی۔ گھر بار یا خاندان کو چھوڑ کر بلا مقصد گھومتے پھرنے سے نجات کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے باطن میں شمعِ عقیدت روشن کرنے اور خالقِ حقیقی کی طرف سے سونپے گئے روزمرہ کے فرائض کو وہ ضروری خیال کرتے ہیں۔

جوگ نہ کھنتا جوگ نہ ڈنڈے جوگ نہ بھسم چڑائیے
جوگ نہ مندی مونڈ منڈائے جوگ نہ سنگی وائیے
انجن ماہ نرنجن رہیے جوگ جگت اوپائیے
گلی جوگ نہ ہوئی
ایک درست کر سمسر جانے جوگی کہیے سوئی

یعنی جوگ نہ تو کملی اوڑھنے میں ہے، نہ ہاتھ میں عصا لینے سے ہے اور نہ ہی جسم پر راکھ ملنے سے جوگ ملتا ہے۔ کانوں میں مندرے ڈالنے سے بھی یا بال ترشوانے یا ناقوس بجانے سے بھی جوگ حاصل نہیں ہوتا۔''

گورونانک نے واضح کیا کہ ایک الگ تھلگ نیک اور پاکیزہ زندگی سے ایک ایسی زندگی کہیں بہتر ہے جو گھر کی ذمے داریوں کو نبھانے کے ساتھ ساتھ پاکیزگی سے بھی لبریز ہو۔ ان کا خیال تھا کہ سچے یوگ کا راستہ خدا کو تلاش کرنے میں ہے نہ کہ دنیا سے کنارہ کرنے میں۔

نانک بانی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زندگی کے حقائق کا انکار نہیں کیا گیا بلکہ ان حقائق و رموز کو عوام الناس کی عملی زندگی میں سے مثالیں لے کر پیش کیا گیا ہے۔ گورونانک نے مختلف مقامات پر عوامی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے بابا فرید کی پیروی کرتے ہوئے غیر عوامی زبانوں میں اپنا روحانی پیغام عوام تک پہنچانے کی بجائے پنجابی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ ذات پات کی بنیاد پر بنی نوع انسان کی تقسیم کے گورونانک دیو روادار نہیں تھے۔

جات جنم نہ پوچھیے، سچ گھر لیہہ بتائے
سا جات سا پت ہے جیسے کرم کمائے

یعنی ذات اور جنم نہیں پوچھا جاتا جاؤ جا کر بزرگوں سے پوچھ لو۔ تمھارے اعمال ہی تیری ذات کا تعین کرتے ہیں۔ (اگر اعمال اچھے ہیں تو پسندیدہ ہے اور اگر کالے لیکھ لکھے ہیں تو پھر اچھوت ہے یعنی خدا کی مہربانی سے محروم ہے)

راسخ العقیدہ سکھوں کو جپ جی زبانی یاد ہے اور وہ صبح اس کا پاٹھ کرنا اپنے لیے سعادت خیال کرتے ہیں۔ جپ جی کو گورونانک دیو کی تعلیمات کا خلاصہ یا نچوڑ کہا جاتا ہے۔ بہت سے ناقدین نے اسے سکھ عقیدہ و مذہب کی مکمل تشریح اور خلاصہ کہہ کر بھی خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ کچھ سکھ دانشور اس قول کے حامی ہیں کہ یہ بانی جگت گورو جی کو 'واہگورو' اکال مورتی سے حاصل ہوئی نعمت اور بخشش ہے۔

ڈاکٹر بھائی جودھ سنگھ نے اپنے خیال اس طرح پیش کیے ہیں کہ سکھوں کی مذہبی کتاب 'سری گورو گرنتھ صاحب' کے آغاز میں ہی گورونانک دیو جی کی مشہور بانی (کلام) 'جپ جی' درج ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ امرت کے وقت اس بانی کا پاٹھ کرے۔

اس طرح 'حقائق المعانی یا ہدیہ عرفان' لاہور میں اس کی افادیت کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا ہے:

''بے شمار بندگانِ خدا نے اس پاک کلام کی برکت سے نجات حاصل کی اور حیاتِ ابدی ہوئی۔ بے شمار حاصل کر رہے ہیں اور بے شمار آئندہ حاصل کریں گے۔ گویا اس چشمۂ آبِ حیات کی برکت اور فیض تا ابد جاری رہے گا۔''

بابا گورونانک نے نامِ خدا کی تاثیر و فیض کا بھی ذکر کیا ہے۔

سنیے ست سنگوکھ گیان
سنیے اٹھ سٹھ کا اسنان
سنیے پڑھ پڑھ پاوہ مان
سنیے لاگے سہج دھیان
نانک بھگتا سدا وگاس
سنیے دوکھ پاپ کا ناس

رب کا نام اور گورو کی تعلیمات سننے کے بے شمار فائدوں کو بیان کیا گیا ہے۔ دُکھ پاپ ختم ہوجاتے ہیں۔ زمین و آسمان کے بارے میں بہت سے شکوک ختم ہوجاتے ہیں۔ سکون وچین نصیب ہوجاتا ہے۔ منظوم ترجمہ

نام خدا کا سن کر بیچ حاصل ہو صبر اور گیان ملے
نام خدا کا سن کر اڑسٹھ تیرتھ کا اشنان ملے
نام خدا پڑھ سن کر انسان کی عزت شان بھی ہو
نام خدا سے چین ذہن میں آسانی سے دھیان بھی ہو
نانک بھگتی والے بندے خوشیاں خوب مناتے ہیں
نام خدا کا سننے سے دُکھ پاپ بھی کٹ جاتے ہیں

جپ جی کے روزانہ پڑھنے (پاٹھ) کرنے کی روایت کی شروعات خود اس کے خالق نے کی۔ ان کے پہلے سوانح نگار بھائی گورداس جی کے قول کے مطابق جب وہ اداسیاں (تبلیغی دورے) ختم کرکے کرتار پور (راوی) تشریف لائے اور دھرم کرم کی روایت تشکیل کی تو اپنے پروگرام کی سب سے اولین مد اس کا پاٹھ قرار دیا۔

گورونانک دیو جی کے کلام سے ان کے خالق و مخلوق کے تئیں بے پناہ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ انھوں نے انسانی رہنمائی اور فلاح و بہبود کے لیے ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی، قدر و قیمت اور اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی جارہی ہے اور بڑھتی جائے گی۔

مولانا سید حبیب 'جپ جی' کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''میں نے گورونانک دیو جی کی اس شہرہ آفاق اور سب سے زیادہ اہم تصنیف کا منظوم ترجمہ جیل میں اس لیے کیا تھا کہ یہ کتاب باباصاحب کے خیالات کا بہترین مرقع اور ان کے پاکیزہ جذبات کا عمدہ ترین مجموعہ ہے۔''

('جپ جی صاحب' منظوم اردو ترجمہ لاہور، 1925، ص 6)

گورو گوبند جی کے ساتھ وابستہ قول کے مطابق جو سکھ اس کا پاٹھ کیے بنا بھوجن (کھانا) کھائے گا وہ جم پور کا مستحق ہوگا۔

اس شاہکار کی زبان بابا گورونانک کے پنجاب کی رائج بولی ہے۔ یہ اس عہد کی عوامی زبان کی جس کا محاورہ مجموعی طور پر ٹھیٹھ پنجابی ہے۔ یہ وہ پنجابی ہے جو ویدک اور پراکرت سے ترقی کرتی ہوئی اَپ بھرنش کا بھی لبادہ اتار کر اپنی خوبصورت شکل اختیار کرچکی تھی۔

ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی مشہور نظم 'جپ جی کی شان میں' اس نادر تخلیق کے اوصاف کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کی جامعیت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جپ جی صاحب کی ثنا کیا کیجیے
بند کوزے ہی میں دریا کیجیے

اس کی ظاہری ومعنوی خوبیوں کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

کیوں جمالِ گلِ رعنا لکھیے
کیوں بہارِ چمن آرا کہیے
اس میں اوج یہ عظمت ہے کہاں
کیوں اسے نظم ثریا کہیے

جپ جی کی مسیحائی قوت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کا ہر لفظ حیات بخش ہے۔

زندگی بخش ہے اس کا ہر شبد
اس لیے اس کو مسیحا کہیے

شاعر کی نگاہ میں یہ تعریف بھی نامکمل ہے۔ وہ اس کے جملہ اوصاف کا احاطہ کرنا چاہتا ہے۔

یہ بھی تعریف مکمل نہ ہوئی
وصف کہیے بھی تو پورا کہیے

وہ اسے پیغام خدا کہہ کر مطمئن ہونا چاہتے ہیں۔

گورونانک کی زبانی اے جوش
اس کو پیغام خدا کا کہیے

گورونانک دیو کے پاکیزہ کلام اور ان کے پیش کردہ روحانی عظمت کے رموز کی افہام و تفہیم کے لیے 'جپ جی' ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مرورِ ایام کے ساتھ اس کی اہمیت ومعنویت میں اضافہ ہورہا ہے۔

گورونانک دیو کے مجموعی کلام اور تخلیقات میں 'جپ جی' بلند مرتبہ کی حامل ہے۔ 'جپ' بہت قدیم لفظ ہے۔ سنسکرت میں اس کا مفہوم اس طرح بولنا کہ کوئی سن نہ سکے۔ لیا جاتا ہے۔ ایسا پاٹھ جو خاموشی سے کیا جائے۔ کچھ قلم کار اس کے معنی ارداس، گذارش کرنا اور خدا کے کسی نام کا جاپ کرنا بھی لیتے ہیں۔ اس میں لفظی رٹنے کی بجائے اس ہستی کی طرف جس کا ذکر کیا جائے پوری توجہ اور انہماک کا ہونا شرط ہے۔

جپ کے موضوعات میں خالق و مالک کی ثنا وتعریف اور اس کو پانے کے رموز بتائے گئے ہیں۔ حصولِ خدا کی تدابیر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سوچے سوچ نہ ہووئی، جے سوچی لکھ وار
چُپے چُپ نہ ہوئی جے لائے رہا لو تار
بُکھیا، بھکھ نہ اُتری جے بنھاں پُریا پار
سہس سیانپا لکھ ہوہ تا اک نہ چلے نال
کو سچیارا ہویے، کو کوڑے تٹے پال
حُکم رجائی چلنا، نانک لکھیا نال

رب دماغی تدابیر اور مجموعی منصوبہ بندی وغیرہ سے پایا نہیں جاسکتا۔ اسے تو صرف اس کے احکامات کی پابندی اور اس کے مزاج سے اپنے مزاج کو ہم آہنگ کرنے سے ہی پایا جاسکتا ہے۔ اس کے حصول میں واحد رکاوٹ 'ہئو'

اور 'دوئی' کی دیوار ہے جو اس کی رضا پر راضی رہنے سے ہی منہدم ہوسکتی ہے اور انسان کو صادق بناسکتی ہے۔ منظوم ترجمہ

چپ رہنے سے من کب چپ ہو چاہے دھیان ہزار کریں
بھوکے رہ کر بھوک نہ جائے گو دنیا کی نعمت پائیں
لاکھ ہزار کریں چترائی اک بھی ساتھ نہ لے کر جائیں
جھوٹ کا پردہ چاک ہو کیونکر سچا نام ہمارا ہو
حکم رجائی چلنا نانک لکھیا نال

'جپ جی' گورونانک دیو جی کی ایک ایسی بلند بالا تخلیق ہے، جس کے اثرات صدیوں تک قائم رہتے ہیں۔ بقول پروفیسر پورن سنگھ: ''ان کے واحد گیت 'جپ جی' نے انھیں ایسا تخلیق کار ثابت کردیا جن کی فہم وذہانت کی مہر طویل عرصہ تک ثبت رہے گی۔''

(اردو ترجمہ)

"His one song Japji marks him a creator whose genius puts its seal on the ages." (Puran Singh Prof. the Book of the Ten Masters, London, 1926, p 135)

گورونانک نے اجتماعی اور مشترکہ پروگرام کے علاوہ نجی یا شخصی طور پر اس کا پاٹھ کرنے اور سننے کی تلقین کی:

قربانی تناں گور سکھاں پچھلے راتی
اُٹھ بہندے
(میں ان گورسکھوں پر قربان ہوں جو پچھلی رات اٹھ بیٹھتے ہیں)
قربانی تناں گور سکھاں امرت ویلے
سرناوندے
(میں ان گورسکھوں پر قربان ہوں جو علی الصبح اٹھ کر غسل فرماتے ہیں)
قربانی تناں گور سکھاں ہوئے اک من
گور جاپ جپندے
(میں ان گورکھسوں پر قربان ہوں جو یکسوئی کے ساتھ گور جاپ کرتے ہیں یعنی مکمل یکسوئی وعقیدت سے خدا کو یاد کرتے ہیں)

سید اطہر عباس رضوی تو یہاں تک کہتے ہیں ''گورونانک کا 'جپ جی' ایک غیر معمولی عقیدت مندانہ حمد (مذہبی گیت) ہے اور جو قاری اسے سمجھ لیتا ہے وہ اپنے آپ کو سعادت مندی کی عجیب وغریب دنیا میں پہنچا ہوا محسوس کرتا ہے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

جپ جی کا مرکزی موضوع سچے رب کے وجود اور اس کی صفات وعظمت کا بیان ہے۔ اس قادر مطلق رب کے نام کے ذکر وحمد کی اہمیت ہے، اس کے وصال کے راستے کی آگہی ہے۔

■

Dr. Mohd Iqbal
(Ex. Secretary, Punjab Urdu Academy)
'Kashana', GTB Colony, College Road
MalerKotla, Punjab

سید محمد نیر رضوی

صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیاریؒ

محققین نے ابتدائے تصوف اور اس کے ارتقائی مدارج پر مختلف نقطہ ہائے نظر سے غور و فکر کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ 'تصوف' دراصل مخصوص سیاسی، سماجی، تہذیبی، اخلاقی اور فکری تقاضوں کی وجہ سے بطور 'راہ نجات' معرض وجود میں آیا۔ پہلی صدی ہجری تک تو 'تصوف' کی کوئی واضح شکل یا بطور کوئی اصطلاح متعین ہوتی نظر نہیں آتی ہے اور نہ ہی اس کے خدوخال بطور مسلک و مشرب واضح ہوتے دکھائی دیتے ہیں مگر دورِ اُمیہ میں متصوفانہ رجحانات و میلانات صاف طور پر نمایاں ہونے لگے اور یہی رجحانات و میلانات رفتہ رفتہ ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے خلافت عباسیہ کے دور میں منظم اور مرتب دکھائی دینے لگتے ہیں۔ لہٰذا بصرہ اور کوفہ کے علاقوں میں تقریباً 661 عیسوی میں تصوف بطور تحریک شروع ہوا اور دنیا کے مختلف خطوں میں وقت کی اہم ترین ضرورت بن گیا۔ چنانچہ اہل حق، اہل دل اور محققین کی نظر میں حضرت اویس قرنی، ابو ہاشم بن شارک، جابر بن حیان، حسن بصری، مالک دینار، محمد واسع، خواجہ فضیل بن ایاض، ابراہیم بن ادہم وغیرہ (661 سے 850 عیسوی تک) تصوف کے ابتدائی دور کے صوفیائے کرام کہے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان میں صوفیائے کرام کی آمد کا سلسلہ آٹھویں صدی عیسویں میں اس وقت سے شروع ہوتا ہوا نظر آتا ہے جب ہندوستان میں سندھ کے علاقے میں شیخ ابوعلی السندھی تشریف لائے اور لاہور میں شیخ اسماعیل لاہوری تشریف لائے۔ پھر پنجاب کے علاقے میں شیخ علی ہجویری (داتا گنج بخش) تشریف لائے۔ یہ دور ہندوستان میں محمود غزنوی کا دور تھا۔ پھر یہاں صوفیا کے ساتھ ساتھ علما کی بھی آمد کا سلسلہ بڑھتا گیا اور تصوف کی تبلیغ و اشاعت زور پکڑنے لگی۔ تصوف کے فروغ کے لیے کتابیں تحریر کی جانے لگیں۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اجمیر میں تصوف کو منظم طور پر دلائل و براہین کے ساتھ استحکام بخشا اور نہایت کامیابی کے ساتھ تبلیغ و اشاعت جاری رکھا۔ اُنہوں نے سلسلہ چشتیہ کی بنیاد رکھی پھر خانقاہ میں تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا گیا۔ آپ کے کردار، اخلاق، طرز احسان، اسلامی طریق پر عبادت و ریاضت، حسن عمل، انسان دوستی اور تعلیم و تربیت کے علاوہ مساوات جیسے انسانی اور اسلامی خصائل اعلیٰ پر مبنی رشد و ہدایت کی وجہ سے لوگ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔ پھر ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کے ساتھ دیگر سلسلے بھی قائم ہونے لگے اور یہاں قادریہ، سہروردیہ، نقشبندیہ اور شطاریہ وغیرہ سلسلے وجود میں آئے۔ انہی صوفیائے کرام کی طویل فہرست میں شیخ محی الدین ابن عربی (1165-1240) اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (1144-1234) کا ذکر اُن کی مایہ ناز خدمات کی وجہ سے بطور خاص کیا جاتا ہے۔ ابن عربیؒ نے 'فصوص الحکم' اور شیخ شہاب الدین سہروردی نے 'عوارف المعارف' تحریر کی۔ تصوف کی اشاعت میں ان تصنیفات نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے یہاں سہروردیہ سلسلے کی بنیاد ڈالی جسے خلیفہ شیخ بہاء الدین زکریا نے وسعت عطا کی۔ آگے چل کر قاضی حمید الدین ناگوری خلیفہ ہوئے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کے صاحبزادگان میں ایک بزرگ شاہ عبد اللہ شطاری (1572) نے ہندوستان میں 'شطاریہ' سلسلے کی بنیاد رکھی۔ شیخ وجیہ الدین علویؒ اور صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیریؒ نے اس سلسلہ شطاریہ کو یہاں کافی فروغ دیا۔

شیخ محمد غوث گوالیاری کے والد کا نام سید خطیر الدین تھا۔ آپ کے پرداوا معین الدین قتالؒ نے جونپور (اترپردیش) میں سکونت اختیار کی اور یہیں مدفون بھی ہوئے۔ آپ کے والد سید خطیر الدین نے اترپردیش کے ضلع غازیپور کے کھیڑہ میں قیام کیا اور یہیں مدفون ہوئے۔ شیخ محمد غوث گوالیاری کا سلسلۂ نسب خواجہ فرید الدین عطار نیشاپوری (1230) سے ملتا ہے جو آپ کے چھٹے جد ہیں۔ چنانچہ آپ کا شجرۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ الشریف پر اس طرح منتہی ہے:

" شیخ محمد غوث بن سید خطیر الدین ثانی، بن سید عبداللطیف، بن سید معین الدین قتال، بن خطیر الدین آتشی، بن سید بایزید پارسا، بن سید فرید الدین عطار نیشا پوری، بن سید ابو اسماعیل ثانی، بن احمد صادق ثانی، بن سید نجم الدین، بن سید تقی الدین، بن سید نور الدین، بن سید ابا بکر، بن سید عبداللہ، بن سید اسماعیل،

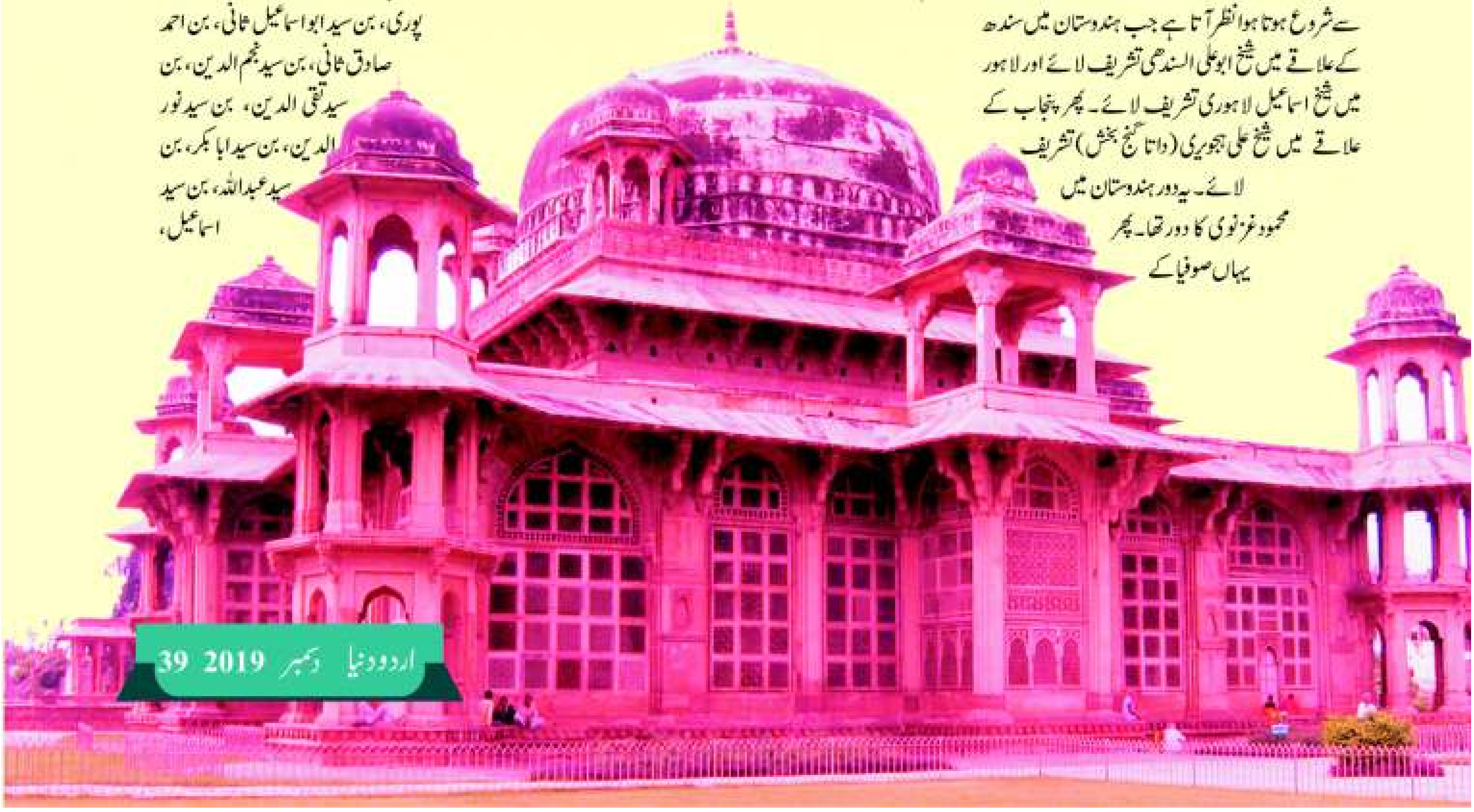

بن امام جعفرصادق بن سید امام باقر، بن امام زین العابدین، بن امام حسین، بن امام علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ بن ابی طالب''

شیخ محمد غوث گوالیاری کی معرکتہ الآرا تصنیف 'اوراد غوثیہ' میں اپنی ولادت اور دیگر حالات زندگی کے متعلق ان کے خود کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی پیدائش 7 رجب المرجب، بروز جمعہ 907ھ کو ہوئی۔ آپ نے محض سات سال کی عمر میں ہی راہ طریقت میں قدم رکھ دیا تھا۔ نو سال کی عمر میں معرفت حاصل ہوئی اور پندرہ سال کی عمر میں رہنمائی شروع کردی۔ تینتیس سال کی عمر میں مرجع خاص و عام بن گئے۔ چالیس سال کی عمر میں حکمران وقت سے اختلاف کی بنیاد پر ہجرت کرکے گجرات چلے گئے۔ اس طرح آپ کی زندگی کا روحانی سفر محض سات سال کی عمر سے ہی شروع ہوگیا تھا۔ غلبۂ شوق کا یہ عالم تھا کہ آپ اکثر و بیشتر اپنے پرداداکے مزار مبارک پر جاتے اور وہیں شب بیداری کرتے۔ ایک بار یہاں دوران قیام اللیل آپ کو بشارت ہوئی اور بشارت کے مطابق انھوں نے صوبہ بہار کا رخ کیا اور شاہ ابوالفتح ہدیۃ اللہ سرمست کی خدمت میں پہنچے۔ یہاں سے فیضیاب ہو کر کوہستان۔ چنار میں عبادت و ریاضت کا سلسلہ جاری رکھا۔ تقریباً بارہ سال کی مشقت کے بعد پھر شاہ ابوالفتح ہدیۃ اللہ سرمست کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کے دست مبارک پر بیعت کی خواہش کا اظہار کیا۔ مگر شاہ صاحب نے بیعت سے انکار کیا اور شیخ محمد غوث گوالیاری کو شیخ حاجی حمیدالدین حصور کی خدمت میں بھیج دیا جو شاہ صاحب کے خلیفہ تھے اور شطاریہ سلسلے سے وابستہ اپنے وقت کے غوث اور بزرگان عصر میں سے تھے۔

ہندوستان میں صوفیائے کرام کے مختلف سلسلوں کے آمد کی طرح سلسلۂ شطاریہ کی بھی آمد ہوئی۔ یہ سلسلہ ایران میں 'عشقیہ' اور روم میں 'بسطامیہ' کہلاتا ہے جس کے پیشوا شیخ ابو یزید طیفور ابن عیسیٰ ابن آدم بسطامی (260ھ) ہیں۔ ہندوستان میں اس عظیم سلسلۂ شطاریہ کے بانی شاہ عبداللہ شطاری (متوفی 980ھ) ہیں جو ایران سے ہندوستان تشریف لائے۔ یہ پانچ واسطوں سے شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد میں تھے اور سات واسطوں میں حضرت بایزید بسطامی سے بیعت تھے۔ یہاں اس سلسلے کو فروغ حاصل ہونے لگا۔ چنانچہ رئیس المورخین اور صاحب اعیان وطن مولانا سید محمد حکیم شعیب رضوی نیر پھلواروی کی تحقیق کے مطابق خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف میں بھی اس سلسلے کی اجازت پہنچی۔ بلکہ طیفوریہ سلسلہ، حضرت تاج العارفین پیر مجیب کو ان کے پیرومرشد خواجہ عماد الدین قلندر کی معرفت پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اس ضمن میں حکیم شعیب رضوی نیر صاحب اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'اعیان وطن' میں فرماتے ہیں:

''یہ سلسلہ تاج العارفین کو اپنے پیرومرشد خواجہ عماد الدین قلندر سے پہنچا ہے، تاج العارفین کو خواجہ عماد الدین قلندر سے، ان کو شیخ عبدالقدوس جونپوری سے، ان کو شیخ عبدالسلام علن جونپوری سے، ان کو شیخ محمد قطب سے، ان کو شیخ قطب الدین بینا دل سے، ان کو نجم الدین غوث الدہر سے، ان کو سید خضر رومی شعلہ قلندر سے، ان کو جمال مجرد ساؤجی سے، ان کو بایزید بسطامی سے، ان کو امام جعفر ثانی سے، ان کو امام موسیٰ کاظم سے، ان کو امام جعفر صادق سے، ان کو امام محمد باقر سے، ان کو امام زین العابدین سے، ان کو امام حسین علیہ السلام سے، ان کو امیر المومنین علی کرم اللہ وجہ الشریف سے، ان کو حضرت رسولؐ سے۔''

حضرت بایزید بسطامی نے سلسلہ طیفوریہ۔ شطاریہ کو ہندوستان میں کافی پھیلایا۔ آپ کا مزار مبارک مانڈو میں ہے۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے خلیفہ شیخ محمد ابوالفتح بموسوم قاضن شطاری ہوئے جنھوں نے صوبہ بہار کے ضلع مظفر پور کو اپنا مرکز بنایا۔ علامہ حکیم شاہ شعیب رضوی نیر پھلواروی کی تحقیق کے مطابق:

''حضرت امام محمد تاج فقیہ کی اولاد امجاد کا دور اولین صوبہ بہار میں انوار سہروردیہ اور قادریہ سے جگمگا رہا ہے اور ہر بزم طریقت میں اس کی روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر اس خاندان کا ایک مقدس فرد جس نے قادریہ سہروردیہ، نقشبندیہ، مداریہ و فردوسیہ کے مجموعہ چراغاں میں چشتیہ کی شمع روشن کرکے بزم طریقت کو اور بھی زیادہ منور اور روشن کردیا۔ وہ حضرت مخدوم اسمٰعیل بن محمد تاج فقیہ کے چشم و چراغ حضرت ابوالفیض محمد علاء، قاضن شطاری ہیں جو بن علاء الدین بن شیخ عالم بن شیخ جمال بن شیخ علی بن، شیخ سلیمان بن شیخ صلاح الدین بن شیخ اسمٰعیل بن امام محمد تاج فقیہ۔ صاحب گلزار نے آپ کو محمد علا بنگالی لکھا ہے۔ محمد علا بنگالی آپ شیخ قاضن شطاری کرکے مشہور ہیں اور حضرت شاہ عبداللہ شطاری کے خلیفہ ہیں۔ ریاضات و مجاہدات اور مراقبہ و مشاہدات میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ انسانی کمالات اور وجدانی حالات آپ میں عیاں تھے۔ علمائے باللہ میں سرگروہ اور سالکان سیر فی اللہ میں آپ سردار تھے۔ نویں صدی کے اولین نصف حصہ میں جب شاہ شطار عبداللہ شطاری ہندوستان میں آئے، تو گذر بنگالہ کی طرف بھی ہوا۔ اور مشائخ بنگالہ کی طرف بھی گئے''

عظیم محقق علامہ حکیم شاہ شعیب رضوی نیر پھلواروی فرماتے ہیں کہ حضرت قاضن کی وفات 24 شوال 901 ہجری میں، سو سال سے کچھ زیادہ ہی عمر پاکر ہوئی اور بہار میں حاجی پور کے بعد دوسرے ریلوے اسٹیشن بھگوان پور سے پچھم جو لعل گنج سنکھا کو ایک سڑک گئی ہے، اسی کے نزدیک ایک بستی بنیا بساڑھ ہے وہیں، ان کا مزار مبارک ہے۔ حضرت قاضن شطاری کی وفات کے بعد اُن کے فرزند اکبر شیخ ابوالفتح ہدیۃ اللہ سرمست نے سلسلۂ شطاریہ کی خوب خوب اشاعت کی۔ حضرت سید ابوالفتح ہدیۃ اللہ سرمست حاجی پور علاقہ ترہت، موضع سکول جو حاجی پور کا ایک گاؤں گنڈک ندی کے کنارے واقع تھا، مدفون ہوئے۔ ان کا انتقال 948ھ میں ہوا۔ اب آپ کے مزار کا پتہ نہیں ہے۔ شیخ حاجی حمیدالدین حصور (متوفی 930ھ)، شیخ ابوالفتح ہدیۃ اللہ سرمست کے خلیفہ تھے جنھوں نے اپنے پیر کے وصال کے بعد اس سلسلے کی اشاعت کی۔ ان کا مزار صوبہ بہار کے ضلع سارن میں واقع ہے۔

حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری نے اپنے تمام بھائیوں یعنی شیخ پھول، شاہ ابوالخیر سرمست، شاہ ابوالفتح، شاہ قطب الدین محمد احمد، سید شاہ، اور شیخ قاضن کے ساتھ شیخ حاجی حمیدالدین حصور کے دست شفقت پر بیعت کی۔ شیخ طریقت نے راہ سلوک کی منازل طے کرائی اور خرقہ خلافت عطا کیا۔

حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ نے بیعت کے بعد اپنے شیخ طریقت سے مستقل سکونت کے سلسلے میں مشورہ کیا۔ شیخ نے اجازت دی'' جہاں مزاج چاہے، رہو، اس میں تم کو اختیار دیا گیا ہے۔'' چنانچہ صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیاری، مدھیہ پردیش کے ضلع گوالیار تشریف لے آئے اور یہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ حالانکہ صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیاری کی مشہور تصنیف 'جواہر خمسہ' میں یہ اشارہ واضح طور پر موجود ہے کہ کوہستان۔ چنار میں عبادت و ریاضت کے دوران ہی انھیں قلعہ گوالیار میں قیام کی بشارت ہوچکی تھی۔ بہرحال اُنھوں نے گوالیار میں سکونت اختیار کی۔ صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیاری نے یہاں بطور خلیفہ، سلسلۂ شطاریہ کی اشاعت کی ذمے داری سنبھالی اور بہت جلد خاص و عام میں مقبول ہونے لگے۔

حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری دوسرے سلسلے جیسے چشتیہ، فردوسیہ، سہروردیہ، قادریہ اور مداریہ کے بھی مجاز تھے۔ اپنے کردار و گفتار، علم و فن اور عبادت و ریاضت کی وجہ سے ہندوستان کے زیادہ تر مقامات جیسے دہلی، راجستھان، گجرات، آگرہ، سرہند، سنبھل اور بہار وغیرہ میں آپ کے خلفا اور مریدین کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ مزید برآں صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیاری کے مرید و خلیفہ شاہ وجیہ الدین علوی اور دیگر مریدین و

معتقدین کی مدد سے یہ سلسلہ شطاریہ، بیرون ممالک جیسے انڈونیشیا، جاوا اور سماٹرا میں بھی مسلسل پھیلتا رہا۔ دریں اثنا، شیخ محمد غوث گوالیاری بیمار ہوگئے اور تقریباً چھ مہینے تک ذی فراش رہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ جب صحت نصیب ہوئی تو قاضی رکن الدین اور قاضی خدا بخش کو اپنے پیر طریقت شاہ حاجی حمید الدین حصورؒ کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا۔ یہ دونوں حضرات جب پیر طریقت کی خدمت میں پہنچے تو اُنھوں نے جبہ و دستار طلب کی اور اسے خود اپنے دست مبارک سے شیخ محمد غوث گوالیاری کے لیے ان دونوں حضرات کو سپرد کیا اور ایک فرمان لکھوا کر دستخط کیا اور اسے بھی اُنھیں سپرد کرکے روانہ کیا۔ دراصل اس مکتوب میں پیر طریقت نے تعلیمات سلوک اور چند نصیحتیں فرمائی تھیں۔ ساتھ ساتھ دارالفنا سے دارالبقا کی جانب اپنی وفات کے سلسلے میں واضح اشارہ بھی کر دیا تھا۔ بہر حال پیر طریقت حاجی حمید الدین حصور کی وفات کے بعد حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری مسند سجادگی پر متمکن ہوئے اور درجہ 'غوثیت' کو پہنچے۔ آپ نے گوالیار ہی سے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا اور یہیں سے ہر خاص و عام کے لیے فیض رساں ثابت ہوئے۔ آپ کی شان غوثیت کا بیان کرتے ہوئے 'مناقب غوثیہ' کے مصنف شیخ فضل اللہ شطاری فرماتے ہیں کہ بہت تشہیر ہونے کی وجہ سے تحفظ کے نقطۂ نظر سے شیخ محمد غوث گوالیاری کے حجرہ کے پاس ایک نگہبان مقرر کیا گیا تھا جس کے پاس تلوار اور نیزہ رہتا تھا۔ ایک دن شیخ محمد غوث گوالیاری کے مرید شیخ احمد دانا نے اس تلوار اور نیزہ کو دریائے گنگا میں پھینک دیا جس پر شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کو بہت غصہ آگیا۔ فوراً ہی شیخ احمد دانا نے عرض کیا:

''اگر حکم ہو تو تمام اشیا لا کر حاضر کر دوں'' ارشاد ہوا: ''ہاں: ابھی لے کر آؤ، اور بہت جلد آؤ''۔ مناقب غوثیہ کا بیان ہے کہ شیخ احمد دانا 'یا غوث' کہتے دریا میں کود گئے اور چند لمحوں میں 'یا غوث' کہتے تمام اشیا بجنسہٖ اپنے ساتھ لے کر باہر آگئے۔ 'غوث وقت' شیخ محمد غوث گوالیاری کے مریدین، معتقدین اور خلفا کی تعداد میں ملک اور بیرون ملک روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ گیارہویں صدی ہجری کی شہرت یافتہ تصنیف 'تکمیل الایمان' اور 'مناقب غوثیہ' میں ان کے مریدین و خلفا کی لمبی فہرست موجود ہے۔ ان خلفا و مریدین میں شیخ وجیہ الدین علوی، شیخ لشکر محمد عارف، شیخ عیسیٰ جند اللہ، شیخ علی شیر بنگالی، شیخ صدر الدین ذاکر، شیخ شمس الدین شیرازی، شیخ وودود اللہ شطاری، شاہ ڈھن، شیخ احمدی اور شیخ عبدالحئی جیوہ وغیرہ کے نام نامی قابل ذکر ہیں۔

حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری نے چار شادیاں کی تھیں جن سے بالترتیب 9 صاحبزادگان اور پانچ صاحبزادیاں تھیں۔ پہلی بیوی سے تین صاحبزادے، شاہ عبداللہ، میر شاہد اور میر ہادی شریف تھے اور دو صاحبزادیاں بی بی زاہدہ اور بی بی مالحہ تھیں۔ دوسری بیوی سے دو صاحبزادے میر علی اور مرزا مبارک تھے۔ اور دو صاحبزادیاں بی بی کریمہ اور اور بی بی رحیمہ تھیں۔ تیسری بیوی سے ایک صاحبزادہ شاہ نور الدین اور ایک صاحبزادی بی بی حفیظہ تھیں۔ چوتھی بیوی سے صرف تین صاحبزادے سید اسماعیل، سید مظفر اور سید اویس تھے۔ آپ کی اولاد میں شیخ عبداللہ، شیخ نور الدین ضیا، شیخ اویس اور شیخ اسماعیل باکمال اولیا گزرے ہیں۔ آپ کے فرزند اکبر شیخ عبداللہ کی ولادت بروز جمعہ ماہ ربیع الاول 938ھ ہوئی۔ شیخ وجیہ الدین علوی اور مولانا مبارک دانشمند گوالیاری سے درس و تدریس حاصل کی۔ والد بزرگوار سے شرف بیعت اور خرقۂ خلافت حاصل کیا اور 970ھ میں والد کے انتقال کے بعد مسند

شیخ محمدغوث گوالیاری صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ آپ کی روز وشب کی سعی خاص کی وجہ سے ایک طرف سلسلہ شطاریہ کو فروغ حاصل ہوا تودوسری جانب آپ کے ملفوظات و مکتوبات اور تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی سعی سے زبان و ادب کی اشاعت میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ معتبر تحقیق کے مطابق آپ کی سات تصانیف کا ذکر ملتا ہے جو اس طرح ہیں: جواہر خمسہ، اوراد غوثیہ، معراج نامہ، ضمائراور بصائر، بحرالحیات، کلید مخازن، اور کنزالوحدہ۔ یہ سبھی تصانیف عربی یا فارسی میں تحریر کی گئی ہیں اور عالم تصوف کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا کی نگاھوں میں بھی قابل قدر ہیں۔

خلافت پر متمکن ہوئے۔ شہنشاہ اکبر نے شیخ محمد غوث گوالیاری کے مقبرے کے تعمیر کی ذمے داری شیخ عبداللہ کو تفویض کی تھی جسے شاہ عبداللہ نے بخوبی انجام دی۔ صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیاری کے مقبرے کا شمار شہنشاہ اکبر کے عہد کی اہم یادگار تعمیرات میں شامل ہے۔ یہ شاہکار مقبرہ ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کا نہایت ہی حسین امتزاج ہے۔ اس مقبرہ کے احاطے میں دربار شہنشاہ اکبر کے 9 رتنوں میں ایک رتن اور مشہور مطرب ہند، تان سین کا مزار بھی ہے جو شیخ محمد غوث گوالیاری کے معتقد و مرید تھے۔ شیخ محمد غوث گوالیاری کے وصال کے بعد آپ کے فرزند شیخ عبداللہ گوالیار میں مسند نشیں ہوئے جہاں شیخ بدیع الزماں سمرقندی اور شیخ مبارک بھی موجود تھے۔ آپ کے دوسرے فرزند شیخ نور الدین ضیاء اللہ اکبر آباد یعنی موجودہ آگرہ میں مسند نشیں ہوئے جہاں شیخ عبداللہ صوفی موجود تھے۔ احمد آباد میں آپ کے دو صاحبزادگان شیخ اویس اور شیخ اسماعیل فیض رساں ہوئے۔ اسی طرح بڑودہ میں شیخ صدر الدین محمد شمس ذاکر اور شیخ حبیب شطاری، سنبھل میں شیخ محمد عاشق، اجمیر میں مولانا عبدالفتاح ناگوری، بیجاپور میں شیخ شمس الدین شیرازی، برہان پور میں شیخ لشکر محمد عارف، شیخ عیسیٰ جند اللہ اور شیخ اکمل الدین برہان اور اجین میں شیخ احمد متوکل اور شیخ عالم سلسلہ شطاریہ کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہوئے۔ شاہ وجیہ الدین کے خلیفہ شیخ صبغت اللہ تو مدینہ منورہ میں مقیم ہوگئے اور انھوں نے یہیں حجاز کے علاقوں میں اس سلسلہ شطاریہ کو وسعت دی۔ اس طرح آپ کے خلفا، مریدین اور وابستگان ہر چہار جانب موجود تھے یہاں تک کہ برصغیر ایشیا کے علاوہ عرب و عجم میں بھی پھیلے۔

شیخ محمد غوث گوالیاری صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ آپ کی روز و شب کی سعی خاص کی وجہ سے ایک طرف سلسلہ شطاریہ کو فروغ حاصل ہوا تو دوسری جانب آپ کے ملفوظات و مکتوبات اور تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی سعی سے زبان و ادب کی اشاعت میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ معتبر تحقیق کے مطابق آپ کی سات تصانیف کا ذکر ملتا ہے جو اس طرح ہیں: جواہر خمسہ، اوراد غوثیہ، معراج نامہ، ضمائر اور بصائر، بحرالحیات، کلید مخازن، اور کنز الوحدہ۔ یہ سبھی تصانیف عربی یا فارسی میں تحریر کی گئی ہیں اور عالم تصوف کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا کی نگاہوں میں بھی قابل قدر ہیں۔ 'جواہر خمسہ' علم تصوف پر فارسی میں لکھی گئی ایک ضخیم کتاب ہے۔ 'اوراد غوثیہ' بھی فارسی میں لکھی گئی ہے جس کے دیباچہ کا بیانیہ 'جواہر خمسہ' کے مشمولات کی جانب راغب کرتا ہے۔ صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیاری نے اس کتاب کے آغاز میں راہ سلوک پر گامزن سالک کے لیے چند اہم وصیتیں تحریر کی ہیں۔ انہی وصیتوں میں ایک وصیت یہ بھی ہے کہ:

''اگر مرشد حاضر نہ باشد مکتوبات شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری مطالعہ کند تا فریب، نفس و وسواس خناس در یابد''

'اوراد غوثیہ' میں سالک کے لیے نو درجات متعین کیے گئے ہیں۔ 'معراج نامہ' آپ کی بڑی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس میں آسمانوں اور سیاروں کی سیر کا ذکر ہے۔ صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کو اس کتاب کی وجہ سے بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کفر کا فتویٰ بھی لگا اور ترک وطن کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ 'ضمائر' اور 'بصائر' ان کے تحریر کردہ رسالوں کا نام

ہے جس میں صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیاری نے علم تصوف کے مختلف موضوعات، راہ سلوک کے مسائل، فنا، بقا اور مقصد حقیقی کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ کا تحریر کردہ رسالہ 'کلید مخازن'، علوم باطن اور واردات قلب جیسے موضوعات پر بہت قیمتی رسالہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس رسالے میں صوفیائے کرام کے مشرب بالخصوص فنا، بقا اور کشف سے متعلق اہم نکات پر بحث کرتے ہوئے چند بامعنی اُصول وضع کیے گئے ہیں۔ صاحب معرفت کے لیے یہ رسالہ علم سفینہ سے زیادہ علم سینہ پر مشتمل ہے۔ 'کنزالوحدۃ' آپ کی وہ تصنیف ہے اور شاید آپ کی آخری تصنیف ہے جس میں انھوں نے شریعت وطریقت اور تصوف کی روشنی میں توحید اور ایمان حقیقی پر عالمانہ بحث کی ہے۔

شیخ محمد غوث گوالیاری کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے شریعت وطریقت کی روشنی میں باطنی علوم یعنی ریاضت، تذکیہ نفس اور تصفیہ قلب وغیرہ پر بہت زور دیا اور اس کے حصول کے لیے ہندو فلسفہ 'یوگ' کی اہمیت پر زور دیا۔ صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیاری عربی فارسی کے ساتھ ساتھ سنسکرت بھی جانتے تھے۔ انھوں نے 'یوگ' پر مستند کتاب 'امرت کنڈ' کا فارسی میں ترجمہ کیا جس میں ہندو سادھو سنتوں اور ان کے اشغال کا بیان ہے۔ اس میں اُن طریقہ ہائے کار پر زور دیا گیا ہے جن کے توسط سے اعصاب پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں مجاہدہ اور ریاضت کے حوالے سے 'یوگ' کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیاریؒ نے 'یوگ' کی تفصیلات پر مبنی اس کتاب کا نام 'بحرالحیات' رکھا۔ آپ کی مشہور تصنیف 'جواہر خمسہ' میں بھی آپ کی اس کتاب 'بحرالحیات' کا تذکرہ بطور خاص موجود ہے۔ اسی طرح سلسلۂ شطاریہ کے بلند پایہ عالم اور صاحب تصنیف بزرگ مولانا محمد غوثیؒ اپنی شہرت یافتہ کتاب 'گلزار ابرار' میں 'بحرالحیات' کا تعارف کراتے ہوئے باطنی اعمال کے واسطے یوگ کی اہمیت پر تبصرہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''جریدہ دستور العمل طائفہ جوگی وسنیاسی کا ترجمہ، اس میں باطنی اعمال، تصوری اشغال، پاس انفاس کا ذکر اور نیز ان امور کے سوا اور بھی اقسام ریاضت بیان کیے گئے ہیں، جن کی بدولت روحی لشکر کو جسمانی سپاہ پر فتح ملتی ہے۔ جوگیوں اور سنیاسیوں کی دو جماعتیں، ہنود کے ریاضت مندوں، گوشہ نشینوں، اور رہبانوں کی سرگروہ ہیں، اور انھیں اشغال واذکار کی برکات سے استدراج اور خرق عادات کے درجہ کو پہنچ کر، سالکوں کے ضمیروں کی چیستاں پر اطلاع حاصل کرتی ہیں، آپ نے ان تمام

معانی کو سنسکرت عبارت سے جو کتب ہنود کی زبان ہے، اخذ کر کے فارسی لباس پہنایا ہے، اس کتاب کے مفہومات سے زنار توڑ کر بجائے اس کے توحید اور اسلام کی تسبیح گردن میں ڈال دی ہے، نیز حقیقی ایمان کی قوت سے ان مفہومات کو تقلید کی قید سے نکال کر صاحب تحقیق صوفیوں کے اذکار واشغال سے تطبیق دی ہے''

چنانچہ میں نے یہاں 'یوگ' سے وابستہ اُن پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جن کا تعلق شیخ محمد غوث گوالیاری کے توسط سے شطاریہ سلسلے کے اس ارتباط سے ہے جسے صوفی یوگ گرو حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری نے 'یوگ' سے اخذ کیا ہے۔ ان کی تصنیف 'بحرالحیات' دس ابواب پر مشتمل ہے جس کے چوتھے باب بعنوان 'در معرفت ریاضت' میں صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیاری نے 'یوگ' کی تفصیلات کو عقلی دلائل کے ساتھ نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ بحرالحیات میں یوگ کے مختلف آسنوں جیسے ذکر ہنس، ذکر الک، ذکر بھکتی، ذکر زنجن، ذکر چکری، ذکر نبولی، ذکر گورکھی، ذکر اکوجن، ذکر انہد سبد، ذکر نصید، ذکر ستیلی، ذکر بھونگم، ذکر بورک، ذکر تراوت اور ذکر کنجری وغیرہ کا تفصیلی بیان تصاویر کے ساتھ موجود ہے۔

شیخ محمد غوث گوالیاری وہ صوفی یوگ گروؒ ہیں جو یوگ سے آدھیاتم کی جانب بڑھے اور فضل ایزدی، رضائے مصطفیٰؐ، حب اہل بیت اور پیران طریقت کے عقیدہ واحترام کی بدولت اپنی عبادت وریاضت، ریاضات ومجاہدات اور اذکار واشغال کی وجہ سے ان باکمال اولیا اور برگذیدہ مشائخ کی فہرست میں شمار کیے جاتے ہیں جو نہ صرف خود سالک بنے بلکہ سیکڑوں طالبین حق کو بھی سالکین بنادیا۔

گر قدمت شد بہ یقین استوار
گرد و ز دریا، نم از آتش برآر

صوفی یوگ گرو شیخ محمد غوث گوالیاری 929ھ میں گوالیار تشریف لائے مگر 947ھ میں نامساعد صورت حال کی وجہ سے ہجرت کی اور گجرات تشریف لے گئے۔ آپ نے دیگر صعوبتوں کے ساتھ ساتھ سفر کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ یہاں شیخ وجیہ الدین علوی آپ کے معتقد تھے۔ انھوں نے آپ سے شرف بیعت حاصل کی اور آپ کے ساتھ ہی رہے۔ آپ نے احمد آباد میں مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی۔ حلقہ ارادت تو یہاں بھی وسیع ہوتا گیا مگر حالات یہاں بھی سازگار نہیں تھے۔ چنانچہ گجرات اور گردونواح میں تقریباً انیس سال قیام کے بعد 966ھ میں اکبرآباد (آگرہ) تشریف لے گئے۔ مگر افسوس کہ یہاں بیرم خان کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے پھر گوالیار واپس آنا پڑا۔ بیرم خان کی موت کے بعد دوبارہ آگرہ تشریف لائے اور یہیں 63 سال کی عمر میں 14 رمضان المبارک 970ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ مگر تدفین گوالیار ہی میں عمل میں آئی۔ افسوس! صد افسوس! معرفت کا سورج غروب ہوگیا۔ صوفی یوگ گرو حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کی وفات پر 'مخبرالواصلین' میں کہی گئی قطعہ تاریخ اس طرح درج ہے:

آں شیخ محمد المخاطب — بالغوث بہ لطف معبود
تاریخ وصال او ملائک — گفتند کہ شیخ اولیا بود

مراجع ومصادر:

(1) حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری (حالات وآثار): پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد
(2) مکتوبات صدی: مرتبہ: پروفیسر ڈاکٹر سید شاہ محمد نعیم ندوی
(3) النسبۃ الاویسیہ: مولانا شاہ قمرالدین قادری پھلواروی
(4) اعیان وطن: حکیم مولانا شاہ شعیب رضوی نیر پھلواروی
(5) تجلیات انوار: ذکر شیوخ بہار: حکیم مولانا شاہ شعیب رضوی نیر پھلواروی
(6) جواہر خمسہ: شیخ محمد غوث گوالیری
(7) اوراد غوثیہ: شیخ محمد غوث گوالیری
(8) بحرالحیات: شیخ محمد غوث گوالیری
(9) تصوف اور صوفیا کی تاریخ (عرب سے ہندوستان تک): ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن
(10) سیرت پیر مجیب: مولانا شاہ ہلال احمد قادری

■

S M N Rizvi
Deputy Director
ROB, Govt. of India
Ranchi - 834002
Mob.:08987582814

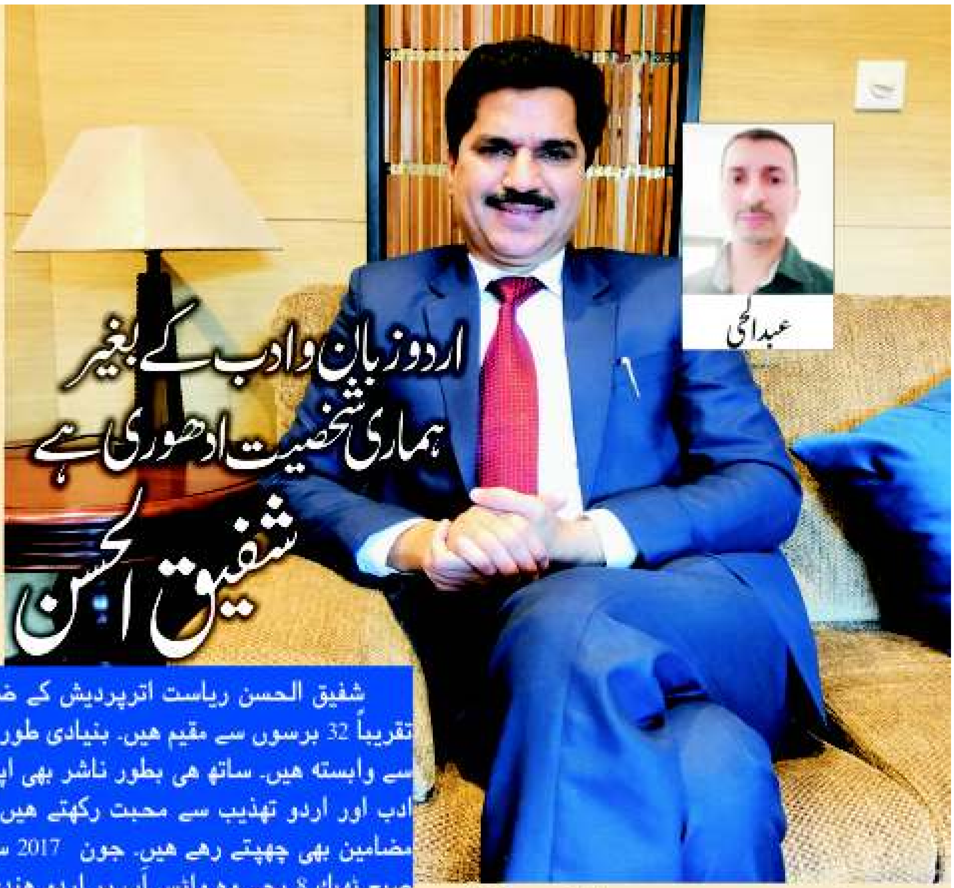

عبدالحی

اردو زبان وادب کے بغیر ہماری شخصیت ادھوری ہے

شفیق الحسن

شفیق الحسن ریاست اترپردیش کے ضلع ایٹہ سے تعلق رکھتے ہیں اور دہلی میں تقریباً 32 برسوں سے مقیم ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ایڈورٹائزنگ اور مارکیٹنگ کے بزنس سے وابستہ ہیں۔ ساتھ ہی بطور ناشر بھی اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اردو زبان و ادب اور اردو تہذیب سے محبت رکھتے ہیں اور مختلف اخباروں و رسائل میں ان کے مضامین بھی چھپتے رہے ہیں۔ جون 2017 سے انہوں نے ایک منفرد کام کا آغاز کیا۔ روز صبح ٹھیک 8 بجے وہ واٹس آپ پر اردو ہندی اور انگریزی اخبارات کی خبریں ہزاروں لوگو ں کو بھیجتے ہیں جو مختلف گروپ میں شیئر ہوتے ہوئے لاکھوں افراد تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ اس لیے بھی قابل ذکر ہے کہ اس کام سے انہوں نے آج تک ایک دن بھی چھٹی نہیں لی۔ ان کا یہ خوش جذبہ دیکھ کر لگتا ہے کہ اردو کو بھی آج ایسے ہی جیالوں کی ضرورت ہے۔ ان کے تجربات پر مبنی یہ انٹرویو اردو دنیا کے قارئین کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحی: سب سے پہلے آپ اپنے کوائف پر روشنی ڈالیں اور اپنی تعلیم وتربیت اور پرورش کے بارے میں بتائیں۔

شفیق الحسن: میری پیدائش مغربی یو پی کے چھوٹے سے قصبہ گنج ڈنڈوارہ میں ہوئی، جو پہلے ایٹہ ضلع کا حصہ تھا اور اب کاسگنج میں آتا ہے۔ یکم ستمبر 1971 کو ایک متوسط گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور ابتدائی تعلیم کے لیے مقامی اسکول میں داخلہ لیا۔ پرائمری اور پھر ہائی اسکول تک کی تعلیم وہیں حاصل کی۔ گھر کے معاشی حالات کچھ بہتر نہیں تھے، والد صاحب کو کافی مشکلات کا سامنا تھا، اس لیے گیارہویں کی تعلیم درمیان میں ہی چھوڑ کر دہلی کا رخ کیا، تاکہ والد صاحب اور اہل خانہ کی پریشانیوں کا کچھ تدارک ہو سکے۔ مجھے شروع سے ہی اخبارات میں لکھنے کا شوق رہا ہے۔ مقامی مسائل سے لے کر عالمی سطح تک کے مسائل پر چھوٹے بڑے مضامین لکھے، جو مختلف اخبارات میں شائع ہوئے۔ اس طرح شوق تو پورا ہوتا رہا، لیکن اس سے مالی مشکلات دور کرنے میں کوئی مدد نہیں ہو رہی تھی۔ والد صاحب پر قرض کا بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا اسی دوران ایک دن میرے رشتے کے چچا نے طنزیہ انداز میں کہا کہ اخبارات میں تو خوب چھپ رہے ہو، لیکن والد کے سر پر مالی مشکلات کا جو ہمالیہ پہاڑ ہے اُسے کیسے اٹھاؤ گے۔ یہ بات میرے دل میں گھر کر گئی۔ اس کے بعد میں نے تہیہ کر لیا کہ یہ بوجھ مجھے ہی اٹھانا ہے۔ اسی عزم کے ساتھ 13 اپریل 1986 کو گھر سے محض 50 روپے کا انتظام کر کے دہلی کے لیے نکل پڑا۔ سفر میں 35 روپے خرچ ہو گئے۔ 15 جو باقی بچے تھے، ان میں سے بھی 10 روپے ڈی ٹی سی کی بس میں چوری ہو گئے۔ اس طرح میرے پاس صرف پانچ روپے باقی تھے۔ بہر حال دہلی آنے کے بعد کچھ دن قرول باغ میں پہلے ایک ایکسپورٹ ہاؤس میں کام کیا، پھر تین ماہ نبی کریم کے ایک پبلشنگ ہاؤس میں کام کیا۔ لیکن کام کرتے ہوئے سوچتا تھا کہ میری منزل تو کچھ اور ہی ہے۔ اگست 1986 میں ہفت روزہ اخبار نو سے وابستہ ہو گیا۔ ایک سال تک وہاں میں نے صحافتی خدمات انجام دیں۔ اسی دوران میں نے ممبئی کے مشہور اسمگلر حاجی مستان سے ایک انٹرویو کیا، جو اخبار نو کے صفحہ اول پر شائع ہوا۔ ایک سال کے صحافتی سفر کے دوران ہی مجھے احساس ہوا کہ صرف اخبار میں میرا نام یا تصاویر شائع ہو جانے سے میرے مسائل حل ہونے والے نہیں ہیں اور جس مقصد سے میں دہلی آیا ہوں وہ مقصد پورا نہیں ہوگا۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ آمدنی کا سلسلہ شروع ہو جائے اور اخبارات سے دور بھی نہ جاؤں۔ اور اسی فکر کے ساتھ اخبار نو چھوڑ کر آخرکار یکم ستمبر 1987 کو اپنی ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی اسکائی ایڈ قائم کر لی۔ 15 اگست 1998 کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گیا۔ ہمارے دو بچے ہیں جو ابھی زیر تعلیم ہیں۔

ع ح: آپ اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی چلاتے ہیں اور طویل عرصہ سے اس میدان میں کام کر رہے ہیں۔ اچانک آپ کو یہ وہاٹس ایپ سے خبریں اسکین کر کے لوگوں تک پہنچانے کا خیال کیوں آیا؟

ش ح: اخبارات سے وابستگی، کچھ نہ کچھ لکھتے رہنے کا شوق اور ملک وقوم کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ ہمیشہ سے رہا۔ فیس بک اور ٹویٹر پر اکثر کچھ اخباروں کے تراشے شیئر کرتا رہتا تھا۔ لیکن وہاٹس ایپ آنے کے بعد میرا یہ کام مزید آسان ہو گیا۔ اب میں زیادہ لوگوں کے ساتھ اہم خبروں کے تراشے شیئر کرنے لگا۔ کبھی کبھی اور کسی کسی کو خصوصی خبریں بھیجنے کا یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ 24 جون 2017 کو انڈین ایکسپریس میں شائع حافظ جنید کی ماب لنچنگ کی خبر نے مجھے اندر تک جھنجھوڑ دیا۔ اس نیوز کلپ کو میں نے وہاٹس ایپ کے ذریعے 100 سے زیادہ لوگوں کے ساتھ شیئر کیا۔ اور دن بھر ملک کے موجودہ حالات کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہاٹس ایپ پر افواہوں اور فیک نیوز کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے یہ خیال آیا کہ سوشل میڈیا کی اتنی بڑی دنیا میں میری حیثیت ہی کیا ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحہ خیال آیا کہ اس بڑی دنیا میں ایک چھوٹی سی دنیا ہے جو میرے دوستوں اور میرے اپنوں کی دنیا ہے۔ میں یہاں سے شروعات کر سکتا ہوں اور اس میں مجھے پیسوں یا کسی کی مدد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں یہ کام تنہا کر سکتا تھا۔ لہٰذا یہ سلسلہ چند لوگوں سے شروع ہوا جو اب ہزاروں، لاکھوں لوگوں تک پہنچ چکا ہے۔ صبح ٹھیک آٹھ بجتے ہی میری پہلی براڈ کاسٹ لسٹ میں شامل سبھی لوگوں تک چندہ اور خصوصی خبروں کے تراشے پہنچ جاتے ہیں۔ اس میں ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر نہیں ہوتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ 840 دن سے زائد عرصہ گزر جانے کے

بعد بھی آج تک یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے اور نہ ہی ایک دن کا ناغہ ہوا ہے۔ کوئی تہوار ہو، کوئی تقریب ہو، کوئی امرجنسی ہو یا کیسے بھی مشکل حالات ہوں، میں ملکی و غیر ملکی سفر پر رہوں، خبریں بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ میرے پاس کبھی کوئی بہانہ نہیں ہوتا۔

ع ح: اس کام کو آپ دو سال سے زائد عرصہ سے انجام دے رہے ہیں۔ جون 2017 میں آپ نے یہ حیرت انگیز کام شروع کیا تھا۔ آپ کے اس کام کو کیسا رسپانس ملا؟

ش ح: میرے اس کام پر لوگوں کا رسپانس بہت خوش آئند رہا۔ رسپانس اتنا اور ایسا کہ سوچا بھی نہیں تھا کہ اس پر ایک پوری کتاب تیار ہو جائے گی۔ میں نے معتبر اور بڑے صحافیوں کے درمیان صحافت کی صداقت کو معتبر بنانے کی ادنیٰ سی کوشش کی، جسے مختلف شعبوں سے وابستہ ملک و قوم کی اہم شخصیات نے سراہا۔ دراصل آج کے دور کشاکش میں جب لوگ بے بنیاد اور غیر ضروری خبروں کا شکار ہیں، معاشرے میں بے راہ روی ہے، جس کے سبب تعلیم یافتہ اور دانشور طبقے میں بیزاری کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسے عالم بیزاری میں لوگوں کو ایسی خبریں پہنچانے کا عزم کیا، جو واقعی سماج پر اثر انداز ہوتی ہیں تو لوگوں نے ویسے ہی تاثرات اور اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ ملت کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دانشور طبقے نے مثبت اور حوصلہ افزا پیغامات مجھے بھیجے، جس سے ہمت بڑھتی گئی۔

ع ح: اکیلے تن تنہا بغیر کسی فائدے کے آج کوئی بھی کام کرنا بے وقوفی ہی کہا جائے گا؟ آپ نے ایک دن کی بھی چھٹی لیے بغیر یہ کام کیا۔ اس دوران آپ یوروپ کی سیر پر بھی گئے، لیکن خبروں کی ترسیل نہیں روکی۔ آج کے مادی دور میں یہ جذبہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ کیا کہیں گے آپ؟

ش ح: دیکھیے پیسے کے لیے تو سبھی کام کرتے ہیں، لیکن بے لوث کام کرنے کا جو مزہ ہے اور اس میں جو دلی اور ذہنی تسکین ہوتی ہے وہ پیسے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ دنیا بھر میں مثالیں موجود ہیں کہ کوئی بھی پیسے سے بڑا نہیں بنتا، بلکہ اپنے جذبہ خدمت سے ہی بڑا بنتا ہے۔ جیسے مدر ٹیریسا کو عالمی شناخت دلانے میں پیسہ نہیں، بلکہ ان کی خدمات کا اہم کردار رہا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے عبد الستار ایدھی نے غریب اور ضرورتمندوں کے لیے ایمبولنس کی شکل میں جو بے مثال کارنامہ انجام دیا وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ لہٰذا اگر آپ خدمت کے جذبے سے کام کر رہے ہیں تو لوگ خود آگے بڑھ کر آپ کو سراہتے ہیں اور ان کی یہی ستائش آپ کو بڑا بناتی ہے۔ جہاں تک تن تنہا اس کام کو انجام دینے کا سوال ہے تو مجھے میرا عزم، میرا موبائل اور اخبارات ہی کافی تھے۔

اگست 2018 میں شادی کی بیسویں سالگرہ کے موقع پر ہمارا یوروپ دورے کا پلان تھا۔ یوروپ جانے سے پہلے کئی دوستوں نے مشورہ دیا کہ شفیق آپ بہت تھک گئے ہیں، دو ہفتے کا بریک لے کر خبروں سے بے فکر ہو کر یوروپ جائیں اور اپنی سالگرہ منائیں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے بریک لیا تو اس سروس کا تسلسل ختم ہو جائے گا اور اس کی شدت میں کمی آجائے گی۔ اور انڈیا واپس آکر میرے لیے اسے دوبارہ بحال کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اسی خیال کے ساتھ پورے 16 دن یوروپ کے ہر ملک سے میں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔

ع ح: اس کام میں آپ کی اہلیہ کا تعاون بھی قابل ستائش رہا ہے۔ کبھی انھوں نے اس کام کے لیے آپ کو منع نہیں کیا؟

ش ح: اگر میں کہوں کہ اس کام میں میری اہلیہ کا سب سے بڑا رول رہا ہے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ یوروپ دورے کے دوران بھی لندن سے روم تک اگر میں یہ کام کر پایا تو یہ سب انھی کے بھرپور تعاون سے ہو پایا ہے۔ یوروپ اور ہندوستان کے اوقات میں مطابقت بٹھانے کے لیے کبھی رات کو دو بجے میں خبروں کے تراشے کا کام کرتا تو کبھی تین یا چار بجے۔ ظاہر ہے ایسے اوقات میں آپ اپنی ذاتی زندگی قربان کرتے ہیں، اپنی نیند کو قربان کرتے ہیں۔ یہ جنون تھا کہ کوئی رکاوٹ میرے کام میں حائل نہیں ہو سکی۔ نہ ہی میری اہلیہ نے کبھی مجھے اس کام کو کرنے سے منع کیا۔ ہاں، صحت کے سلسلے میں جب کچھ دقتیں پیش آئیں تو ضرور انھوں نے کہا کہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور کام کے بوجھ کو کم کریں۔

ع ح: آپ کے اس کام کو اردو دنیا میں اب سراہا جانے لگا ہے اور حال ہی میں انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر نے آپ کے اعزاز میں ایک پروقار تقریب کا انعقاد کیا۔ اب آپ کے جنون کا سلسلہ مزید دراز ہو رہا ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟

ش ح: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر، اس کے صدر جناب سراج الدین قریشی اور سینٹر کے سبھی عہدیداران کا بہت شکریہ کہ انھوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میرے اعزاز میں ایک پروقار تقریب منعقد کی۔ اس تقریب میں سینٹر کے تو سبھی لوگ تھے، اس کے علاوہ بڑی تعداد میں اہل علم حضرات اور زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ میرے خیر خواہ حضرات بھی موجود تھے، جو میرے لیے باعث افتخار بھی ہے اور میری حوصلہ افزائی کا سبب بھی ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ اسلامک سینٹر نے اس بڑے پیمانے پر میرے کام کو سراہا۔ شاید یہ پہلا موقع ہے جب انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر نے کسی کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں اعزازی تقریب کا اہتمام کیا۔ اسلامک سینٹر اور اس کے عہدیداران نے اتنا پیار اور عزت دی، اس کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب آپ کے کام کو اتنے بڑے پیمانے پر سراہا جائے تو جنون مزید بڑھ جاتا ہے۔ کام کرنے کا حوصلہ بھی بلند ہو جاتا ہے۔

ع ح: خبروں کے انتخاب میں آپ کن باتوں کا خیال رکھتے ہیں؟

ش ح: میں انگریزی، اردو اور ہندی کے معروف اخبارات سے ان خبروں کا انتخاب کرتا ہوں، جن کی تلاش سماج کے ذمے دار اور حساس لوگوں کو رہتی ہے۔ یعنی کہیں نہ کہیں یہ

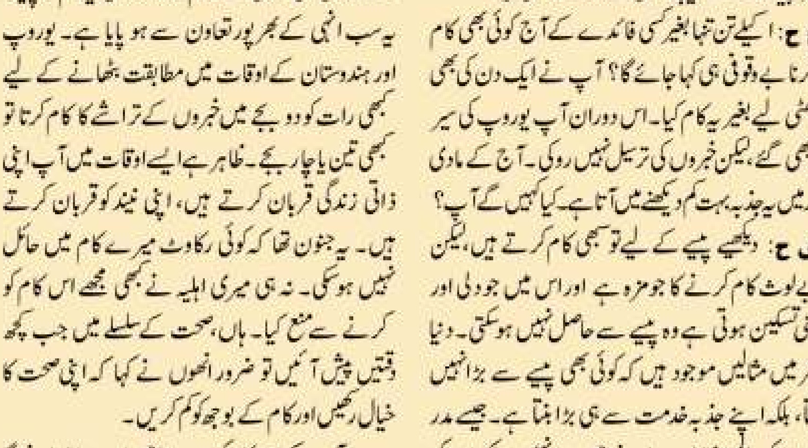

مختصر تعارف

پیدائش: یکم ستمبر 1971، گنج ڈنڈوارہ ضلع ایٹہ، اتر پردیش
والدین: ظہور حسین، زاہدہ بیگم
تعلیم: ایم اے (پولیٹیکل سائنس)، پی جی ڈپلومہ ان مارکیٹنگ
شادی: 15 اگست 1998
اہلیہ: حنا شفیق
بچے: الیزہ، مصطفیٰ
پیشہ: ایڈورٹائزنگ، مارکیٹنگ، طباعت و اشاعت

عملی زندگی کے سنگ میل

دہلی آمد: 13 اپریل 1986
'اخبار نو' سے وابستگی: اگست 1986
'نئی دنیا' سے وابستگی ستمبر 1987
اسکائی ایڈورٹائزنگ اینڈ مارکیٹنگ کا قیام: یکم ستمبر 1987
طباعت و اشاعت کتب کے کاروبار میں آمد: 1991
'روزنامہ عوام' کے طابع و ناشر کی ذمہ داری: 1995 سے 2010
موجودہ ذمہ داریاں: منیجنگ ڈائریکٹر، اسکائی ایڈورٹائزنگ اینڈ مارکیٹنگ، اسکائی لائن پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی

خبریں ہمارے معاشرے کو متاثر کرتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ کچھ ایسی خبریں جن میں انسانیت کا پہلو ہو اور لوگ اس پر بحث و مباحثہ کریں اور سماج میں ایک مثبت رائے قائم ہو۔ اس کے علاوہ ایسی خبریں جو لمبے عرصہ تک عوام پر اثر انداز ہوں۔ مثال کے طور پر کٹھوعہ واقعہ کی انسانیت سوز خبر جس نے تقریباً ہر حساس شہری کو جھنجھوڑ دیا تھا، اس خبر کو اول روز سے ابھی تک میں نے اس سے متعلق ہر اسٹوری کو فالو کیا اور اس کے بارے میں جو سچائیاں اور ہمارے معاشرے کا ایک مکروہ چہرہ سامنے آیا، وہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اسی طرح کیرلہ کے شفین اور ہادیہ کے مبینہ لو جہاد کا معاملہ تھا۔ جس پر شروع سے ان دونوں کی شادی اور پھر ڈاکٹر ہادیہ بن جانے تک کی ہر خبر کو فالو کیا۔ حال ہی میں 'دی ہندو' نے ایک خبر شائع کی جس میں بتایا گیا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی میں اردو کو غیر ملکی زبانوں کی فہرست میں ڈالنے کی تیاری ہے۔ میں نے جب اس خبر کو سب سے پہلے شیئر کیا تو پھر اردو اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی اور اس پر قومی سطح پر بحث ہوئی۔ آخر کار اس تجویز کو واپس لے لیا گیا۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ جو خبریں ملک کے مفاد میں ہوں، سماج میں بہتر پیغام دیتی ہوں، اقلیتوں کے مسائل سے متعلق ہوں، وہ خبریں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچنی چاہیے۔ مجھے اس وقت اور زیادہ خوشی ہوتی ہے جب میری شیئر کی ہوئیں خبروں پر مختلف پلیٹ فارم پر بحث ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اخبارات میں ان پر اداریے اور مضامین بھی لکھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کئی اردو چینل ان خبروں کو فالو کرتے ہیں۔ حال ہی میں ایک روز میرے پاس کیرلہ کے گورنر عارف محمد خاں صاحب کا فون آیا۔ ان کو 2 اکتوبر کو شیئر کی ہوئی گاندھی جی سے متعلق کسی اسٹوری کی ضرورت تھی۔ جو میں نے انھیں فوراً مہیا کرادی۔

ع ح: اردو کے ساتھ ہندی اور انگریزی اخبارات کی خبریں بھی آپ بھیجتے ہیں؟ کیا آپ کی فہرست میں غیر اردو داں افراد بھی ہیں؟ کچھ ان افراد کے بارے میں بتائیں اور آپ کے تئیں ان کے خیالات سے بھی ہمیں واقف کرائیں؟

ش ح: سب سے پہلے میں آپ کو بتاؤں کہ میری فہرست میں سیکولر ذہنیت اور گنگا جمنی تہذیب میں یقین رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔ ان میں خاص طور پر مشہور فلم ساز اور ہدایت کار مہیش بھٹ، دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر اپوروانند، فلم ساز اجے کنچن، سینئر صحافی اور کالم نگار شیش نارائن سنگھ، NDTV کے سوربھ شکلا، اردو کی دلدادہ کامنا پرساد، کویت کے بڑے صنعت کار ایس کے بدھاون وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کے نظریات اور خیالات ملک کی مشترکہ تہذیب کو فروغ دینے والے ہیں۔ ساتھ ہی یہ لوگ میرے کام کو بھی سراہتے ہیں۔ وقفے وقفے سے میرے بارے میں اپنے تاثرات اور مثبت ردعمل پیغامات کی شکل میں مجھے بھیجتے رہتے ہیں۔

ع ح: اردو کا مستقبل روشن ہے۔ آپ اس خیال سے کس حد تک متفق ہیں؟

ش ح: اردو کے تعلق سے ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اردو کے فروغ کے لیے ہمیں کوششیں کرتے رہنا چاہیے۔ جس طرح میں اردو اخبارات کی خبریں لوگوں کو بھیجتا ہوں تو ان کا کہنا ہوتا ہے کہ آپ کی بھیجی ہوئی خبروں کو پڑھنے سے ہماری اردو بہتر ہوگئی ہے۔ دراصل ان لوگوں کی مادری زبان تو اردو ہے، لیکن اردو کا استعمال نہیں کے برابر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب انھیں اردو اخبارات کی کلپ ملتی ہیں تو ان کے بچے بھی شوق سے اردو پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس بڑی تعداد میں اردو

اخبارات شائع ہو رہے ہیں، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی اردو پڑھنے والے لوگ موجود ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور اردو اکیڈمی وغیرہ کی سرگرمیوں سے بھی بخوبی احساس ہوتا ہے کہ اردو کے مستقبل کو لے کر ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ع ح: کیا صرف اردو مسلمانوں کی زبان ہے؟

ش ح: یہ بہت ہی افسوسناک پہلو ہے کہ اردو کو ایک مخصوص فرقے سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ کہنا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے، اردو کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ دراصل اردو اسی ہندوستان میں پلی بڑھی اور یہیں پرورش پائی اور ہر خاص و عام ہندوستانی اسے استعمال کرتا تھا، اس لیے اسے صرف مسلمانوں سے جوڑ کر دیکھنا اس زبان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اگر اردو مسلمانوں کی زبان ہوتی تو منشی پریم چند، پنڈت رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، برج نارائن چکبست اور راجندر سنگھ بیدی جیسے ادیب و دانشور اردو کے نصاب میں شامل نہیں ہوتے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ایک زبان ہی نہیں، ایک مکمل تہذیب ہے جو کشمیر سے کنیا کماری تک اور آسام سے گجرات تک ملک کے ہر حصے میں پائی جاتی ہے۔ یہی نہیں آج اردو کی مقبولیت سات سمندر پار بھی ہے۔

ع ح: اردو کے فروغ میں کیا کیا اقدامات کیے جانے چاہیے جو موجودہ دور میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

ش ح: سب سے پہلے تو ہمیں اسکولوں میں کم از کم پرائمری سطح تک ہر بچے کو ابتدائی اردو پڑھانے کا انتظام کرنا چاہیے۔ اردو کو صرف ذریعہ معاش کے لیے نہیں، بلکہ بحیثیت ایک زبان اور ایک تہذیب کے اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں اپنے گھروں میں اردو کا ماحول پیدا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے اردو کے اخبارات اور اردو رسائل کو گھروں میں منگوانا چاہیے۔ اخبارات اور رسائل میں ایسا مواد شامل ہوتا ہے جو گھر کی خواتین، بزرگوں اور بچوں کے لیے خاص طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جب ہم خود اردو اخبارات اور رسائل کو پڑھنا عام کریں گے تو بچے بھی اس جانب متوجہ ہوں گے۔ اس کے علاوہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ملک بھر میں مراکز قائم ہیں، ان کو بھی مزید فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اردو اکیڈمیوں کو مزید فعال بنایا جا سکتا ہے۔ ہر شہر اور قصبہ میں لوگ لائبریریاں قائم کریں، جن میں اردو کے اخبارات اور رسائل کو زیادہ ترجیح دی جائے۔

ع ح: اردو دنیا کے قارئین کے لیے آپ کیا پیغام دیں گے؟

ش ح: پہلے تو اردو دنیا کے قارئین کو مبارکباد کہ وہ اتنے معیاری اور اردو کے ایک مکمل رسالہ کے قاری ہیں۔ اس کے بعد میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے گھروں میں اور اپنے آس پاس اردو زبان کے استعمال پر زور دیں۔ خاص طور پر اپنے بچوں اور گھر کی خواتین کو اردو لکھنے اور پڑھنے کے لیے راغب کریں۔ انھیں سمجھائیں کہ اردو کو محض روزی روٹی حاصل کرنے کے نظریہ سے نہ دیکھیں، بلکہ ایک خوبصورت اور محبت کی زبان کی طرح پڑھیں اور اسے اپنائیں۔ اردو زبان و ادب کے بغیر ہمارا انداز گفتگو اور ہماری شخصیت ادھوری ہے۔ اردو کے بغیر ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھنا اور احساسات تک پہنچنا مشکل ہے۔

■

Abdul Hai
ahaijnu@gmail.com

محمد نافع عارفی

بیسویں صدی میں عربی صحافت

صحافت کے لغوی معنی کتاب یا رسالہ ہے۔ علامہ ابن منظور تحریر کرتے ہیں:

''صحف صحیفہ کی جمع ہے، یعنی وہ صفحہ جس پر قرآن کریم لکھا گیا ہو، اللہ کا ارشاد ہے، یقیناً یہ پہلی کتابوں میں ہے موسیٰ اور ابراہیمؑ کی کتابوں میں ہے۔ (سورۃ الاعلیٰ: 18-19) یعنی وہ کتابیں جو حضرت موسیٰ، ابراہیم اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں۔''

(لسان العرب، ج9، ص187، ابوالفضل جمال الدین ابن منظور)

جبکہ علامہ جاراللہ زمخشری صحافت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''صحیفہ، صحف اور صحائف چمڑے یا کاغذ کے ٹکڑے پر لکھی ہوئی تحریر ہے۔''

(اساس البلاغۃ، ج2، ص6، علامہ محمود عمر جاراللہ زمخشری)

گویا صحافت نام ہے تحریر یا اشیائے کتابت کا۔ پرانے زمانہ میں عرب اس لفظ کو خبر، اعلان اور معلومات کے معنی میں استعمال کیا کرتے تھے۔ اللہ پاک نے قرآن کریم میں بھی لفظ صحافت کا استعمال ان معنوں میں فرمایا ہے۔ جیسا کہ سورہ اعلیٰ کی آیت نمبر 19-18 میں ارشاد ہے کہ یہ چیزیں پہلے صحیفوں میں ہیں، ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں۔ گویا لغت میں صحافت نام ہے ان تمام خبروں کا جس کا کسی بھی طرح کا تعلق حیات انسانی سے ہو۔ اسی لیے عرب اس معاہدہ نامہ کو جس میں رسول اللہؐ کے سماجی بائیکاٹ کا اعلان تھا اور کعبہ پر لٹکایا گیا تھا صحیفہ کہتے تھے۔

صحافت کی اصطلاحی تعریف:

صحافت کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود عزمی رقم طراز ہیں:

''صحافت ایک اجتماعی ذمہ داری ہے اور اس کا مقصد معلومات، روشن اور پختہ افکار و خیالات کی اشاعت کے ذریعہ عوامی رائے عامہ ہموار کرنا ہے۔''

(الصحافۃ العربیۃ نشأتہا و تطورہا، ص17، الاستاذ ادیب مروہ)

جبکہ عبدالسلام خورشید تحریر کرتے ہیں:

''صحافت کا لفظ 'صحیفہ' سے نکلا ہے، صحیفہ کے لغوی معنی ہیں کتاب یا رسالہ۔ بہر حال عملاً ایک عرصہ دراز سے صحیفہ سے مراد ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقفوں کے بعد شائع ہوتا ہے، چنانچہ تمام اخبارات و رسائل صحیفے ہیں اور جو لوگ ان کی ترتیب و تحسین اور تحریر سے وابستہ ہیں، انھیں صحافی کہا جاتا ہے اور ان کے پیشے کو صحافت کا نام دیا گیا۔ صحافت کا مترادف انگریزی لفظ جرنلزم (Journalism) ہے، جو 'جرنل' سے بنایا گیا ہے، جرنل کے لغوی معنی ہیں 'روزانہ حساب کا بہی کھاتا' روزنامچہ۔ جب صحافت کا آغاز ہوا تو اسی اصطلاح کو مؤقت الشیوع اخبار یا رسالے کے لیے استعمال میں لایا جانے لگا، جرنل کو ترتیب دینے والوں کے لیے ''جرنلسٹ'' کا لفظ بنا اور اس پیشے کو جرنلزم کا نام دیا گیا۔'' (فن صحافت، ص13، عبدالسلام خورشید)

صحافت کی تعریف مختلف مفکرین نے اپنی اپنی فکر اور اپنے اپنے نظریے کے اعتبار سے کی ہے۔ آج صحافت کا لفظ ان تمام وسائل کے لیے بولا جاتا ہے؛ جس کے ذریعہ خبریں حاصل کی جاتی ہوں، خواہ اس کا تعلق اخبار و رسائل سے ہو یا ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے۔ تاہم صحافت کی صحیح تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ صحافت ایسی تحریر کا نام ہے؛ جس کے آئینے میں سماج اور دنیا اپنی صحیح صورت اور شکل دیکھ سکے، اور اس کی روشنی میں اپنے مستقبل کی تعمیر کا صحیح لائحہ عمل تیار کر سکے۔

صحافت کی ابتدا:

اللہ پاک نے انسان کی فطرت میں جستجو اور کھوج کی صفت ودیعت کر دی ہے۔ انسان فطری طور پر اپنے ارد گرد اور دور دراز کی خبریں جاننے کا متمنی ہوتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ موجودہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے اس کی اطلاع اسے ملتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ترین زمانوں میں بھی خبر رسانی اور ابلاغ کا تصور پایا جاتا ہے۔ فرعون سے ہزار سال پہلے بھی ملکی خبریں عبادت گاہوں کے دروازے پر منقش انداز میں لگائی جاتی تھیں۔ اس دور میں عبادت گاہوں کی دیواریں ہی اخبارات کے صفحات ہوا کرتے تھے اور اسی کے توسط سے لوگوں کو ملکی خبروں سے آگاہی حاصل ہوتی تھی۔ اسی طرح چار ہزار سال ق م کی مصر میں ایسی چیزیں ملتی ہیں جسے کسی درجے میں صحافت کا نام دیا جا سکتا ہے۔

(الصحافۃ العربیۃ نشأتہا و تطورہا، ص53)

قدیم ہندوستان میں بھی صحافت کا تصور کسی نہ کسی درجے میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ مشہور بادشاہ منو مہاراج کے دور میں اس سلسلے کی کئی چیزیں ملتی ہیں۔ جبکہ چندر گپت کے عہد حکومت میں تو اس فن نے بہت حد تک ترقی کر لی تھی۔ کیونکہ چندر گپت ملکی اور غیر ملکی خبروں کے حصول کا بڑا دلدادہ تھا۔

(تاریخ صحافت، ص25، امداد صابری)

لیکن معلوم تاریخ کا سب سے پہلا اخبار 'کین بان' ہے؛ جو چینی حکومت کا ترجمان تھا۔ یہ اخبار چین سے نکلا تھا۔ یہ ماہنامہ حکومت کا ترجمان تھا؛ جس میں حکومتی خبروں کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی خبریں درج ہوا کرتی تھیں لیکن اس اخبار کا کوئی خاص نام نہیں تھا۔ بعد کے لوگوں نے اس کے مشمولات کو دیکھتے ہوئے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کا نام رکھ دیا۔ چنانچہ معین الدین احمد ندوی نے اس اخبار کا نام ''Tasingpao'' اور انگریزی مؤرخین نے ''Paking Gazette'' اور عبدالسلام خورشید نے 'تے پاؤ' کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے۔

(معارف، ج2، شمارہ2، ص41، اعظم گڑھ)

کہا جاتا ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا روزنامہ ''Acta Duna'' تھا۔ Acta کے معنی خبروں کے ہیں

اور Duna کے معنی روزنامہ کے ہیں۔ یعنی روزانہ کی خبریں۔ یہ اخبار روم سے 691 ق م میں نکلا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا یومیہ اخبار 618 ق م میں چین کی دار الحکومت بیجنگ سے جاری ہوا۔ یہ اخبارُ سٹنگ' نامی چینی زرگر کی ایجاد کردہ لکڑی کے کھدے ہوئے حروف کے ذریعہ لکھا جاتا تھا۔ (نگار اگست، 1926)

ہندوستان میں عربی صحافت :

ابتدائی دور ہی سے عربوں میں فطری طور پر خبر رسانی اور تلاش و جستجو کی تڑپ پائی جاتی تھی۔ خبروں کا حصول اور اس کی نشر و اشاعت قدیم زمانے میں بھی ان کے یہاں اہم سماجی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔ خبروں اور اطلاعات کا فراہم کرنا مختلف قبائل کے حالات، ان کی تاریخ، بہادری کی داستان سے واقفیت حاصل کرنا اور اس پر اپنے فخر و مباہات کی عمارت کھڑی کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ غرور، خاندانی فخر و حماسہ نے اس صفت کو اور بھی مہمیز لگایا۔ مکہ کا عکاظ میلہ، اس طرح کی چیزوں کے لیے بہترین اکھاڑہ تھا۔ عرب کے قبائل ان میلوں میں اپنے اپنے شعراء کو پیش کرتے، وہ شعراء اپنے اپنے قبائل و خاندان کی عظمت کے قصیدے پڑھتے، یہ قصیدے عرب کی تاریخ اور اس خاندان اور قبیلے کے مکمل احوال و کوائف سے پر ہوا کرتے تھے۔ پھر یہی اشعار پورے عرب میں پھیل جاتے۔ گویا عربی صحافت کا یہ اولین بیج ہے جو عکاظ کے میلے میں بویا گیا تھا۔ زمانہ آگے بڑھتا گیا، کیلنڈر کے اوراق الٹتے گئے، عربی صحافت بھی کبھی سست رفتاری اور کبھی تیز گامی سے اپنا سفر طے کرتی رہی۔ یہاں تک کہ بر صغیر نے "النفع العظیم لاهل هذا الاقلیم" لاہور سے اپنی عربی صحافت کا آغاز کیا۔ یہ اخبار ہفت روزہ تھا؛ جس کا پہلا شمارہ 17 / اکتوبر 1871 میں منظر عام پر آیا۔ اس اخبار کو شیخ شمس الدین لاہوری نے جاری کیا تھا۔ جس کے مدیر مولوی مقرب علی جبکہ سرپرست G.W.Laitail تھے۔ ابتداً یہ اخبار آٹھ صفحات پر مشتمل تھا، پھر چند اشاعتوں کے بعد دو صفحے کا اضافہ ہوا اور دس صفحات پر نکلنے لگا۔ اخبار پنجابی پریس لاہور سے چھپتا تھا۔ اس اخبار میں دینی، ادبی اور سماجی مضامین اور خبریں ہوا کرتی تھیں۔ اس اخبار نے سرسید کی تحریک کو آگے بڑھانے میں بہت ہی اہم رول ادا کیا۔ اخبار ان کے نظریات اور افکار کو اہمیت کے ساتھ شائع کرتا تھا۔ اخبار 1885 تک لگاتار شائع ہوا لیکن پریس کے مالک منشی محمد عظیم کی وفات کے ساتھ اخبار کی اشاعت نے بھی دم توڑ دیا۔

(دیکھیے: تاریخ صحافت اردو، امداد صابری، ج 2، ص 206)

غیر منقسم ہندوستان میں یہ عربی صحافت کا اولین نقش ہے اور اسی اخبار کو سب سے پہلا عربی اخبار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ لیکن اخبار کی اشاعت سے پہلے کلکتہ گزٹ نے مارچ 1787 میں ایک اعلان شائع کیا تھا؛ جو فارسی، بنگالی اور عربی میں تھا۔ یہ اعلان 13 دسمبر 1787 کے شمارے میں تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عربی صحافت کا اولین نقش ہے جو اعلان کی شکل میں کسی اخبار کے صفحہ کا زینت بنا۔

مجلہ 'البیان' :

"النفع العظیم لاهل هذا الاقلیم "کے بند ہو جانے کے بعد تقریباً بیس سال کا عرصہ ایسا گزرا جب ہندوستان میں عربی کی آواز خاموش رہی۔ ان ایام میں پورے ملک سے کوئی بھی عربی مجلّہ یا اخبار شائع نہیں ہوا۔ 20 / ذی الحجہ 1319ھ مطابق مارچ 1902 کو ماہنامہ 'البیان' لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ ہندوستان میں عربی صحافت کی تاریخ کا دوسرا اخبار ہے۔ عام طور پر محققین کی یہی رائے ہے کہ عربی صحافت کی تاریخ کا یہ دوسرا اخبار ہے۔ 'النفع العظیم' اور 'البیان' کے درمیانی وقفے میں کوئی اور اخبار عربی زبان میں نہیں نکلا۔ جیسا کہ ڈاکٹر سلیم الرحمٰن خان ندوی، اور ڈاکٹر محمد ایوب تاج الدین ندوی کا دعویٰ ہے۔

(الصحافة الاسلامية في الهند، ص 224، نیز دیکھیے الصحافة العربية في الهند نشأتها وتطورها، ص 68)

لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ 'البیان' کی اشاعت سے پہلے 1901 میں بھوپال سے ریاض الدین احمد بریلوی نے پندرہ روزہ 'الریاض' جاری کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بھوپال کی رانی سلطان جہاں بیگم تھیں۔ یہ مجلّہ عربی اور اردو دونوں زبانوں میں ایک ساتھ شائع ہوتا تھا۔ جس میں ہندوستان کی خبریں عربی زبان میں ہوا کرتی تھیں جبکہ عالم عربی کی خبریں اردو میں ہوا کرتی تھیں۔

(اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، ص 371، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی)

تاہم بعض محققین کی رائے ہے کہ یہ مجلّہ 1934 میں شائع ہوا۔

(مدھیہ پردیش میں اردو صحافت، ص 47، 66، قمر جمالی اور شوکت رموزی)

'البیان' علمی، سیاسی اور تاریخی موضوعات کو شامل اشاعت کرتا تھا۔ ابتداً ماہانہ کی شکل میں شائع ہوا لیکن بعد کو پندرہ روزہ بن گیا۔ 'البیان' کے مدیر مشہور ادیب شیخ عبداللہ عمادی تھے، لیکن کچھ دنوں کے بعد شیخ عمادی مستعفی ہو گئے، اخبار کے مشرف عبد العلی مدراسی نے بھی اخبار سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ تاہم ڈاکٹر یوسف ہارون المانی استاذ مشرقی زبان علی گڑھ اسلامیہ کالج علی گڑھ کی سرپرستی میں اخبار نکلتا رہا۔ جبکہ ادارت کے فرائض سید سلیمان آفندی اور سید علی زینی کے سپرد ہوئے۔

('البیان'، شعبان 1328ھ)

کچھ شماروں کے بعد اس اخبار نے بھی دم توڑ دیا۔ عبد الرزاق ملیح آبادی کی کوششوں سے اس کے تن مردہ میں جان تو آئی، لیکن وہ بھی آخری پہر کا چراغ ہی ثابت ہوئی۔ مجلّہ 'البیان' کا اداریہ 'هذا بیان للناس' کے عنوان سے تحریر کیا جاتا تھا جس میں قرآن کی بعض آیتوں کی تفسیر کے علاوہ عالم اسلامی کی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ اس اخبار نے پورے ہندوستان میں اپنی ایک منفرد شناخت بنائی اور اہل علم نے اسے سر آنکھوں پر سجایا۔ اخبار کا اسلوب دلکش اور جدید تھا۔ جس نے قاری کے ذہن و دماغ پر مثبت اثرات مرتب کیے۔ یہ اخبار ہندوستانی مسلمانوں کا ترجمان حال تھا اور اسی کے واسطے عرب دنیا ہندوستانیوں کے حالات سے باخبر ہوا کرتی تھی۔

'الجامعة' :

1923 میں ہندوستان کے عظیم قائد، اولین وزیر تعلیم، مجاہد آزادی اور بے نظیر ادیب مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے عربی میں 'الجامعة' کے نام سے پندرہ روزہ انقلابی مجلّہ جاری کیا۔ جس کے ایڈیٹر عبد الرزاق ندوی ملیح آبادی تھے۔

'الجامعة' اپنی بے باک تحریروں، دلکش اسلوب بیان اور پختہ افکار کی نشر و اشاعت میں اپنے دور کا سب سے عمدہ رسالہ تھا۔ اس نے حکومت وقت پر بے لاگ تنقیدیں کیں۔ اس نے ہر اس عمل پر جو ہندوستان اور مسلمانوں کے خلاف تھا سخت نکیریں کی۔ اخبار نے پوری علمی دنیا میں اپنی امتیازی شان کے ساتھ قبولیت حاصل

البيان
أوباما يطلق «الوصايا السبع» لبداية جديدة مع المسلمين

کی۔ عوام کے دلوں میں آزادی کا جذبہ بیدار کیا۔ حتیٰ کہ اس کی ضربوں نے عالم عرب کے بعض حکمرانوں کو سخت زک پہنچائی۔ عالم عرب کے حکمراں جو جمہوریت اور اسلامی اصول کے خلاف حکمرانی کر رہے تھے الجامعۃ کی تیکھی تحریروں سے بلبلا اٹھے۔ چنانچہ حجاز کا حکمراں شریف حسین 'الجامعۃ' کی چوٹ برداشت نہ کر سکا اور اس نے اپنے ترجمان 'القبلہ' میں 'الجامعۃ' کے بانی مولانا ابوالکلام کو ابوالکلاب لکھا اور ان پر اوچھی تنقیدیں کیں۔

(صحافت پاکستان و ہند میں، ص 465)

کیونکہ شریف مکہ برطانوی حکومت کا حلیف تھا اور مولانا آزاد کی تحریریں برطانوی سامراج کے خلاف شمشیر بے نیام تھیں۔

'الجامعۃ' کا پہلا شمارہ اپریل 1923 میں منظر عام پر آیا، لیکن ناموافق حالات سے مجبور ہو کر مارچ 1924 میں اس مجلّے نے بھی اپنی آخری سانس لے لی۔

'صوت الحق':

1925 میں شیخ محمد معراج اور شیخ عبداللہ شریف نے ممبئی سے 'صوت الحق' جاری کیا۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد اس کی اشاعت بند ہو گئی۔

مجلہ 'الضیاء':

ہندوستان میں عربی صحافت کا ایک روشن ستارہ ماہنامہ 'الضیاء' ہے۔ جو ہندوستانی افق صحافت پر محرم الحرام 1351 مطابق مئی 1932 کو جلوہ گر ہوا۔ ماہنامہ 'الضیاء' عربی زبان و ادب کے عظیم مرکز ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع ہوا۔ جس کے مدیر ہندوستان کے معروف ادیب اور عربی کے ممتاز نثر نگار مولانا مسعود عالم ندوی تھے۔ جبکہ علامہ سید سلیمان ندوی اور شیخ تقی الدین ہلالی مراقشی جیسے شہرۂ آفاق، ادیب، مؤرخ اور اسلامی علوم کے رمز شناس اس اخبار کے معاون ایڈیٹر تھے۔ 'الضیاء' کو عالم اسلام کے ممتاز ادیب، مؤرخ ماضی قریب عظیم مفکر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور متعدد عربی کتابوں کے مصنف مولانا محمد ناظم ندوی کی خدمات بھی حاصل تھی۔

(پرانے چراغ، ج: 1، ص: 321،326 از سید ابوالحسن علی ندوی)

اس مجلّے نے ہندوستان اور ہندوستان کے باہر اپنی انفرادیت قائم کی۔ عربوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے مضامین اہل علم دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ ضیاء نے اسلامی ادب کا ایک روشن اور خوبصورت نمونہ عالم عربی کے سامنے پیش کیا۔ یہ مجلّہ محض اخبار نہ تھا بلکہ وہ اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی روایات و افکار کا ترجمان اور مسلمانان ہند کی زبان حال تھا۔ لیکن افسوس

کہ اس ادبی اسلامی مجلّے کی زندگی بہت طویل نہ ہو سکی اور 1935 میں مالی پریشانیوں نے اس روشن چراغ کو گل کر دیا۔ ضیا کی اہمیت کا اندازہ شام سے شائع ہونے والے عربی اخبار کے اس تبصرے سے لگایا جا سکتا ہے:

''مجلّہ ضیا کا یہ چوتھا سال ہے اور یہ واقعی روشنی اور ہدایت کا چراغ ہے، یہ مجلّہ بڑے مفید اور عمدہ مضامین اور مقالات شائع کرتا ہے، اگر اس کی اشاعت تھوڑے عمدہ کاغذ اور طباعت کے ساتھ ہوتی تو اس مجلّہ کو عربی زبان میں شائع ہونے والے صف اول کے مجلوں میں شمار کیا جاتا گو کہ یہ ایک عجمی ملک سے شائع ہو رہا ہے''

(الضیاء، ج: 4، 8/ شعبان 1354ھ)

جبکہ لبنان سے شائع ہونے والا اخبار 'صفا' مجلّہ 'الضیاء' کے سلسلے میں اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:

''لکھنؤ سے ضیا نامی ایک مجلّہ استاذ سید مسعود عالم ندوی شائع کرتے ہیں، وہ اسلامی اور مفید ترین مقالات پر مشتمل ہوتا ہے، ہندوستان سے شائع ہونے والے رسائل میں اس کا کوئی ہم پلہ نہیں ہے۔ زبان و اسلوب کے اعتبار سے یہ عرب دنیا سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد سے بھی ممتاز ہے۔'' (حوالہ سابق)

غرض کہ 'ضیاء' کی روشنی اپنی روشن اور پاکیزہ تحریر، قیمتی مواد، دلکش اسلوب، دلنشیں انداز بیان کے ذریعہ عرب و عجم کو اپنی زلف کا اسیر بنا چکی تھی۔ ہر دن اس کے لیے عزت و عظمت کا پیام لاتا تھا۔ لیکن باقی رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے باقی سب فانی ہے اور ''ضیاء'' بھی فنا سے نہ بچ سکا۔

'نسیم الصبا'، سندھ گزٹ، سندھ سدھار، ایسٹرن پریس، التوحید یہ وہ رسائل ہیں جو اس زمانہ میں لاہور، کراچی وغیرہ سے شائع ہوا کرتے تھے۔ سندھ گزٹ، سندھ سدھار، ایسٹرن پریس، التوحید وغیرہ عربی اور سندھی دونوں زبانوں میں مشترکہ طور پر شائع ہوا کرتے تھے۔

اس کے بعد ماہنامہ 'العرب' ممبئی سے 1938 میں جاری ہوا۔ جس کی اشاعت آزادی ہند تک برابر جاری رہی۔ لیکن اس اخبار کو ہندوستانی سماج، ہندوستانی احوال و کوائف اور ہندوستانیوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ ہی اس اخبار کو زبان و ادب کی ترقی سے مطلب تھا۔ تقسیم وطن کے بعد اس کے مدیر عبدالمنعم عدوی پاکستان منتقل ہو گئے۔ ان کے ساتھ ہی اخبار بھی کراچی پاکستان چلا گیا۔ اور وہیں سے اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ پاکستان کی تاریخ کا یہ پہلا عربی اخبار ہے۔

(البعث الاسلامی، جنوری 1957)

'ثقافۃ الہند':

1947 میں جب ملک کو انگریزی سامراج سے آزادی حاصل ہوئی اور ہندوستان میں ہندوستانیوں کی اپنی حکومت تشکیل پائی، ملک کے پہلے وزیراعظم ہونے کا فخر جواہر لال نہرو کو حاصل ہوا تو ملک کے پہلے وزیر تعلیم کی مسند کو مولانا ابوالکلام آزاد نے عزت بخشی۔ مولانا آزاد نے وزارت تعلیم کی طرف سے مارچ 1950 میں سہ ماہی 'ثقافۃ الہند' جاری کیا۔ یہ مجلّہ آج بھی وزارت تعلیم کے ترجمان کی حیثیت سے جاری ہے۔ اس کا مقصد ہندوستان اور عربی ثقافت کے رشتوں کو مضبوط کرنا، ہند عرب تعلقات کو فروغ دینا اور ہندوستان میں عربی زبان کو رواج بخشنا ہے۔ اس کے پہلے مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ ابتداً یہ مجلّہ سال میں چار فصلوں کے اعتبار سے نکلتا تھا، لیکن بعد کو یہ سہ ماہی ہو گیا۔

(الصحافۃ العربیۃ فی الهند نشأتها وتطورها، ص 113)

'البعث الاسلامی':

عربی زبان و ادب کی تاریخ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ عرب ممالک سے دور ہندوستان بلکہ برصغیر ہند و پاک بنگلہ دیش میں جو کچھ بھی عربی کی خدمت نظر آتی ہے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق ندوۃ العلماء سے ضرور ہے۔ اس عظیم مرکز نے ہندوستان میں اس زبان کی تعلیم و تربیت کی راہ ہموار کی جس کو اللہ پاک نے اپنی کتاب کے لیے پسند فرمایا۔ جس زبان میں ہم سب کے محسن نبی اکرمؐ اور ان کے اصحاب گفتگو فرمایا کرتے تھے، اس زبان کی تعلیم کے لیے ندوہ نے خالص عربی منہج پر تدریسی نظام قائم کیا اور اس زبان کو ہندوستان میں پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے لیے ایسی فضا عطا کی جس میں ہر سو عربیت ہے۔ اسی مبارک ادارہ سے کسی زمانے میں 'الضیاء' نکلا کرتا تھا لیکن جب حوادث زمانہ

نے 'الضیاء' کی روشنی گل کر دی تو ایک طویل وقفہ ایسا گزرا جب ہندوستانی صحافت سے عربی نایاب ہو گئی، لیکن 1955 میں ندوۃ العلماء کے ہی ایک اولوالعزم فرزند اور البیلے ادیب مولانا محمد الحسنی نے 'البعث الاسلامی' کے نام سے ادبی، علمی اور اسلامی مجلّہ جاری کیا۔ اس طرح ہندوستانی عربی صحافت کی تاریخ میں ایک روشن دور کا آغاز اکتوبر 1955 میں ہوا۔ 'البعث الاسلامی' کو ابتدا ہی سے مولانا محمد الحسنی کے علاوہ عالم اسلام کے مشہور ادیب مولانا سعید الاعظمی ندوی اور ڈاکٹر محمد اجتبا ندوی کی خدمات حاصل رہیں۔ مارچ 1960 سے یہ مجلّہ ندوۃ العلما کے ترجمان کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے۔

ایک طویل عرصے سے اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر سعید الاعظمی ندوی اور مولانا واضح رشید ندوی جیسی شخصیتیں اس کی ادارت سے وابستہ رہی ہیں۔ ابتداً یہ مجلّہ 32 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا جبکہ آج کل اس کے مشمولات 100 صفحات پر پھیلے ہوتے ہیں۔

ہندوستانی عربی صحافت کی تاریخ میں 'البعث الاسلامی' کی خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس نے ہندوستان کی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کی علمی، ادبی اور ثقافتی رہنمائی کی ہے۔ البعث کے ٹائٹل پیج پر شائع ہونے والا یہ چھوٹا سا لیکن انتہائی بلیغ جملہ اس مجلّے کے مقاصد کو اجاگر کرتا ہے۔ مجلّہ یہ جملہ "شعارنا الوحید الی الاسلامی من جدید" اپنے ٹائٹل پیج پر پابندی سے شائع کرتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ پورا مجلّہ اسی بلیغ جملے کی علمی، ادبی تفسیر ہوا کرتا ہے۔

ہر دور میں 'البعث' کے لکھنے والوں میں عالم اسلام کے ممتاز ادباء اور مفکرین شامل رہے ہیں جن کی نگارشات اعلیٰ اور معیاری ادب کے ساتھ ساتھ صحیح اسلامی فکر کو پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مجلّے نے عربوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ چنانچہ خلیج کے ممالک کے علاوہ عراق، لیبیا، تیونس، الجزائر، مصر وغیرہ میں عزت کی نگاہ سے پڑھا جاتا ہے۔ دنیا اس کی منتظر ہوتی ہے۔

'البعث الاسلامی' پر اظہار خیال کرتے ہوئے 'الرابطۃ الاسلامیۃ' کے ایڈیٹر تحریر کرتے ہیں:

''البعث الاسلامی گذشتہ بیس سالوں سے ہندوستانی مسلمان اور ان کے مسائل کو پوری قوت سے اٹھانے والا یہ ایسا مجلّہ ہے جس نے اپنی پوری توانائی اسلامی فکر کی حفاظت میں صرف کی ہے، یہ لگاتار اسلام اور مبادی اسلام کی دفاع میں سرگرم عمل ہے''۔

(البعث الاسلامی، ج 24، عدد 2، شوال 1399ھ)

'الرائد':

ندوہ نے اپنے قیام ہی کے دن سے قرآن وحدیث کی زبان عربی کی ترویج و اشاعت کی کوششیں کیں۔ اس کی کوششیں رنگ لائی اور ہندوستان جیسے ملک میں عربی زبان کو رواج حاصل ہوا۔ اسی مبارک کوشش کی ایک مبارک کڑی 'الرائد' ہے۔ پندرہ روزہ 'الرائد' 1959 میں ندوہ سے جاری ہوا۔ اس کے بانی مولانا سید رابع حسنی ہیں۔ الرائد کے بھی مقاصد وہی ہیں جو البعث الاسلامی کے مقاصد ہیں۔ الرائد نے ہندوستان میں عربی صحافت کو نئی جہت عطا کی۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلباء کے ترجمان کی حیثیت سے اس کی خدمات تاریخ صحافت کی زریں کڑی ہے۔ یہ اخبار جس زمانہ میں نکلا اس زمانہ میں پورے ملک میں اس کی کوئی نظیر نہیں تھی۔ مجلس ادارت میں مولانا محمد رابع حسن ندوی کے علاوہ مولانا سعید اعظمی ندوی جیسے اہل قلم شامل ہیں۔ جبکہ اخبار کو مشہور ادیب مولانا واضح رشید حسنی ندوی کی سرپرستی ابتدائی ایام سے ہی حاصل ہے۔ 1959 سے یہ اخبار پوری پابندی کے ساتھ آج تک اپنی امتیازی شان کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ہر پندرہ روز پہ اخبار نئے اسلامی، ادبی، فکری مضامین کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

'دعوۃ الحق':

ہندوستان کی علمی، دینی، ادبی، فکری فضا پر دار العلوم دیوبند کے اثرات کا کوئی مؤرخ انکار نہیں کر سکتا۔ دار العلوم دیوبند نے ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کو صحیح اسلامی فکر اور منہج پر زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا۔ ہندوستان کا کوئی خطہ نہیں جس پر دار العلوم کے دینی اثرات نمایاں نہ ہوں۔ دار العلوم دیوبند نے نہ صرف مسلمانوں کی دینی، فکری رہنمائی کی بلکہ جنگ آزادی کی مکمل قیادت بھی کی۔ 1857 کے انقلاب کی ناکامی کے بعد اگر دار العلوم دیوبند نہ ہوتا تو شاید ہندوستان میں بھی اندلس کی تاریخ دہرادی جاتی۔ یہ بلند بالا مسجد کی منارے آج خون کے آنسو رو رہے ہوتے، لیکن اللہ نے فضل فرمایا اور امام نانوتوی نے دار العلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ ہندوستان کے تمام مدارس اور دینی مراکز کا سلسلہ نسب کسی نہ کسی طرح دار العلوم سے مل جاتا ہے۔

آزادی کے بعد ملک میں عربی زبان کو اہمیت حاصل ہوئی اور اصحاب فکر ونظر کی توجہ سے یہ زندہ زبان ہندوستان میں بھی زندہ ہوئی۔ دار العلوم دیوبند نے اپنی عربی صحافت کا آغاز 'دعوۃ الحق' کے اجراء سے کیا۔ یہ مجلّہ فروری 1965 میں مطلع صحافت پر طلوع ہوا۔ اس

کے بانی اور پہلے مدیر عالم اسلام کے مشہور عالم دین، ادیب اور متعدد لغات کے مصنف علامہ وحید الزماں کیرانوی تھے۔ یہ مجلّہ سہ ماہی ہوا کرتا تھا۔ لیکن افسوس کہ دس سال بعد 1975 میں اس کی اشاعت بند ہو گئی۔

ابتداً 'دعوۃ الحق' 64 صفحات پر مشتمل ہوتا لیکن بعد کو 80 صفحات کر دیے گئے۔ مجلّہ اپنا اداریہ 'افکار وخواطر' کے عنوان سے لکھتا تھا۔ مجلّہ خالص عربی اسلوب میں شائع ہوتا تھا۔ اس مجلّے کو ہندوستان اور ہندوستان کے باہر عربی دنیا میں قبول عام حاصل ہوا۔ ممتاز عرب علماء نے مجلّے کی پذیرائی کی۔ چنانچہ سعودی عرب سے شائع ہونے والا مجلّہ 'المنہل' کے ایڈیٹر عبد القدوس انصاری لکھتے:

''مجھے آپ کا خط اور شاندار عربی مجلّہ دعوۃ الحق ملا میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ یہ مجلّہ تیز رفتار ترقی کرے۔''

(دعوۃ الحق، ج:1، شمارہ 1، فروری 1965)

جبکہ 'جمعیۃ ابحاث العلمیۃ' کے صدر ڈاکٹر محمد یحییٰ ہاشمی تحریر کرتے ہیں:

''میں نے انتہائی خوشی ومسرت کے ساتھ آپ کے عظیم الشان رسالہ جو بیش قیمت علمی مواد سے پر تھا کا مطالعہ کیا۔'' (دعوۃ الحق، ج:1، شمارہ 3، اگست 1965)

غرض کہ اس مجلّے نے بہت تھوڑے دنوں میں پوری علمی دنیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

'الھند':

جن دنوں میں ہندوستان انگریزی سامراج سے دست وگریباں تھا، انھیں ایام میں شام بھی آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ شام کو بھی آزادی کی نعمت عظمیٰ میسر آئی۔ حکومت ہند آزادی کے بعد سے ہی عربوں سے بہتر تعلقات کی خواہاں رہی

ہے،اور ہندوستانی کلچر کو عرب میں متعارف کرنے کے لیے متعدد عربی مجلات جاری کیے۔ اسی غرض سے شام میں ہندوستانی سفارت خانہ نے دمشق سے 1972 میں 'الہند' جاری کیا۔ 'الہند' کے مقاصد بھی وہی تھے جو 'ثقافۃ الہند' کے ہیں یعنی عربوں کو ہندوستانی ثقافت اور بطور خاص قدیم ہندوستانی ثقافت سے واقف کرانا، ہند اور عرب تعلقات استوار کرنا، ہندوستانی احوال و کوائف سے عربوں کو روشناس کرانا وغیرہ۔ اس مجلّے نے شام اور ہندوستان میں گہری دوستی کی نیو رکھی۔ اور عربوں سے بھی دوستی کو بڑھاوا دینے میں 'الہند' نے اہم کردار ادا کیا۔ (الہند، شمارہ 141، ستمبر 1995، ص 3)

'الکفاح'

جوں جوں ہندوستان اور عرب تعلقات مضبوط ہوتے گئے اور ہندوستان میں عربی زبان کو بحیثیت زبان مقام ملتا گیا عربی صحافت کا بھی رواج ہندوستان میں بڑھتا گیا۔ چنانچہ جنوری 1973 میں جمعیت العلماء ہند نے پندرہ روزہ 'الکفاح' مولانا وحید الزماں کیرانوی کی ادارت میں جاری کیا۔

یہ جریدہ اپنے پہلے صفحہ پر جمعیت کے علمی، ثقافتی، سماجی اور رفاہی کاموں کی خبریں شائع کرتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ عرب دنیا کی خبریں، مقالات و مضامین شائع کیا کرتا تھا۔ جبکہ آخری صفحے پر عربی زبان سیکھنے کے خواہش مند لوگوں کے لیے عربی مفردات شائع کیا کرتا تھا۔ عربی زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ اخبار ایک طرح کا معلم تھا۔

'الداعی':

دار العلوم دیوبند نے اپنی عربی صحافت کا آغاز 'دعوۃ الحق' سے کیا؛ جس کی اشاعت 1975 میں بند ہوگئی۔ لیکن اس نقصان کا بہترین بدل دار العلوم نے عربی دنیا کو پندرہ روزہ 'الداعی' کے ذریعہ دیا۔ 'دعوۃ الحق' سہ ماہی تھا۔ جبکہ 'الداعی' پندرہ روزہ ہے۔ چند دنوں کے خسارہ کا یہ نعم البدل تھا۔ 'الداعی' جون 1976 میں پہلی دفعہ منظر عام پر آیا اور اس کے پہلے مدیر مولانا وحید الزماں کیرانوی تھے۔ مولانا کیرانوی کے بعد 'الداعی' کو ملک کے ممتاز ادیب مولانا بدر الحسن قاسمی دربھنگوی (حال مقیم کویت) کی خدمات حاصل ہوئی۔ مولانا قاسمی کے کویت منتقل ہونے کے بعد سے آج تک 'الداعی' کے رئیس التحریر کی حیثیت سے عالم اسلام کے معروف ادیب، متعدد علمی ادبی کتابوں کے مصنف مولانا نور عالم خلیل الامینی مظفر پوری انجام دے رہے ہیں۔

'الداعی' اپنی انفرادیت اور امتیاز کے ساتھ آج بھی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ ابتدا 'الداعی' آٹھ صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ اس مجلّے نے پوری علمی، عربی دنیا میں اپنی ایک پہچان قائم کی ہے۔ خود عرب بھی اس مجلّہ کو عزت کی نگاہ سے پڑھتے ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں دنیا کے ممتاز اہل قلم شامل ہیں۔ چنانچہ 'الداعی' پر اپنے تاثرات کا اظہار ملک عبد العزیز جدہ کے پروفیسر ڈاکٹر احمد عبد القادر باحفظ اللہ تحریر کرتے ہیں:

''مجھے آج آپ کے مجلّے کا اکیسواں شمارہ ملا، میں بتا نہیں سکتا کہ مجھے کس قدر خوشی ہو رہی ہے، مجلّہ الداعی کے مشمولات نہایت ہی عمدہ و بیش قیمت افکار و خیالات اور روشن مضامین سے پر ہیں، بطور خاص مجھے اس بات کی خوشی ہو رہی ہے کہ آپ نے بڑے ہی اہتمام کے ساتھ عالم عربی کی خبروں کو نشر کیا ہے۔''

(الداعی، ج2، شمارہ 24، 10/ستمبر 1978)

آج بھی 'الداعی' عربی زبان و ادب کا ایک ممتاز معیاری رسالہ سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان اور عرب دنیا کی نگاہیں اس کے لیے فرش راہ رہتی ہیں۔

'الدعوۃ':

اپریل 1975 میں جماعت اسلامی ہند نے اپنا عربی ترجمان 'الدعوۃ' کے نام سے جاری کیا۔ اور اس کے مدیر سلمان ندوی بنائے گئے۔ 'الدعوۃ' جماعت اسلامی کی علمی، دینی، سماجی اور فلاحی خبریں شائع کرنے کے علاوہ علمی مقالات و مضامین بھی شائع کرتا تھا۔ اس اخبار نے بھی عربی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام بنا لیا۔ اخبار ہر پندرہ روز پر شائع ہوتا تھا۔

چند دیگر عربی مجلات و رسائل:

ان مجلّات کے علاوہ ہندوستان سے متعدد عربی رسائل و جرائد بھی وقتے وقتے سے نکلتے رہے۔ اور آج بھی ہندوستان کے مختلف مقامات سے عربی رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں۔ جس سے اس زبان کی اہمیت اور اس ملک کے لوگوں کی عربی زبان سے دلچسپی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان جرائد و رسائل میں 'الصبح'، 'المجمع العلمی الہندی'، 'الثقافہ'، 'الدراسات الاسلامیہ' (دار العلوم سے شائع ہوتا تھا جس کے مدیر سعید احمد اکبر آبادی تھے) 'الرابطۃ الاسلامیۃ'، 'صوت السلام' دار العلوم سبیل السلام، حیدر آباد' 'الرشاد' جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ، 'الصحوۃ الاسلامیۃ' دار العلوم حیدر آباد، 'صوت الاسلام' غازی پور، 'النور' اشاعۃ العلوم اکل کنواں، مہاراشٹر، 'التاریخ الاسلامیۃ' دہلی، 'المظاہر' جامعہ اسلامیہ مظاہر العلوم، سہارن پور (یوپی)، 'الحرم' جامعہ امدادیہ مراد آباد، 'منار الہدیٰ' جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات، 'النہضۃ الاسلامیۃ' دار العلوم اسلامیہ بستی، 'المعلم'، 'المیزان'، 'الثقافہ'، 'نداء الہند' کیرالہ، وغیرہ ہندوستان کے مختلف دینی، علمی، تحریکی مراکز سے شائع ہوئے۔ ان میں سے بیشتر مجلّات آج بھی پوری پابندی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔

ریڈیائی صحافت:

ہندوستان میں عربی صحافت نے اخبار و رسائل کی دنیا میں جہاں اپنا مقام بنایا وہیں اس نے نشریات کی دنیا میں بھی اپنی منفرد پہچان بنائی یا بہ الفاظ دیگر پرنٹ میڈیا کے ساتھ ساتھ عربی الکٹرانک میڈیا نے بھی عرب دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ چنانچہ 22/مارچ 1953 کو ہندوستان میں عربی ریڈیائی صحافت کا آغاز ہوا اور 'آکاش وانی، دہلی' نے اپنی نشریات میں عربی کو شامل کیا۔ پہلی دفعہ 'آکاش وانی' دہلی نے 22/مارچ 1953 بروز اتوار شام 7 بجکر 55 منٹ پر عربی زبان میں اپنی نشریات کا آغاز کیا۔ اس نشریہ نے عرب دنیا میں قبول عام حاصل کیا۔ 'آکاش وانی' نے عربی نشریات کے لیے صبح و شام کا وقت مختص کیا۔ صبح 6:30 سے 7 بجے اور شام 7:30 سے 9:30 تک عربی خبریں وغیرہ نشر ہوا کرتی تھیں۔ 'آکاش وانی' کے متعدد عربی نشریات تھے۔ مثلاً قرآن کریم کی تلاوت، خبروں پر تبصرے، عربی گانے، جمعہ، اتوار اور منگل کو نشر ہوتے تھے تو ہندی گانے سوموار، بدھ، سنیچر اور جمعرات کو نشر ہوا کرتے تھے۔

غرض کہ بیسویں صدی میں ہندوستان میں عربی صحافت نے روشن منارے قائم کیے۔ کوئی بھی عربی زبان و ادب اور صحافت کا مورخ ہندوستانی عربی صحافت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ نہ صرف ہندوستانیوں نے رسمی طور پر عربی اخبار و رسائل جاری کیے بلکہ اپنے اسلوب بیان اور طرز تحریر کا عربوں سے بھی اعتراف کروایا۔ آج بھی عرب دنیا ہندوستانیوں کی عربی دانی پر عش عش کرتی ہے۔ اس دوران ہندوستان سے شائع ہونے والا کون سا ایسا مجلّہ یا رسالہ ہے؛ جس نے عربوں سے خراج تحسین وصول نہ کیا ہو۔ خواہ وہ 'البیان' کا بیان موجز ہو یا 'الضیا' کی ضیا پاشیاں یا 'الرائد' کی قیادت اور 'البعث' کی ادبی اڑان یا پھر 'الداعی' کی دعوت عام۔ ہندوستانی مجلّے عرب کے جس حلقے میں پہنچے ان کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی اور ان کے افکار کا جلا بخشا۔

■

Mohd Nafe Arfi
Mahad-ul-Islami
Harsanghpur
Darbhanga - 846004 (Bihar)

سعدیہ صدف

آج کے عالمی تناظر میں اردو کا تحفظ اور فروغ

انسانی وجود کائنات کی سب سے خوبصورت تخلیق ہے۔ اس کے امتیازی وصف کے سبب ہی خدا کی طرف سے اسے اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہوا۔ لیکن اس کے وجود کی رعنائی، دلکشی، حسن و لطافت کی جو مظہر ہے وہ اس کی زبان ہے۔ یہاں زبان سے مراد اعضائے جسم تو ہے مگر معاشرے میں جذبات کے اظہار، اس کی ترسیل اور روابط کے لیے زبان کو لفظوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی الفاظ روابط کا ذریعہ ہیں۔ یہی الفاظ زبان زد ہوتے ہوئے عوامی زبانLanguage بن جاتے ہیں۔ زبانیں تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ چونکہ ہندوستان رنگا رنگ تہذیب و تمدن کا ملک ہے اس لیے یہاں مختلف اقوام اور ان کی زبانیں رائج ہیں۔

کسی بھی زبان کی پیدائش اور اس کی ترقی لمحے پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ اس کا ارتقائی سفر صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ شکستہ، لڑکھتی، سنبھلتی، اپنے قدم جماتی ہوئی، تشکیل و تعمیر کی منزلوں سے گزرتی ہوئی زبانیں اپنی تکمیل کو پہنچتی ہیں اور مختلف تجربوں سے دو چار ہوتی ہوئی اپنی بنیادوں کو مستحکم بناتی ہیں اور ترقی یافتہ شکل اختیار کرتی ہیں۔ زبانوں کی ترقی کبھی منجمد نہیں رہتی۔ زمان و مکان کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ زبانوں میں بھی تبدیلیاں اور ترقیاں ہوتی رہتی ہیں۔

دنیا کی تمام زبانوں کی طرح اردو زبان بھی ارتقائی مراحل سے گزر کر آج ہمارے سامنے شستہ و نفیس صورت میں موجود ہے۔ زبان اردو جو اپنے بطن میں مختلف زبانوں کے الفاظ سموئے ہوئے ہے، مختلف قوموں کے لسانی اختلاط کے سبب وجود میں آئی ہے۔ یہ اختلاط بیرون ممالک سے آنے والے تجار، امراء اور سلاطین کی رہین منت ہے۔ ان تمام افراد نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اردو زبان کو نہ صرف پھلنے پھولنے کا موقع عطا کیا بلکہ اسے دنیا کے مختلف ممالک تک پہنچا کر اسے عالمی وقار بخشا۔

اردو صرف ایک زبان کا نام نہیں بلکہ ایک تہذیب کا نام ہے اس تہذیب کا جس کے ہم پروردہ ہیں۔ اور جس کی آبیاری نہ صرف ہمارے قدمانے کی بلکہ آج کی نسل بھی اس کی ترقی و بقا کے لیے متحرک ہے۔ اس کے فروغ میں ماضی کی کاوشوں کے ساتھ عصر حاضر کی جدو جہد بھی لائق ستائش ہے۔ اسے ہر محاذ پر ڈٹے رہنے کا حوصلہ بھی ملا اور تحفظ و بقا کی خاطر کامیاب کوششیں بھی کی گئیں۔ اس ضمن میں اردو زبان کے ابتدائی سفر کا جائزہ لیں تو اندازہ ہو سکے گا کہ اردو کے تحفظ اور بقا کے لیے کسی نہ کسی طرح ہر زمانے میں پے در پے کوششیں ہوئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ کیونکہ ہماری زبان میں رد و قبول کی صلاحیت موجود ہے۔ اور یہی وصف اسے آج بھی زندہ و تابندہ کیے ہوئے ہے۔ اردو زبان نے خوشگوار تبدیلیوں کا تو ہمیشہ خیر مقدم کیا مگر اپنی پرانی شناخت کو کسی بھی طرح معدوم نہ ہونے دیا۔ اسی سبب اس کے ارتقا کے مثبت و موثر امکانات روشن ہوتے گئے۔

مشترکہ تہذیب کی علامت، ہمارا ملک ہندوستان صدیوں سے اردو تہذیب کا امین رہا ہے۔ اس کے گہوارے میں ہی ہماری زبان پرورش پاتی رہی اور ادب نے کروٹیں بدلیں۔ مختلف اقوام کی ہم آہنگی سے ملک کی رنگا رنگ تہذیب پروان چڑھتی رہی۔ ابتدا میں یہاں بولی جانے والی زبان ہندوی یا ہندوستانی تھی جس کو عوام میں مقبولیت حاصل تھی۔ اسی عوامی زبان کو ہم آج اردو کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔۔ اس سلسلے میں گوپی چند نارنگ یوں رقمطراز ہیں:

"......کوئی بھی سچائی جب جنم لیتی ہے، اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ سچائیوں کو نام تو اس وقت ملتا ہے جب وہ خانہ زاد ہو جاتی ہیں۔ پراکرتوں کی دھرتی سے جب نیا انکھوا پھوٹا اور اس میں عربی، فارسی، ترکی اثرات کا پیوند لگا تو اس کا کوئی بھی نام نہیں تھا، ہند یعنی ہندوستان کی ہر چیز 'ہندی' تھی، فارسی یائے نسبتی کے ساتھ، اس طرح ہر زبان ہندی تھی۔ امیر خسرو نے اسے ہندوی بھی کہا اور دہلوی بھی۔ اسی زمانے میں جب راگ رنگ کی محفلوں میں اس کے نغمے سماں باندھنے لگے، تو اسے ریختہ بھی کہا گیا۔ دکن اور گجرات پہنچی تو دکنی اور گجری کہلائی، پھر کسی نے اردو کہا، کسی نے ہندی، کسی نے کھڑی، بنیاد وہی ایک، راہیں الگ الگ ہو گئیں۔"

(اردو زبان و لسانیات، گوپی چند نارنگ، ص 37، رام پور رضا لائبریری 2006)

نارنگ صاحب نے اردو زبان کے وجود میں آنے کے تعلق سے جو وضاحت کی ہے وہ بہت ہی اہم ہے اور اس کی ہندوستانیت پر دال ہے۔

معاملہ بازار کا ہو کہ دربار کا اردو کے نقوش اور اس کے خد و خال ابتدا سے ہی خال خال، خام حالت میں موجود ضرور تھے۔ آریاؤں کی آمد سے لے کر ان کے بسنے تک، ترکوں کے حملے اور مغلوں کی اندرون ہند پیش قدمی نے اس کی پرورش و پرداخت کے لیے ایسی فضا سازی کی کہ اس کے اثرات روز افزوں مرتب ہوتے گئے۔ لشکری زبان ہونے کی وجہ سے درباروں تک رسائی حاصل کرنے میں یہ ناکام رہی۔ البتہ عوام الناس نے اور مغل فوج کی گود میں پروان چڑھنے کے اسے اچھے مواقع نصیب ہوئے۔ اسی دوران صوفیائے کرام نے بھی آسان فہم زبان میں اپنے مقاصد و پیغامات کی ترسیل کے لیے اسی عوامی

زبان کو وسیلہ بنایا جو اردو کی ہی ابتدائی شکل میں موجود تھی۔

صوفیائے کرام نے عوام میں رائج زبان کے استعمال کے ذریعے سبق دینے کی کوششیں کیں۔ اور اس زبان کو استحکام بخشنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ البتہ یہ سب اردو زبان کے ایام طفلی کے عناصر ہیں۔ اردو کے اسی پودے نے دیکھتے ہی دیکھتے تناور اور چھتنار درخت کی شکل اختیار کرلی۔ اس کے ارتقائی سفر میں مذکورہ بالا عناصر لازمی نے راہیں فراہم کیں اور اسے بحیثیت ایک صحت مند زبان کے طور پر استحکام بخشا۔ اس کے بعد کئی اور عوامل اس کی ترقی کے پس پشت شامل رہے جن کے طفیل اردو کو نہ صرف بے پناہ فروغ حاصل ہوا بلکہ اس نے اپنا وہ مقام بھی بنالیا کہ غیر اردو داں حضرات بھی اس کے اسیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس جہت میں اس زمانے کی روداد، محفل سخن اور داستانوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ بعد کو بیرونی ممالک سے آنے والے سیاح اور ان کی ہندوستانی کلچر میں دلچسپی نے اردو کے فروغ کے امکانات وسیع تر کردیے۔

تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ شعراء کی انجمنیں اس کی اشاعت میں معاون رہیں۔ پھر وہ دور بھی آیا جب اردو نے درباروں اور ایوانوں تک رسائی حاصل کی۔ ایسا اس لیے ہوا تھا کہ انگریزوں نے ملک پر تسلط قائم کرکے فارسی کی گردن ماردی تھی۔ انھیں اس بات کا فطری طور پر احساس تھا کہ ملک پر حکمرانی اسی وقت ممکن ہے جب کہ محکوم ملک کی زبان، تہذیب او رمعاشرت سے واقفیت ہو۔ لہٰذا انھوں نے اس سمت سنجیدگی سے عملی اقدامات اٹھائے جس سے مفادات کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کو بھی فائدہ ہوا۔ اس فائدے کی نشان دہی فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ہوتی ہے۔ انگریزوں کی تعلیم وتدریس کے ساتھ یہاں اردو نثر، دوسری زبانوں کے داستانوں سے اس قدر مالا مال ہوگئی کہ اس کا اپنا دامن وسیع ہوتا چلا گیا۔ چونکہ اس کالج کو منصوبہ بند طریقے سے سیاسی مقاصد کی تکمیل کی خاطر قائم کیا گیا تھا لہٰذا مقصد کی تکمیل پر اسے بند بھی کردیا گیا مگر اسی قلیل مدت میں یہاں ایسی ایسی تالیفات و تصنیفات منصۂ شہود پر آئیں جن کی مثالیں نہیں ملتیں۔

اردو زبان کی ترویج میں فورٹ ولیم کالج کے بعد دوسرا اہم ادارہ دلی کالج تھا۔ دلی کالج نے فورٹ ولیم کے ڈالے ہوئے بیجوں کی آبیاری کی اور اس کے باقی ماندہ کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ فورٹ ولیم کی تعلیم کا مقصد انگریزوں کو ملک کی تہذیب سے آشنا کرانا تھا جبکہ دلی کالج نے علمی اور عالمی سطح پر اپنے ہم وطنوں کی تعلیمی شخصیت سازی کا فریضہ انجام دیا تاکہ ہماری قوم تعلیمی میدان میں ابھر سکے اور وہ کسی صورت کسی سے پیچھے نہ رہ جاتے۔ درس و تدریس کے اسی جذبے نے بڑے بڑے اہل دانش اردو ادب کو دیے۔ جن کے نام آج بھی تاریخی صفحات پر جگمگاتے ہیں۔

ان تدریسی انجمنوں کے علاوہ اداراتی سطح پر اردو کی ترویج و اشاعت میں علی گڑھ تحریک اور انجمن پنجاب کو مساوی اہمیت حاصل ہے۔ اول الذکر کی کاوشوں کے سبب اس زمانے میں اردو والوں کے لیے نہ صرف عظیم الشان دانش گاہ قائم ہوئی بلکہ مسلمانوں کو ذہنی وفکری طور پر بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ زمانے کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا اہم فریضہ ادا کیا۔ انجمن پنجاب نے جدید نظم اور نیچرل شاعری بالخصوص نظموں کے فروغ کو مد نظر رکھا۔ اور شاعری میں فطرت پسندی کے عناصر سموئے۔ غرض انجمنیں ہوں یا ادارے، ان کے اغراض و مقاصد کچھ بھی ہوں، بہرصورت ان کے پرچم تلے زبان و ادب کو فروغ پانے کا خوب خوب موقع ملتا رہا ہے۔

اردو کے فروغ و ترویج میں ادبی و علمی تحریکیں تو کارفرما رہی ہیں ساتھ ہی ملک کی سیاسی و باغیانہ تحریکوں نے بھی اسے فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ کیوں کہ زبانوں کی تقسیم کے باوجود اہل وطن نے تقسیم سے قبل تک اسی زبان کو اپنے تمام مقاصد کے لیے اپنایا تھا۔ باغیوں، سیاسی رہنماؤں، صحافیوں اور ادیبوں کی کاوشوں نے اس بات کا احساس دلادیا کہ اردو کی محبت ان کے سینوں میں اب بھی موجود ہے۔ اس زبان میں اپنے مقاصد کی ترسیل کرکے اس کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے قومی یگانگت، تہذیبی و ثقافتی اتحاد کا بھی ثبوت پیش کیا۔ حب الوطنی کے اظہار کی خاطر جتنی کاوشیں اس زبان میں ہوئیں کسی اور زبان میں نہ ہوسکیں۔

ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ بازار ہو کہ دربار، خانقاہ ہو کہ میدانِ کارزار' عوام ہوں کہ خواص، ہر سمت، ہر جگہ، ہر کسی نے اسی زبان کو اپنے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا۔ ہر طرح کے ماحول میں جانفشانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اردو زبان نے ہر عہد کا ساتھ نبھایا۔ غزل میں جو پائیداری موجود تھی وہ اردو ہی کی دین تھی۔ یعنی غزل کی طرح اردو زبان بھی سخت جان نکلی۔ یہ تمام واقعات، اور اداراتی سطح کی کاوشیں بہرصورت اردو کے فروغ اور کسی نہ کسی صورت اسے تحفظ دینے میں کار فرما رہی ہیں۔ اس کے لیے حفاظتی اقدامات تقسیم کے بعد تیزی سے کیے جانے لگے۔ اس کا حلقۂ اثر گزرتے وقت کے ساتھ بڑھتا ہی رہا۔ کیونکہ اردو زبان نے خود کو کسی خاص طبقے تک محدود نہ ہونے دیا۔ اسی وصف نے اسے ہر دل عزیزی اور محبوبیت بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی عمر آج تک دراز ہے۔ نئے ملک کے قیام کے بعد وہاں اسے سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ لیکن ہمارے ملک میں اردو زبان پر تقسیم کے بہت برے اثرات واضح ہوئے اور بعض دفعہ تو یہاں تک کہہ دیا گیا کہ اردو اپنے ملک میں اجنبی ہوگئی۔ مگر اس سمت سنجیدگی برتتے ہوئے جتنے بھی اقدامات برتے گئے وہ اس کی ترقی کی جہد پر دال ہیں۔ لوگ تیزی سے تلاشِ معاش کی خاطر غیر ممالک کا رخ کرنے لگے تو ان کے ساتھ اردو بھی دیارِ غیر پہنچ گئی۔ پھر ان علاقوں میں اردو بولنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر اردو میں روزگار کے مواقع بڑھنے لگے جس سے اس کے امکانات کی ایک اور سبیل نکل آئی۔ ان کے قیام کے ساتھ اردو زبان بھی فروغ پانے لگی۔ لوگوں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے ادبی انجمنیں قائم کیں، مشاعروں، مذاکروں اور سیمیناروں کے اہتمام کی طرح ڈالی اور اس طرح اپنی نئی شناخت اردو کی نئی بستی کے نام سے بنائی۔

آج ان خطوں میں اردو نہ صرف بولی جارہی ہے بلکہ وہاں سے اردو میں اخبارات و رسائل' مجلّے اور شعری و نثری مجموعے بھی تواتر کے ساتھ شائع ہورہے ہیں۔ گویا اردو کی یہ نئی بستیاں بھی اردو زبان و ادب کی ترویج

اردو کے فروغ و ترویج میں ادبی و علمی تحریکیں تو کارفرما رہی ہیں ساتھ ہی ملک کی سیاسی و باغیانہ تحریکوں نے بھی اسے فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ کیوں کہ زبانوں کی تقسیم کے بلوجود اہل وطن نے تقسیم سے قبل تک اسی زبان کو اپنے تمام مقاصد کے لیے اپنایا تھا۔ باغیوں، سیاسی رہنماؤں، صحافیوں اور ادیبوں کی کاوشوں نے اس بات کا احساس دلادیا کہ اردو کی محبت ان کے سینوں میں اب بھی موجود ہے۔ اس زبان میں اپنے مقاصد کی ترسیل کر کے اس کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے قومی یگانگت، تہذیبی و ثقافتی اتحاد کا بھی ثبوت پیش کیا۔ حب الوطنی کے اظہار کی خاطر جتنی کاوشیں اس زبان میں ہوئیں کسی اور زبان میں نہ ہو سکیں۔

وترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔اردو زباں کے تئیں ان کی سنجیدگی اور دلچسپی نیک فال اور لائق تحسین ہے۔اردو کی اسی بڑھتی مقبولیت نے ان ممالک میں نئی نسل میں اردو سے متعلق ایسی دلچسپی پیدا کردی ہے کہ ان ممالک میں اردو یونیورسٹی کے قیام کی مانگ کی جارہی ہے۔ یہ اردو زبان کے دور رس اثرات نہیں تو اور کیا ہیں کہ میر و غالب کے اشعار نے غیر ملکیوں کو بھی اپنی طرف مائل کیا۔اور جب کبھی کسی غیر اردو داں سے اپنے شعراء کے کلام سنتے ہیں تو ہم فخر وانبساط سے سرشار ہوجاتے ہیں۔ اس جذبۂ سرشاری کو گلزار کی نظم 'یہ کیسا عشق ہے اردو زباں کا' کے ذیل کے مصرعوں میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے:

عجب ہے یہ زباں اردو
کبھی یونہی سفر کرتے اگر کوئی مسافر
شعر پڑھ دے میر و غالب کا
وہ چاہے اجنبی ہو
یہی لگتا ہے وہ میرے وطن کا ہے

اس طرح ہماری زبان کسی مخصوص طبقے یا علاقے میں سمٹنے کی بجائے آکاش بیل کی مانند پھیلتی ہی گئی۔ اس جہت میں عالمی مشاعرے، مذاکرے، سمینار اور سمپوزیم وغیرہ کا بڑا دخل ہے اور ان اقدامات کو یقینی شکل دینے میں جو سب سے زیادہ محرک ثابت ہوئی وہ جدید تکنالوجی ہے۔

ہر زمانے میں اس زمانے کے تقاضے کے مطابق ادبا و شعرا زبان وادب کی بے لوث خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ اس کے فروغ میں قوموں کے آپسی اختلاط کے ساتھ سائنسی ایجادات بھی اثر انداز ہوئی ہیں۔ سائنسی ایجادات کا حیرت انگیز کرشمہ کمپیوٹر ہے۔سائنسی ایجادات نے نہ صرف ہماری زندگی کو سہل بنادیا ہے بلکہ بے شمار فوائد بخشتے ہوئے ہمارے قیمتی وقت کو بھی ضائع ہونے سے بچالیا ہے۔انفارمیشن تکنالوجی کا انقلاب جب رونما ہوا تو اس نے ہمیں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے وابستہ کردیا۔اس سہولت نے جہاں ہمیں فائدہ پہنچایا وہیں اس سے نقصانات کے اندیشے بھی جڑ پکڑنے لگے تھے۔مثلاً کمپیوٹر کے رواج نے خطوط نویسی کے چلن کو بہت زیادہ متاثر کردیا تھا۔کچھ حد تک تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کی شاندار روایت بالکل اٹھ ہی چکی تھی۔مگر ایسا بالکل بھی نہیں ہوا۔آج بلاگ پوسٹ کی شکل میں لوگ ایک ساتھ دنیا کے کسی بھی کونے سے تاثراتی، علمی وادبی مذاکرے و مباحثے میں شامل ہو رہے ہیں۔ پیغامات کی ترسیل ای میل کی مدد سے پلک جھپکتے ہی ہوجارہی ہے۔ان روشن پہلوؤں کے اعتراف سے کس کافر کو انکار ہے۔موجودہ دور میں کمپیوٹر، ٹیلی فون ایسے ذرائع ابلاغ ہیں جنہوں نے تکنالوجی کی دنیا میں ہلچل مچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ٹیلی فون کی تو اب شکل ہی بدل گئی ہے۔کمپیوٹر کے بعد لیپ ٹاپ، پام ٹاپ اور موبائل فون سائنسی ایجادات کے ایسے کرشمے ہیں جنھوں نے تصورات کو حقیقت کی شکل دے کر لفظ 'ناممکن' کو ہمارے تخیل کے پردے سے ہی محو کردیا ہے۔ انفارمیشن تکنالوجی نے ترقی کرتے ہوئے دنیا کے فاصلے سمیٹ دیے ہیں اور ہم گلوبل ولیج کی اصطلاح استعمال کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ پھر جلد ہی اس نے ترقی کے ایک اور زینے کو عبور کیا جسے الیکٹرونک عہد سے تعبیر کیا گیا۔یہیں سے ڈیجیٹل عہد کا تصور ابھرا اور اب ہم سائبر ایج میں سانسیں لے رہے ہیں۔

کمپیوٹر کی سہولتوں نے اردو والوں کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا۔پھر کیا تھا جلد ہی اردو کا Unicode سسٹم تیار کیا گیا۔جس کے سبب کسی بھی گجیٹ (Gadget) میں اردو زبان کا استعمال سہل ہوگیا۔اور اب تو ہم نے ایسے ایسے سافٹ ویئر بھی ایجاد کرلیے ہیں جن کی مدد سے خوبصورت فونٹس میں اردو کے رسم الخط کا استعمال کرکے ہم کتابیں وغیرہ پرنٹ کرسکتے ہیں۔کمپیوٹر اور انٹرنیٹ آج ہماری زندگی کا اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں۔اب ان کے بغیر زندگی کا تصور ہی ممکن نہیں۔ لمحے بھر میں انگلیوں کی ایک ٹچ سے مطلوبہ تفصیل ومعلومات،مواد کے ترجمے، پیغامات کی ترسیل، آن لائن ایڈیٹنگ، آن لائن ریڈنگ،غرض کہ ہر اہم وغیر اہم معلومات کی مکمل تحصیل، جدید تکنالوجی کا عطیۂ بے بہا ہے۔اس دور میں بھی اردو کا سفر کہیں تھمتا دکھائی نہیں دیتا بلکہ اس دور میں اردو نے بھی اس جدت پسندی سے ہم آہنگی کرلی کیونکہ Survival of the fittest کا کلیہ دنیا کی ہر شے کی طرح زبانوں پر بھی صادق آتا ہے۔یعنی زندہ وہی زبانیں رہتی ہیں جو اپنے زمانے کے تقاضوں سے مطابقت پیدا کرلیں ورنہ ان کا معدوم ہوجانا یقینی ہوجاتا ہے۔بہر حال اردو کی ترقی اس بات میں بھی مضمر ہے کہ اس نے ذرائع ابلاغ کا وسیلہ بننے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہ کی۔اردو کو زندہ رکھنے کے لیے نئے نئے طرز عمل سے کام لیا جانے لگا۔یعنی عالمی طور پر اردو کے فروغ کے لیے اردو کی بیشتر کتابوں کو آن لائن اپلوڈ کردیا گیا، آن لائن ریڈنگ، آن لائن لائبریری وغیرہ کی سہولتیں میسر کرائی گئیں۔اب تو گھر بیٹھے آن لائن ٹیوٹر کی مدد سے اردو سیکھنے کا رواج بھی عام اور مقبول ہو چکا ہے۔انٹرنیٹ کی بدولت مشاہیر ادب کی کمیاب ونایاب کتابوں کو نہ صرف ہم دیکھ سکتے ہیں بلکہ پڑھ بھی سکتے ہیں۔تکنالوجی کا یہ دور اردو کے فروغ میں بڑا ہی سودمند ثابت ہوا ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ایسی صورت میں ہم ببانگ دہل کہہ سکتے ہیں اردو کو جدید تکنالوجی نے بیش بہا فائدے پہنچائے اور اس کی ترویج واشاعت میں کلیدی حیثیت کی حامل بن چکی ہے۔انٹرنیٹ کی سہولت نے عالمی طور پر اردو کے فروغ اور اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں معاونت کی ہے۔اب تو بین الاقوامی سطح پر مشاعرے، مذاکرے وغیرہ آن لائن ہو رہے ہیں جن سے عالمی سطح پر ترسیلی فاصلے مٹ رہے ہیں۔

اسی آپسی اختلاط نے ہماری زبان کے پھلنے پھولنے اور بڑھنے کے مزید امکانات روشن کردیے۔آج عالم یہ ہے کہ ہماری زبان کو عالمی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور اب کسی کو بھی یہ شکایت نہیں کہ ''اردو اپنے وطن میں ہی اجنبی ہے۔'' اس ضمن میں ڈاکٹر مشتاق احمد اپنے مضمون ''اردو زبان: حال اور مستقبل'' میں رقمطراز ہیں:

''اردو زبان کے متعلق ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ اردو صرف شاعری کی زبان ہے، ادب کی زبان ہے لیکن حقیقتاً اردو میں ہر قسم کے علوم وفنون سے متعلق مواد و معلومات کا ذخیرہ موجود ہے۔جدید تر اصطلاحات کی بھی کمی نہیں اور اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے روزگار کے مواقع بھی کم نہیں ہیں۔غرض کہ اردو زبان میں وہ علمی اور فکری سرمایہ موجود ہے جس کی بدولت

ہم اس عالمی گاؤں میں جی سکتے ہیں اوران طاقتوں کواپنی گرفت میں لا سکتے ہیں جن کے ذریعے ہم اپنی لسانی پسماندگی کا ازالہ کرسکیں۔ وہ دن گئے جب اردو میں صرف گل وبلبل کے قصے ہوا کرتے تھے، غم عشق اور غم روزگار کا تذکرہ لکھا جاتا تھا۔ آج اردو کمپیوٹر کی زبان بن چکی ہے، اس میں سائنس، تاریخ فلسفہ، نفسیات، سیاسیات، معاشیات، غرض کہ تمام علمی خزینہ موجود ہیں۔ اس لیے نئی نسل کو، جو اردو سے بیگانہ ہوتی جارہی ہے، اس کو اردو کی تعلیم سے وابستہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور اگر ہماری یہ کوششیں کامیاب ہوجاتی ہیں تو پھر اردو کا حال تابناک رہے گا اور مستقبل بھی قابل فخر ثابت ہوگا۔''

(اردو زبان: حال اور مستقبل، مضمون نگار: ڈاکٹر مشتاق احمد، بحوالہ: اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی وثقافتی فروغ۔ مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین۔ ص 178-177، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2014)

ناظم الدین مقبول نے اپنے مضمون اردو جاب مارکیٹ (بازار اور روزگار) میں اردو زبان سے متعلق یہ پیشن گوئی کی تھی: ''مستقبل قریب میں ہم اردو میں Tweet کرسکیں گے اور Facebook پر بھی اردو کا چلن رائج ہوگا۔'' اب یہ قیاس حقیقت میں تبدیل ہوچکا ہے۔ آج اردو نہ صرف فیس بک اور ٹویٹر کی زبان بن گئی ہے بلکہ بیشتر اپلی کیشنز میں بھی بحیثیت فنکشنل لنگویج کام کررہی ہے۔ اور عالمی طور پر اپنی حیثیت منوا کر اپنے حلقۂ اثر کو طویل سے طویل تر کررہی ہے۔

جنھوں نے ہمارے ادب کا دامن وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ نئے ذہنوں کو سمجھنے اور ادب کا معیار قائم رکھنے کی کامیاب کوششیں کیں اور کررہے ہیں۔ اس ضمن میں ساہتیہ اکاڈمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و دیگر ریاستی سرکاری و غیر سرکاری اداروں کا ذکر ناگزیر ہے۔ جنھوں نے اردو کے فروغ کی خاطر معیاری رسائل جاری کرکے نہ صرف اردو زبان و ادب کی خدمت کا فریضہ انجام دیا ہے بلکہ نئی نسل کو تحقیقی شعور عطا کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس فضا کو خوشگوار بنانے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس نے نہ صرف ریسرچ اسکالرس کی ادبی نشوو نما کی خاطر 'فکرو تحقیق' جیساسہ ماہی رسالہ جاری کیا بلکہ 'بچوں کی دنیا' کے نام سے تربیت طفلاں کی خاطر خوبصورت تفریحی رسالہ پیش کردیا۔ اس ادارے نے عالمی طور پر اردو والوں کو رابطے میں رکھنے کی خاطر اور عالمی عصری تناظر کو سمجھنے کی خاطر 'اردو دنیا' جیسا اہم رسالہ شائع کیا۔

سائنسی ایجادات نے زندگی کو ترقی کے بام عروج پر پہنچادیا ہے۔ یہ ترقی ذرائع ابلاغ کے توسط سے شرمندۂ تعبیر ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا نے اہم کردار ادا کیے ہیں۔ اس زمرے میں اخبارات، رسائل، مجلے اور مجموعے وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر

ہیں۔ جنھوں نے ہمارے ادب کا دامن وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ نئے ذہنوں کو سمجھنے اور ادب کا معیار قائم رکھنے کی کامیاب کوششیں کیں اور کررہے ہیں۔ اس ضمن میں ساہتیہ اکاڈمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و دیگر ریاستی سرکاری و غیر سرکاری اداروں کا ذکر ناگزیر ہے۔ جنھوں نے اردو کے فروغ کی خاطر معیاری رسائل جاری کرکے نہ صرف اردو زبان و ادب کی خدمت کا فریضہ انجام دیا ہے بلکہ نئی نسل کو تحقیقی شعور عطا کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس فضا کو خوشگوار بنانے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس نے نہ صرف ریسرچ اسکالرس کی ادبی نشوو نما کی خاطر 'فکرو تحقیق' جیساسہ ماہی رسالہ جاری کیا بلکہ 'بچوں کی دنیا' کے نام سے تربیت طفلاں کی خاطر خوبصورت تفریحی رسالہ پیش کردیا۔ اس ادارے نے عالمی طور پر اردو والوں کو رابطے میں رکھنے کی خاطر اور عالمی عصری تناظر کو سمجھنے کی خاطر 'اردو دنیا' جیسا اہم رسالہ شائع کیا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ کونسل نے اس ڈیجیٹل دور میں اس کے تقاضوں کے ساتھ بچوں کے ذوق و دلچسپی کا سارا سامان اپنے رسالے میں جمع کردیا ہے۔ اس کے علاوہ 'خواتین کی دنیا' بھی اسی ادارے کی دین ہے۔ مالی تعاون کے ذریعے بھی کونسل دیگر ریاستوں میں اردو کی ترویج میں کوشاں ہے۔

غرض کہ یہ ادارہ نہ صرف اردو کے فروغ کے لیے نئی نئی جہتوں میں کام کررہا ہے بلکہ موجودہ عہد میں اردو کا نیا معیار قائم کرنے میں بھی سرگرداں ہیں۔ اس ادارے نے سب سے پہلے اداراتی سطح پر کمپیوٹر کے ذریعے آن لائن تدریس اردو کا اہم کارنامہ انجام دے کر دنیا کے گوشے گوشے سے شائقین اردو کو زبان سیکھنے کی جانب متوجہ کیا۔ دنیا کے مصروف ترین طالب علموں کے لیے آن لائن اردو سیکھنے کی آسان سبیل پیدا کردی۔ قومی کونسل کا یہ کارنامہ اہم ہونے کے ساتھ ساتھ اردو سکھانے کی راہ میں پہلی اینٹ ثابت ہوا۔ اسی کی پیروی کرتے ہوئے دیگر تمام ریاستوں نے بھی تدریس اردو کی غرض سے سرٹیفائڈ کورس کرانا شروع کردیا۔ اب تو اس کونسل کے اشتراک سے بھی زبانوں کے سکھانے کے سندی کورس کرائے جارہے ہیں۔

خوش آئند بات یہ بھی ہے کہ اب اردو کے بیشتر اخبارات، جرائد، رسالے، اہم شمارے بآسانی انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ یعنی اب پرنٹ میڈیا بھی الیکٹرانک میڈیا کا حصہ بن گئی ہے۔ اردو زبان کو انٹرنیٹ کی سہولتوں سے دور دور پہنچانے میں ریختہ ڈاٹ کام کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس نے نہ صرف قدما کی نثری وشعری تصنیفات کو Ebook کی شکل میں Upload کرکے اردو کے چاہنے والوں کے لیے زندہ جاوید کردیا بلکہ ہر اس آنکھ کو اپنا ممنون بنادیا جو نایاب کتابوں کی دیوانی تھی۔ اردو کے حوالے سے اور بھی ویب سائٹ ہیں لیکن ریختہ ان معنوں میں انفرادیت کا حامل ہے کہ اس سائٹ پر قدیم وجدید تمام شعرا کی تخلیقات، ان کے کوائف، ان کی ویڈیوز تک دستیاب ہیں۔ یعنی یہاں تشنگان شعروادب کی سیرابی کے تمام لوازمات مہیا کردیے گئے ہیں۔ اس ویب سائٹ نے اردو کو غیر اردو داں حلقے میں پہنچانے کی خاطر تین زبانوں کی سہولت بھی دے رکھی ہے مثلاً اردو، انگریزی اور ہندی، تینوں رسم الخط میں آپ کو مطلوبہ معلومات بآسانی

دستیاب ہیں۔ اس سلسلے میں اہم، کمیاب، نادر، کتابیں ریختہ میں اپ لوڈ ہو چکی ہیں، بقیہ اپ لوڈ کے مرحلے میں ہیں۔ جن پر بڑے انہماک کے ساتھ کام کیا جا رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب شائقین اردو اس زبان کے تمام فن پاروں سے ریختہ پر با آسانی مستفیض ہو سکیں گے۔ اداراتی سطح کی یہ کاوشیں واقعی داد و تحسین کی مستحق ہیں۔

اسی طرح الیکٹرانک میڈیا نے بھی اردو زبان کی ترویج میں ہر زمانے میں معاونت کی۔ اس سلسلے میں ہمیں ترسیل کے بڑے اہم ذرائع ریڈیو، ٹی وی اور فلم کی شکل میں ملے۔ برقی وسائل کی مدد سے اپنے مقاصد کی تکمیل کے یہ سب سے دلچسپ ذرائع ثابت ہوئے۔ ریڈیو عالمی طور پہ ذرائع ابلاغ کا سب سے قدیم وسیلہ ہے۔ جو اپنی مقبولیت کے سبب جلد ہی گھر گھر پہنچ گیا تھا۔ ابتدا میں چونکہ ملک میں اردو کا زور تھا لہٰذا اردو زبان میں تمام پروگرامز نشر ہوتے مگر زمانے کی تبدیلی کے سبب لسانی عصبیت نے اس شعبے کو بھی متاثر کیا۔ ٹی وی کی ایجاد نے بہت حد تک یہ تشویش پیدا کر دی تھی کہ اب بس ریڈیو کا دور ختم ہی ہو جائے گا لیکن ریڈیو نے بھی زمانے کا ساتھ دینے کی ٹھانی اور اس کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کر کے ایف۔ ایم کی شکل میں ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ایک بار پھر اس کا نشہ سر چڑھ کر بولنے لگا۔ آج بھی اس کا خمار کچھ کم نہیں۔ اس کی اہم اور خاص بات یہ ہے کہ یہاں چونکہ لہجے کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے لہٰذا لفظوں کے صحیح تلفظ اور کم سے کم جملوں میں اپنے مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے اس لیے اردو کا کثرت سے یہاں استعمال ہوتا ہے۔ خاص بات تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بیشتر ریاستوں میں اردو کے الگ پروگرامز بھی نشر کیے جاتے ہیں۔ مغربی بنگال سے بھی اردو پروگرامز نشر ہوتے ہیں۔ اب تو ریڈیو کے ایسے ایپ بھی دستیاب ہیں جن کی مدد سے دنیا کے کسی بھی کونے میں نشر ہونے والے پروگرامز کو ہم آسانی سے سن سکتے ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ رابطے کے اس ذریعے کو بھی اردو سے ہی توانائی حاصل ہے۔ اردو زبان میں نشریات کے سبب اردو کا فروغ اور تحفظ دونوں حقیقت بن چکے ہیں۔

ٹی وی اور فلموں کے ساتھ بھی کچھ ایسے ہی حالات رہے۔ ابتدائی دور میں مکالمے، نغمے، یہاں تک کہ اشتہار کی زبان میں بھی اردو کا بڑا دخل رہا۔ مگر وہی طرز تغافل جو ریڈیو کے ساتھ برتے گئے یہاں بھی جڑ پکڑنے لگے تھے۔ اس کے بعد اس میڈیم کا جو حشر ہوا وہ سبھی کو معلوم ہے لیکن اس صورت میں گزشتہ دہائی سے بڑی ہی خوشگوار

الیکٹرانک میڈیانے بھی اردو زبان کی ترویج میں ہر زمانے میں معلونت کی۔ اس سلسلے میں ہمیں ترسیل کے بڑے اہم ذرائع ریڈیو، ٹی وی اور فلم کی شکل میں ملے۔ برقی وسائل کی مدد سے اپنے مقاصد کی تکمیل کے یہ سب سے دلچسپ ذرائع ثابت ہوئے۔ ریڈیو عالمی طور پہ ذرائع ابلاغ کا سب سے قدیم وسیلہ ہے۔ جو اپنی مقبولیت کے سبب جلد ہی گھر گھر پہنچ گیا تھا۔

تبدیلی رونما ہوئی ہیں۔ اب پھر سے اردو کے بہترین الفاظ سے مکالمے اور نغموں کو ہم آہنگ کیا جا رہا ہے۔ یعنی ایسے نغمے اب فلموں میں شامل کیے جا رہے ہیں جن کے الفاظ شیرینی بکھیرنے کے ساتھ روح کی تسکین بھی کر جاتے ہیں۔ ایک طرح سے جس شور شرابے نے جس طرح نغمے کی ریڑھ ماری تھی اس کا اب خاتمہ ہو چلا ہے یعنی:

پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

ان خیالات کی وضاحت خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی مندرجہ ذیل آرا سے ہو جاتی ہے:

''......اس کا مطلب یہ ہوا کہ ذرائع ابلاغ کی حیثیت سے اردو زبان کے امکانات روشن ہی نہیں روشن تر ہیں۔ لیکن یہ وہ زبان ہے جو معرب اور مفرس نہیں بلکہ عام فہم اور سلیس و سہل ہے۔ آج کے کثیر لسانی معاشرے میں ایسی ہی زبان چلے گی جس کی رسائی عوام تک ہے۔ اب اکیسویں صدی میں میڈیا کے ان تقاضوں اور وقت کے مطالبات کو سامنے رکھ کر اگر اردو کے فروغ کی جانب مناسب توجہ دی گئی تو خود اردو زبان میں پوشیدہ وسعت امکان اور تنوع اس کی عالمگیر مقبولیت کا ضامن ہوں گے۔''

(اکیسویں صدی میں الیکٹرانک میڈیا کے تقاضے اور اردو، بحوالہ: اردو زبان کے نئے تکنیکی وسائل اور امکانات، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، ص59، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 2012)

ریاستی سطح پر اردو کی ترویج کی خاطر سرکاری اسکولوں میں سہ لسانی منصوبے کے تحت اردو کو بھی بحیثیت زبان نصاب کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ تاکہ یہ زبان نہ صرف ترقی پاتی رہے بلکہ موجودہ نسل اور آنے والی نسلیں اپنی تہذیبی وراثت سے محروم نہ رہ جائیں۔ اس حوالے سے بنگال، بہار، حیدرآباد اور آندھرا پردیش کے کئی علاقوں میں اردو کی حالت بہت اچھی ہے۔ یہاں اس زبان کو دوسری سرکاری زبان کی طرح حق حاصل ہے۔ ان ریاستوں نے نہ صرف اردو کا معیار بلند کیا بلکہ غیر اردو داں طبقے کو بھی اردو کی طرف مائل کر دیا ہے۔ ان علاقوں میں اردو کا حال روشن اور مستقبل تابناک ہے۔

آج کے ڈیجیٹل دور میں جبکہ تعلیم و تدریس سے لے کر تمام شعبہ ہائے حیات ڈیجیٹلائز ہو چکی ہیں۔ اسی طرح ہماری زبان بھی ان عوامل سے پرورش و پرداخت پا رہی ہے غرض یہ کہ ٹکنالوجی کے پروں پر سفر کرتے ہوئے ہماری زبان نے ایسا مقام حاصل کر لیا ہے کہ اس کا مستقبل سنہرا ہی سنہرا ہے۔

انٹرنیٹ کی آمد سے نہ صرف عالمی طور پر اردو زبان کی اشاعت ہوئی بلکہ اس کی شناخت بھی قائم ہوئی۔ آج دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ اردو زبان اور اس کے اشعار سے محظوظ ہو رہا ہے۔ اردو رسم الخط کے حوالے سے یہ تشویش بھی ظاہر کی گئی کہ اب اس کا چلن بھی ختم ہو جائے گا۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ایسا کہنا غلط ہے کیونکہ اکثر و بیشتر یہ دیکھا گیا ہے کہ سوشل میڈیا پر لوگ اردو رسم الخط میں اپنے مقاصد کے ساتھ ساتھ دوسری زبان میں اس کے تراجم بھی پوسٹ کر دیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف اردو، اپنے زبان والوں میں مقبول ہو رہی ہے بلکہ غیر اردو داں بھی اس کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ گلوبل ولیج، سائبر اسپیس، یہ سب اس وسیلے کی دین ہیں۔ سمٹتے ہوئے فاصلوں نے قاری اور ادب کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا کہ زبان کی ترقی کو مضبوط پنکھ لگ گئے نیز عصری تناظر میں اس کی اڑان کے ضامن بھی بن گئے۔ انٹرنیٹ ہماری زبان کے حق میں جو رول ادا کر رہا ہے اس کے لیے ہمیں ٹکنالوجی کا شاکر ہونا ہی پڑے گا۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ عصری تناظر میں زبان اردو اپنی ممکنہ جہات تک پہنچ چکی ہے۔ ان جہات کا سفر کافی پر پیچ تھا، دشوار ترین مراحل اور ناہمواریوں کو پاٹتے ہوئے، عصری تقاضوں سے ہم آہنگی برتتے ہوئے ہماری زبان آج دنیا کے گوشے گوشے میں نہ صرف شان سے سانس لے رہی ہے بلکہ اشاعتی سلسلے سے اپنی تابندگی کا ثبوت بھی فراہم کر رہی ہے۔ پوری دنیا میں آج کیا اردو داں اور غیر اردو داں، سب ہی اس سے مستفیض ہو رہے ہیں اور ادب کی خدمت انجام دیتے ہوئے اس کے تحفظ کو نقش ایقان بخش رہے ہیں۔ عالمی منظر نامے میں اردو کی صورت حال کافی خوشگوار ہے جس سے اس کی ترقی اور تحفظ کے امکانات روشن ہیں۔

■

Sadia Sadaf
67, Maulana Shaukat Ali Street (Colootola Street)
Kolkata - 700073 (West Bengal)
Mob.:9831365693

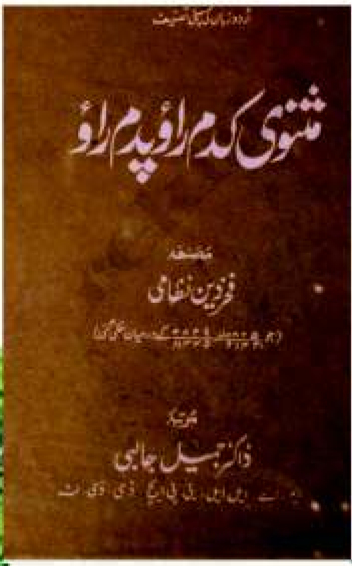

ساجد ممتاز

مثنوی کدم راو پدم راو اور مشترکہ تہذیب

ہندوستان ہمیشہ سے ایک ایسا ملک رہا ہے جہاں مختلف تصورات و اعتقادات کو ماننے والے اپنے حسنِ عمل اور حسنِ اخلاق سے ایک دوسرے کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ مختلف نوابین اور سلاطین کے عہد میں لوگ بلا تفریق مذہب و ملت ہر فرقے، طبقے، مذہب اور زبان کے افراد آزادانہ اور خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ کسی طبقے، مذہب یا زبان کو کوئی خاص فوقیت یا افضلیت حاصل نہ تھی اور نہ ہی کوئی سماجی اعتبار سے ادنیٰ و اعلیٰ مقام پر فائز تھا۔

اردو شاعری نے جب ہندوستان کے ایسے معاشرے میں آنکھیں کھولیں تو اپنے گرد و نواح میں مختلف رنگوں اور قسموں کے پھول دیکھے جو مختلف قسم کی خوشبوؤں سے مزین تھے۔ اردو شاعری نے اسے ایک ہی لڑی میں پرو کر نہایت دلکش و دلفریب گلدستہ تیار کیا۔ یہ مختلف رنگوں کے پھول آپس میں مل کر ایک نئی تہذیب کی شکل میں رونما ہوئے جسے گنگا جمنی تہذیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہی گنگا جمنی تہذیب اس ملک کی خوبصورتی ہے۔

چودھویں صدی میں شمالی اور جنوبی ہند کی تہذیب کا حسین سنگم ہوا۔ جس نے گنگا جمنی تہذیب کو مزید وسعت بخشی۔ یہی وہ دور تھا جب اردو ادب میں گنگا جمنی تہذیب کے نقوش تیزی سے رونما ہو رہے تھے۔ شمالی و جنوبی تہذیب کے اس حسین سنگم سے ایک نئی تہذیب وجود میں آئی جس پر عربی، ایرانی، آریائی اور دراوڑی اثرات نے چار چاند لگا دیے۔ اس تہذیب سے ایک نیا ادب وجود میں آیا جو اپنے اندر اتحاد اور قومی یکجہتی پیدا کرنے کی عظیم قوت رکھتا ہے۔ اس گنگا جمنی تہذیب میں ایک قوم کی تہذیبی لہر دوسری قوم کی تہذیبی لہر کے ساتھ مل کر بہہ رہی ہے۔ آج بھی ہندوستان کے مختلف رسم و رواج اور عقائد ایک دوسرے میں جذب ہو کر ایک دلچسپ اور دل کش فضا کی تخلیق کر رہے ہیں۔

جب علاء الدین بہمن شاہ نے دکن میں خود مختار بہمنی سلطنت کا آغاز کیا، اس وقت اردو زبان گنگا جمنی تہذیب کے ساتھ اپنا ارتقائی سفر طے کر رہی تھی۔ البتہ اس وقت اسے دکھنی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ شمالی ہند سے آئی ہوئی اس زبان کو دکھنی کہے جانے کی غالباً سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان بہت جلد ہی دکنی رسم و رواج، عقائد اوہام اور مذہب و تہذیب کی عکاس بن گئی۔ عوام و خواص نے اسے اپنے سینے سے لگایا اور دکنی کے نام سے پکارنے لگے۔ چونکہ اردو شاعری کے خمیر میں گنگا جمنی تہذیب رچی بسی ہے اس لیے ہمیشہ یہ عوام کے دلوں کی دھڑکن بنی رہی۔

علاء الدین بہمن شاہ، محمد بن بہمن شاہ، علاء الدین مجاہد شاہ، داؤد شاہ، محمد شاہ ثانی، غیاث الدین، شمس الدین داؤد شاہ ثانی، تاج الدین فروز شاہ، شہاب الدین احمد شاہ اول، علاء الدین احمد شاہ ثانی، علاء الدین ہمایوں شاہ، احمد شاہ ثالث، شمس الدین محمد شاہ ثالث، محمد شاہ، احمد شاہ رابع، علاء الدین ولی اللہ اور کلیم اللہ نے دکن کی تہذیب و معاشرت اور ادب و سیاست میں اتحاد و اشتراک پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔

بہمنی سلاطین نے مقامی روایات کی حوصلہ افزائی کی۔ جنگ و جدل سے ہونے والی نا اتفاقی، اختلافات اور دشمنی سے پرہیز کرتے ہوئے اپنے ملک میں ایک ایسی تہذیب اور ایک ایسے معاشرے کی بنیاد ڈالی جو مشترک تھی۔

بہمنی سلاطین کی پیروی میں اس عہد کے شعرا نے بھی انھیں موضوعات، تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور الفاظ کا استعمال اپنی تخلیق میں کیا ہے جن میں مشترکہ تہذیب کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ دکن کے ابتدائی شعرا نے تصوف اور اخلاق کی درستگی پر بھرپور زور دیا۔ بعض شعرا نے فلسفیانہ اور تمثیلی موضوعات پر اپنا زور قلم صرف کیا تو بعض نے عشقیہ داستانیں اور رزم ناموں کے ذریعے اپنی شاعری کو جلا بخشی۔ شیخ عین الدین گنج العلم، سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور عبداللہ حسینی، میراں جی شمس العشاق وغیرہ نے تصوف و اخلاق جیسے سنجیدہ موضوعات کو نظم ونثر کے ذریعے پیش کیا۔

ان شعرا کے بر خلاف فخرالدین نظامی نے جو سلطان احمد شاہ ثالث بہمنی کے عہد کا شاعر ہے، مذہبی اور صوفیانہ موضوعات سے ہٹ کر ایسے نصیحت آمیز قصے پیش کیے جو عجیب وغریب اور دلچسپ و دلکش ہیں۔ دکنی ادب میں مثنوی نے سب سے زیادہ فروغ پایا اور اپنے اندر وسیع النظر ہندوستانیت کا تصور پیدا کیا۔

نظامی بیدری کی مثنوی 'کدم راو پدم راؤ' کا شمار اردو ادب کی اولین مثنوی میں ہوتا ہے۔ نظامی نے اس مثنوی میں انسان کی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی تصویر کشی یوں کی ہے کہ یہ مثنوی چند افراد کے تجربات کا عکس نہ ہو کر زندگی کے پیچ وخم کا ایک ایسا مرقع بن گئی ہے جو ہمیں حقائق سے دو چار کرنے کا نیا حوصلہ عطا کرتی ہے اور مل جل کر زندگی جینے کا طریقہ سکھاتی ہے۔ اس مثنوی کے ماخذ کو قدیم ہندی افسانوی ادب سے متاثر بتاتے ہوئے ڈاکٹر مونس لکھتے ہیں:

''تبدیلی قالب کا تصور اصل میں ہندو عقیدہ تناسخ سے ماخوذ ہے۔ تناسخ میں بہر حال روح ایک جسم چھوڑ کر دوسرے جسم میں جاتی ہے چونکہ ہندی مصنف عقیدۂ تناسخ پر ایمان رکھتے تھے اسی لیے انہوں نے تبدیلی قالب کو اپنی ادبی تصانیف میں جگہ دینی شروع کر دی۔ وہیں سے اردو ادب میں یہ مستعار لیا گیا۔

مثنوی کدم راو پدم راو میں شہزادے کے جسم میں وہی جوگی داخل ہو جاتا ہے جس نے شہزادے کو یہ فن سکھایا تھا۔ وکرم کی محولہ بالا اصل کتھا (بیتال پچیسی) میں بھی یوگی ہی شہزادے کے جسم میں اپنی روح لے جاتا ہے۔ کدم راو پدم راو کا ماخذ وکرم کی ہی کتھا نظر آتی ہے۔ اس طرح اردو کی اس قدیم ترین مثنوی کا مرکزی تصور قدیم ہندی افسانوی ادب سے متاثر ٹھہرتا ہے۔''[1]

مثنوی کا قصہ مختصراً یہ ہے کہ کدم راؤ راجہ ہے اور پدم راؤ اس کا وزیر ہے۔ پدم راؤ ایک ناگ ہے جس کے سر پر کدم راؤ کی عنایت سے اب پدم بھی موجود ہے۔ ایک دن راجہ کدم راؤ دیکھتا ہے کہ ایک ناگن جو بڑے ذات کی ہے ایک نیچ ذات کے سانپ کوڑیال سے میل کھا رہی ہے۔ راجہ یہ دیکھ کر آگ بگولا ہو جاتا ہے اور کوڑیال کو قتل کر دیتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد عورت ذات سے اس کا بھروسہ اُٹھ جاتا ہے اور وہ جوگیوں کی صحبت اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پدم راؤ کے لاکھ سمجھانے اور منع کرنے کے بعد بھی وہ جوگیوں اور سنیاسیوں کی صحبت اختیار کر لیتا ہے۔ اکھر ناتھ نامی جوگی نے اسے بڑے کمالات دکھائے اور راجا کی فرمائش پر روح کو کسی دوسرے جسم میں منتقل کرنے کا منتر سکھایا اور ایک بار اکھر ناتھ جوگی اسے فریب دے کر خود اس کے جسم میں اپنی روح کو منتقل کر دیتا ہے اور راجہ کدم راؤ طوطا بن جاتا ہے۔ پدم راؤ راجا کو پہچان لیتا ہے اور جوگی کو جواب راجا کدم راؤ کے جسم میں رہ کر حکومت کر رہا تھا کاٹ لیتا ہے اور اسی وقت منتر کے زور سے کدم راؤ اپنی روح کو دوبارہ اپنے جسم میں منتقل کر کے اپنا راج پاٹ سنبھال لیتا ہے۔

اس مثنوی کی بنیاد گویا تبدیلی قالب کے افسانے پر ہے۔ روح کا ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہونا ہندو دیو مالائی اثرات ہیں اور نظامی بیدری نے مثنوی میں اس قصے کو نظم کر کے ہندو کلچر سے متاثر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ سنسکرت ادب کے لوک گیتوں اور لوک کتھاؤں میں اس طرح کی کئی مثالیں موجود ہیں جس میں تبدیلی قالب کے واقعے کو پیش کیا گیا ہے۔

مثنوی میں سنیاسیوں اور جوگیوں کے مکر وفریب کے ساتھ ساتھ ان کی ہوس کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ ان کے مکر وفریب پر وفاداری و دیانت داری بلکہ سادگی اور سچائی کی فتح دکھائی گئی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اردو کی پہلی مثنوی ہونے کے باوجود نہ یہ فارسی کی کسی مثنوی کا ترجمہ ہے نہ سنسکرت کے کسی قصے کا۔ بلکہ یہ ایک طبع زاد مثنوی ہے۔ جس میں اپنے دور کی روایت اور اپنے دور کے اسالیب سے آزادانہ استفادہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کے اسلوب کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس پر ہندی روایت کا اثر گہرا ہے۔

اس مثنوی کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اردو کے پہلے مثنوی نگار فخرالدین نظامی نے ایک ایسا قصہ چنا جس کے تمام کردار غیر مسلم ہیں اور جس کی تہذیبی فضا کے ساتھ ساتھ فکری فضا بھی ہندوستانی روایات سے منسلک ہے۔ اس مثنوی کا قصہ بہ یک وقت دو سطحوں پر دو مختلف آویزش کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ ناگن اور کوڑیال کے قصے میں طبقاتی اور ذات پات کی ناہمواری کا ذکر ہے۔ اونچی ذات کی ناگن کا چھوٹی ذات کے سانپ کوڑیال کے ساتھ میل کھانے کو راجا برداشت نہیں کر پاتا اور جوگیوں وسنیاسیوں کی صحبت میں رہنے لگتا ہے جو اس کے مطابق ہوس سے دور ہیں اور اشرافیہ کا اعلیٰ ترین حصہ

شاعر نے مثنوی میں عوام کو یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ ذات پات اور اونچ نیچ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ در اصل کوئی بھی شخص اونچی ذات سے نہیں بلکہ اچھے اعمال سے ہی بلند و بالا مقام حاصل کرتا ہے اور جس شخص کے اندر بے ایمانی اور لالچ ہے وہ کبھی اچھا انسان نہیں بن سکتاخواہ وہ کتنی ہی بڑی ذات کا کیوں نہ ہو۔ لہٰذا مثنوی کدم راو پدم راو میں نظامی بیدری نے جہاں ایک طرف ہندو دیومالا کو مثنوی میں شامل کیا ہے وہیں دوسری طرف اسلام کے اس نظریے کو بھی ملحوظ خاطر رکھا کہ اس روئے زمین پر ہر انسان برابر ہے خواہ وہ کسی بھی ذات کا ہو اور یہی گنگا جمنی تہذیب کا امتیاز ہے۔

مثنوی میں سنیاسیوں اور جوگیوں کے مکر و فریب کے ساتھ ساتھ ان کی ہوس کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ ان کے مکر و فریب پر وفاداری و دیانت داری بلکہ سادگی اور سچائی کی فتح دکھائی گئی ہے۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ اردو کی پہلی مثنوی ہونے کے باوجود نہ یہ فارسی کی کسی مثنوی کا ترجمہ ہے نہ سنسکرت کے کسی قصے کا۔ بلکہ یہ ایک طبع زاد مثنوی ہے۔ جس میں اپنے دور کی روایت اور اپنے دور کے اسالیب سے آزادانہ استفادہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کے اسلوب کی نشاندھی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس پر ہندی روایت کا اثر گہرا ہے۔

ہیں۔اس کے باوجود اکھر ناتھ جوگی جو اعلیٰ ترین ذات کا جوگی ہے اپنے مکر و فریب کے ذریعے راجہ کدم راؤ کی حکومت ہی نہیں اس کا جسم تک چھین لیتا ہے۔

شاعر نے مثنوی میں عوام کو یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ ذات پات اور اونچ نیچ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ دراصل کوئی بھی شخص اونچی ذات سے نہیں بلکہ اچھے اعمال سے ہی بلند و بالا مقام حاصل کرتا ہے اور جس شخص کے اندر بے ایمانی اور لالچ ہے وہ کبھی اچھا انسان نہیں بن سکتا خواہ وہ کتنی ہی بڑی ذات کا کیوں نہ ہو۔لہٰذا مثنوی کدم راو پدم راو میں نظامی بیدری نے جہاں ایک طرف ہندو دیومالا کو مثنوی میں شامل کیا ہے وہیں دوسری طرف اسلام کے اس نظریے کو بھی ملحوظ خاطر رکھا کہ اس روئے زمین پر ہر انسان برابر ہے خواہ وہ کسی بھی ذات کا ہو اور یہی گنگا جمنی تہذیب کا امتیاز ہے۔

مثنوی کدم راو پدم راو میں اُس ہندوستانی عورت کے احساسات و جذبات کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے جو اپنے شوہر کو خود سے زیادہ محبت کرتی ہے۔ راجہ کدم راو جب ناگن اور کوڑیال سانپ کو میل کھاتے دیکھتا ہے تو اس کا بھروسہ ناگن کے ساتھ ساتھ تمام عورت ذات سے بھی اُٹھ جاتا ہے۔یہاں تک کہ اب اس کا بھروسہ رانی پر بھی نہیں رہتا۔ایسی حالت میں راجہ ایک قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اُس وقت اس کی رانی اس کے پاس آتی ہے اور اپنے شوہر کے پیروں کو آہستہ آہستہ دبانے لگتی ہے تا کہ وہ اس کی باتوں کو آرام سے سنے اور سکون سے اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

رانی کے کردار کے ذریعے نظامی نے یہ بتانے کی کوشش بھی کی ہے کہ ہندوستانی عورت اپنے آبرو کی حفاظت کس طرح سے کرتی ہے۔ جوگی اکھر ناتھ جب کدم راو کے جسم میں اپنی روح کو منتقل کر لیتا ہے تو ظاہری طور پر وہ راجہ ضرور ہوتا ہے لیکن حقیقتاً اور فطرتاً وہ جوگی ہی رہتا ہے۔ غالباً رانی یہ بات سمجھ جاتی ہے کہ راجہ کے قالب میں کوئی اور شخص ہے اسی لیے راجہ کے قالب میں موجود جوگی کی تمام کوششوں کے باوجود رانی اسے اپنے ارد گرد پھٹکنے بھی نہیں دیتی۔ اس طرح اس مثنوی میں ہندوستانی عورتوں کے پاکیزہ احساسات و جذبات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

فخر الدین نظامی نے مثنوی 'کدم راو پدم راؤ' کی شروعات حمد سے کی ہے جس میں انہوں نے خالق دو جہاں کے لیے گسائیں، کرتار اور رام وغیرہ جیسے نام استعمال کیے ہیں جو دو قوم کے تہذیبی سنگم کی نشاندہی کرتا ہے۔

رانی کے کردار کے ذریعے نظامی نے یہ بتانے کی کوشش بھی کی ہے کہ ہندوستانی عورت اپنے آبرو کی حفاظت کس طرح سے کرتی ہے۔ جوگی اکھرناتھ جب کدم راو کے جسم میں اپنی روح کو منتقل کر لیتا ہے تو ظاہری طور پر وہ راجہ ضرور ہوتا ہے لیکن حقیقتاً اور فطرتاً وہ جوگی ہی رہتا ہے۔ غالباً رانی یہ بات سمجھ جاتی ہے کہ راجہ کے قالب میں کوئی اور شخص ہے اسی لیے راجہ کے قالب میں موجود جوگی کی تمام کوششوں کے باوجود رانی اسے اپنے ارد گرد پھٹکنے بھی نہیں دیتی۔ اس طرح اس مثنوی میں ہندوستانی عورتوں کے پاکیزہ احساسات و جذبات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ہندو مذہب کے ماننے والوں کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ جو شخص اپنی پیشانی پر صندل اور کستوری لگاتا ہے اس کا نام زمانے میں روشن ہو جاتا ہے،لوگ اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور شہرت اس کے قدم چومتی ہے۔مثنوی کدم راو پدم راو میں ایک جگہ وزیر'پدم راؤ'راجہ 'کدم راؤ'سے اپنی پیشانی پر کستوری اور صندل لگانے کے لیے التجا کرتا ہے تا کہ زمانے کے لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کا احترام کریں۔

کدم راو سر کھنڈ کستوری مل
پدم سیس پرہت دھریا ادھل

جوگی اکھر ناتھ جب کدم راو کو تبدیل قالب کا علم سکھاتا ہے تو اسی وقت مندر کا کلش ٹوٹ کر زمین پر گر جاتا ہے۔ ہندو عقیدے کے مطابق یہ شدید ترین بد شگونی ہے۔ مثنوی میں اس عقیدے کا بیان انتہائی متاثر کن طریقے سے کیا گیا ہے جس سے اس مثنوی میں مشترکہ تہذیب کے عناصر کو صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

اکھر نات منتر سکھایا رہیں
یکا یک پڑیا توٹ مندر کلس

جتائی بہت او سگن راؤ کوں
نہ پوچھیا کیے راؤ اس بھاؤ کون

نظامی نے اس مثنوی میں ہندو مذہب سے متعلق دیومالائی تلمیحات کا استعمال بھی بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے۔رام، لکشمن، ہنومان، راون، ارجن، بھیم اور سہدیو جیسی تلمیحات کی عکاسی نظامی کی مشترکہ تہذیب سے دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے۔

کروں بن کنک ہوں سو کج تج کام
نہ ہنونت سکے نہ لکھن نہ رام

دھرم بھیو سہدیو سہدیو ارجن چنگل
اکنگی کروں پانچ پانچ پانڈو کھاکل

مثنوی کدم راو پدم راو کی زبان بھی دکنی مشترکہ تہذیب کی خوب صورت مثال ہے۔اس مثنوی میں عربی، فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ ٹھیٹ ہندی زبان کے الفاظ جیسے رتن، بھنڈاری، گگن، تن، جیو، چھانوں، سنسار، کرتار، ابھنگ، بھجنگ، کنور، ناگ، ناگنی، سور، چندر، اکاس، امر بدیا، منتر، مندر، کلش، بچن، دھن، بُدھ وغیرہ کا استعمال بھی ہوا ہے۔اس کے علاوہ مقامی زبان کے الفاظ کو بھی موقع کی مناسبت سے شامل کیا گیا ہے۔ الفاظ و زبان کے سلسلے میں جمیل جالبی مثنوی 'کدم راو پدم راؤ' کے مقدمہ میں اپنے خیال کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اس مثنوی میں بیک وقت کھڑی، پنجابی، راجستھانی، برجی، سندھی، گجری، سرائیکی اور مرہٹی کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں.... وہ قدیم زبان جو اس مثنوی میں استعمال ہوئی ہے اس میں صدیوں کے میل جول سے متعدد زبانوں کا خون شامل ہے اور اسی خاندانی شباہت کی وجہ سے مختلف زبانیں بولنے والے اسے اپنی زبان سے قریب تر پاتے ہیں۔"[2]

اس طرح ملک میں گنگا جمنی تہذیب، بھائی چارگی اور اتحاد کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے جہاں بہت سے طریقے عمل میں لائے گئے ہیں وہیں اردو شعرا نے بھی اپنی شاعری کے ذریعے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔جس میں فخر الدین نظامی کا نام ناقابل فراموش ہے۔

حوالے

1) ڈاکٹر پرکاش مونس: اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر، ص 171، شاہین پبلی کیشنز، الہ آباد، 1978

2) مثنوی کدم راو پدم راو: مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی، ص 35-36، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1979

■

Sajid Mumtaz
Ph.D Research Scholar, Dept of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Mob.:9616227262

غبارِ خاطر: ایک مطالعہ

محمد ریحان

'غبار خاطر' مکتوب نگار مولانا ابوالکلام آزاد کا مکتوب الیہ حبیب الرحمٰن خان شیروانی کو لکھے گئے خطوط کا مجموعہ ہے۔ 'غبار خاطر' کے دیباچے میں مذکور ہے کہ اس کا عنوان میر عظمت اللہ بے خبر کے رسالہ غبار خاطر سے مستعار ہے۔ غبار خاطر میں درج خطوط کی تعداد 24 ہے۔ مجموعے میں دوسرا اور تیسرا خط کشمیر کی وادیوں میں دوران علالت لکھا گیا ہے۔ چوتھا گرفتاری کے بعد دوران سفر لکھا گیا ہے۔ پہلا خط شملہ سے 27 جون 1945 کا مجموعے کی تمہید کے لیے موزوں ہے۔ اس کے علاوہ 10 اگست 1942 سے 16 ستمبر 1943 تک کے خطوط قلعہ احمد نگر کی سنگی دیواروں میں محبوسی کے دوران لکھے گئے ہیں۔ مجموعے میں کچھ خطوط اپنے عناوین رکھتے ہیں، جن کے نام یوں ہیں۔ مکتوب سرینگر، مکتوب نسیم باغ، مکتوب سفر، داستان بے ستون وکوہ کن، حکایتِ بادہ وتریاک، حکایتِ زاغ وبلبل، چڑیا اور چڑے کی کہانی۔ یہ عنوان ہی ناقدین ادب کے درمیان خلط مبحث کا نتیجہ بنے اور مختلف آراء سامنے آئیں۔ جیسے مضامین کا دفتر، انشائیہ کا مجموعہ، خود کلامی، خود نوشت کی خوبیوں کا پایا جانا وغیرہ۔ جبکہ مختلف جگہوں پہ مکالماتی تحریر 'غبار خاطر' کے خطوط کے ہونے پر دال ہیں۔

''کل گلمرگ سے روانہ ہو رہا تھا کہ ڈاک آئی اور اجمل خان صاحب نے آپ کا مکتوب منظوم حوالہ کیا۔ کہہ نہیں سکتا کہ اس پیام محبت کو دل دردمند نے کن آنکھوں سے پڑھا اور کن کانوں سے سنا..... ان سطور کو آئندہ خامہ فرسائیوں کی تمہید تصور کیجیے۔ رہائی کے بعد جو کہانی سنانی تھی وہ ابھی تک نوک قلم سے آشنا نہ ہو سکی۔''

(غبار خاطر: مولانا ابوالکلام آزاد، خط نمبر 2، ص 5)

واقعہ یوں ہے کہ غبار خاطر پڑھنے سے پہلے میرے خیالات یہ تھے کہ مولانا نے اپنے رفیق حبیب الرحمٰن خان شیروانی المعروف صدیق مکرم کو خط لکھا ہے۔ اس میں اپنے دوست کے گھریلو حالات پوچھے اور لکھے ہوں گے۔ لیکن جیسے جیسے مطالعہ کرتا گیا۔ میرے ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ دنیا ہی بدلی نظر آئی۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ غبار خاطر کے کس پہلو پر بات کی جائے۔ چونکہ علمی پہلو سے غبار خاطر 'کوزے میں سمندر' کے مصداق ہے۔ بات بات میں جہد مسلسل کی دعوت ہے۔ بہ ظاہر یہ ایک خاص شخص کے لیے لکھے گئے خطوط ہیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ 27 جون 1945 کو لکھا گیا یہ خط اس سے قبل لکھے گئے خطوں کی تمہید کے طور پر درج کیا گیا ہے:

''دل حکایتوں سے لبریز ہے، مگر زبان درماندہ فرصت کو یارائے سخن نہیں مہلت کا منتظر ہوں''

(غبار خاطر: مولانا ابوالکلام آزاد، خط نمبر 1، ص 3)

دوسرے خط کا آغاز خرابی طبیعت سے ہوتا ہے۔ اس میں ان کے اپنے علاج کا بیان تعجب خیز ہے۔ ذومعنی جملہ ہے۔ انتہائی لطیف انداز، پہلے ہی جملے سے یہ بات نکلتی ہے کہ انسانی زندگی جدو جہد سے عبارت ہے۔ صرف ہم ہی نہیں ہمارے ماضی میں بھی لوگ جدو جہد کرتے رہے ہیں۔ قارئین کے لیے چند جملے ملاحظہ ہوں:

''زندگی کے مقصد میں بہت سی جستجوئیں کیں تھیں، لیکن اب ایک نئی متاع کی جستجو میں مبتلا ہو گیا ہوں، یعنی اپنی کھوئی ہوئی تندرستی ڈھونڈ رہا ہوں۔ معالجوں نے وادی کشمیر کی گل گشتوں میں سراغ رسانی کا مشورہ دیا تھا..... متاع گم گشتہ کا سراغ نہیں ملا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہاں فیضی نے بھی بار عیش کھولا تھا۔''

(غبار خاطر: مولانا ابوالکلام آزاد، خط نمبر 2، ص 4)

جہاں تک غبار خاطر کا سوال ہے تو اسے ہم اردو ادب میں مختلف النوع طرز کا انسائیکلو پیڈیا بھی کہہ سکتے ہیں۔ جیسے وادی کشمیر کی روح پرور صبح کی منظر نگاری ہو یا قلعہ احمد نگر میں نظر بند ہونے کا واقعہ اور قلعے کے تاریخی حقائق پر پرت در پرت انکشاف، چائے کے مسائل کہ کن کن حصوں میں چائے کی تاثیر کیا ہے، چائے کی ابتدا تا انتہا، معمولی معمولی باتوں کے درمیان دقیق سے دقیق مسائل پر مباحث کے دروازے کھول دینا، بچپن میں جاگنے کی جدو جہد یا والد کے معتقدین سے ملنے کا ذکر، مرسل الیہ کو مخاطب کرنے کا دلکش انداز۔ کہیں تصوف کے مسائل تو کہیں منطق و ریاضی کے شگوفے، کہیں فلاسفہ یونان کا ذکر ہے۔ موسیقی میں دلچسپی اس حد تک کہ ارکان موسیقی سے رمز آشنائی قاری کے لیے حیران کن ہے۔ اس کے علاوہ یورپ وامریکہ کے تازہ ترین مآثر کا مطالعہ یا خدا پرستی کے ارتقائی پہلو پر مباحث، کس پہلو پر گفتگو کی جائے؟ کارِ مشکل ہے۔ انانیتی ادب کے حوالے سے

مولانا آزاد ہی کا نقل کیا ہوا میر انیس کا شعر جذبات کی ترجمانی کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے۔

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

مولانا نے خطوط کے اس مجموعے میں کیا کچھ لکھ دیا ہے۔ اگر انھیں کچھ اور وقت ملتا تو ان کے نثری جواہر پاروں سے نہ جانے اور کتنے شگوفے پھوٹتے۔ مولانا کے 24 خطوط میں 9 خط زندگی کی جدو جہد بھرے کوچے میں ایک جملہ بار بار دہرا رہے ہیں۔ وہ یہ کہ ''وہی چار بجے کا جانفزا وقت ہے' ایک خط میں لکھتے ہیں کہ '' صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں۔'' ان 24 خطوط میں 10 خطوط اس بات کے غماز ہیں کہ مولانا کے نزدیک صبح کی کیا اہمیت ہے۔ ورنہ آج کے مشینی دور میں کون یہ جانتا ہے کہ صبح میں بھی ساڑھے تین بجتا ہے۔ صبح کی کرشمہ سازیاں کیا ہیں؟ بہ قول مولانا آزاد:

''صبح چار بجے کے گرانمایہ وقت کی کرشمہ سازیوں کا بھی کیا حال ہے! قیام کی حالت ہو یا سفر کی، ناخوشی کی کلفتیں ہوں یا دل آشوبی کی کاہشیں، جسم کی ناتوانیاں ہوں یا دل و دماغ کی افسردگیاں کوئی حالت ہو لیکن اس وقت کی سچائیاں افتادگان بستر والم سے کبھی تغافل نہیں کرسکتیں''

(غبار خاطر: مولانا ابوالکلام آزاد، خط نمبر 2، ص 4)

مولانا اپنے خطوط میں اس بات کا پیغام دیتے ہیں کہ نظر مقصد پر رکھنی چاہیے۔ مولانا اپنے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بڑی آہستگی سے انسانی نفسیات کے مضرابی تاروں کو چھیڑ دیتے ہیں۔ اور بڑی ہنر مندی کے ساتھ اپنے نوک قلم کے ذریعے انشائی پیرائے میں طالب علم کو بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ 'جب دنیا جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں' سحر کے وقت پڑھنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ دل کی انگیٹھی ہمیشہ گرم رہنے لگی اور صبح کی اس تھوڑی مہلت میں تھوڑی آگ جو سلگ جاتی ہے۔ اس کی چنگاری کبھی بجھنے نہیں پاتی راکھ کے تلے دبی دبائی کام کرتی رہتی ہیں' القصہ مختصر یہ کہ طالب علم کے لیے سحر خیزی نعمت عالی ہے۔

غبار خاطر میں چار مخصوص عناوین کے تحت خط لکھے گئے ہیں۔ جو خط کم اور معلومات کے ساتھ انشاء پردازی کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ ایک نظر ان پر ڈالی جانی چاہیے۔ مولانا کی نثری تفہیم ویسے بھی عام فہم نہیں ہے۔ کیونکہ ناقدین فن کے حوالے سے مولانا کی تحریروں میں رومانیت کی جھلک ملتی ہے۔ رومانیت کی تفہیم صفدر امام قادری نے کچھ یوں کی ہے۔ ''رومانیت لفظوں میں اشارے بھرنے اور جذبوں کو حسب گنجائش کرنے کا نام بھی ہے۔'' اس لیے بھی ان نثری جواہر پاروں کی جولانیاں پورے عروج پر ہیں۔

'داستانِ بے ستون و کوہ کن' 10 اگست 1942 کا خط ہے۔ اس میں مولانا کی بلند حوصلگی کا قدم بہ قدم قائل ہونا پڑتا ہے۔ طبیعت خراب ہے گرفتاری کی افواہیں گرم ہیں۔ یہ بات یقین کی حد تک واضح ہو چکی ہے کہ آج گرفتار کر لیے جائیں گے۔ ایسے وقت میں مولانا اظہار خیال کرتے ہیں۔ کہ جتنا جلد ممکن ہو کھا پی کر سو جانا چاہیے۔ رات جو باقی ہے ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ مولانا کا عزم دیکھیے کہ چار بجے بیدار ہو کر لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد گرفتاری عمل میں آتی ہے۔ اس پورے خط میں گرفتاری کا عمل اور قلعہ احمد نگر کی تاریخی حیثیت کی وضاحت کرتے ہیں۔ بہ قول مولانا آزاد جیل میرے لیے آرام گاہ ہے۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

مولانا نے خود شاعری کے میدان میں طبع آزمائی کی باوجود اس کے دوسرے شعرا کے برمحل اشعار رقم کر کے، قاری کو اپنے قوت حافظہ سے حیران کر دیتے ہیں۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کل ملا کر تقریباً 646 اشعار و مصرعے قلم بند کر کے نثر کی معنویت میں بے پناہ اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ قلعہ احمد نگر سے متعلق جو باتیں مولانا نے لکھی ہیں۔ ان تاریخی حقائق کو قلم بند کر دینا مضمون کے متقاضی معلوم ہوتا ہے۔

مولانا اپنے خطوط میں اس بات کا پیغام دیتے ہیں کہ نظر مقصد پر رکھنی چاہیے۔ مولانا اپنے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بڑی آہستگی سے انسانی نفسیات کے مضرابی تاروں کو چھیڑ دیتے ہیں۔اور بڑی ہنر مندی کے ساتھ اپنے نوک قلم کے ذریعے انشائی پیرائے میں طالب علم کو بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ 'جب دنیا جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں' سحر کے وقت پڑھنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ دل کی انگیٹھی ہمیشہ گرم رہنے لگی اور صبح کی اس تھوڑی مہلت میں تھوڑی آگ جو سلگ جاتی ہے۔اس کی چنگاری کبھی بجھنے نہیں پاتی راکھ کے تلے دبی دبائی کام کرتی رہتی ہیں' القصہ مختصر یہ کہ طالب علم کے لیے سحر خیزی نعمت عالی ہے۔

(1) پندرہویں صدی کے آواخر میں جب دکن کی بہمنی حکومت کمزور پڑ گئی تو ملک احمد نظام الملک بھیری نے علم استقلال بلند کیا۔ اور بھنگر کے نزدیک قلعہ احمد نگر کی بنیاد ڈالی۔

(2) ملک احمد نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا۔ اس کا حصار مٹی کا تھا۔ اس کے لڑکے نظام شاہ اول نے اسے منہدم کر کے از سر نو پتھر کا حصار تعمیر کیا۔

(3) یہی قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں۔

(4) قلعہ کی خندق جس کی نسبت ابوالفضل نے لکھا ہے کہ 40 گز چوڑی اور چودہ گز گہری تھی۔

مضمون کی طوالت کو مد نظر رکھتے ہوئے۔ مولانا کے ذہنی دریچے کے سارے حقائق قلم بند کرنا ممکن نہیں۔ مقصود یہ تھا کہ جیل میں بلا ذرائع، وقائع نگاری کا ایک لا متناہی سلسلہ مولانا ہی کا طرہ امتیاز ہے۔

'حکایت بادہ و تریاک' 27 اگست 1942 کا خط ہے۔ جس کے مطالعے نے احساسات کی دنیا کو زیر و زبر کر دیا۔ جملوں کی ساخت پر غور کروں یا نثری جواہر پاروں کی سلاست و روانی کے دریا میں بہنے سے اپنے آپ کو روکوں۔ دوران مطالعہ عجیب فرحت وانبساط کی کیفیت ہے۔ پڑھتے جائیں پڑھتے جائیں۔ رکنے کا مطلب ہے کہ مولانا کے عیش و طرب کی سرمستیوں سے آنکھیں چرالی جائیں۔ امیر غریب، ادنیٰ و اعلیٰ، قیدی و آزاد کے درمیان اس دنیا کے متعصب نظام پر طنز کرتے ہوئے قانون فطرت کے نظام کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی چہار دیواری میں اتنی ہی پہنچتی ہے جتنی کہ باہر۔ اس لیے بھی پژمردہ و مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ خوش رہنا طبعی احتیاج ہی نہیں بلکہ اخلاقی ذمے داری بھی ہے۔ اس کے لیے مور کی مثال پیش کرتے ہیں۔ دور حاضر میں بھی مور کی مثال دی جا رہی ہے۔ اس سے قطع نظر مولانا کی مثال عزم و حوصلہ بخشتی ہے۔ پژمردگی کے احساس سے نجات دے دیتی ہے:

''جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوتی۔ اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں اپنے پر کھول دے گا ایک چمنستان بوقلموں کھل جائے گا۔'' (غبار خاطر: مولانا ابوالکلام آزاد، خط نمبر 9، ص 68)

علم کے راہ رو کے لیے ضروری ہے کہ مایوسی و پژمردگی کو اپنے قریب نہ آنے دیں۔ عزم و حوصلہ سے پر لطف چاشنی میں ڈوبا ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

''ایوان ومحل نہ ہوں تو کسی درخت کے سائے سے کام لے لیں دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے تو سبزۂ خودرو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسر نہیں تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے۔ اگر دنیا کی ساری خوشنمائیاں اوجھل ہوگئی ہیں تو ہو جائیں؛ صبح اب بھی ہر روز مسکرائے گی، چاندنی اب بھی ہر روز جلوہ فروشیاں کرے گی لیکن اگر دل زندہ پہلو میں نہ رہے، تو خدا را بتلایئے، اس کا بدل کہاں ڈھونڈھیں!''

(غبار خاطر: مولانا ابوالکلام آزاد، خط نمبر 9، ص 70)

مندرجہ بالا اقتباس ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ دنیا میں ہر شے کا بدل موجود ہے۔ لیکن مردہ دل کا کوئی بدل نہیں یہ اجڑا تو ساری دنیا اجڑ جائے گی۔ زندہ دلی کے ساتھ جینا ہوگا۔ جینے کے لیے عزائم کی جولانیاں مصمم ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ 'حکایت زاغ و بلبل' اور 'چڑیا اور چڑے کی کہانی' ہے۔ جو معلومات افزا اور والہانہ پند و موعظت کا نمونہ بھی ہیں۔

'غبار خاطر' کے آخری خط میں مولانا نے اپنے میدان کار کے برعکس ایک نئی دنیا سے متعارف کرایا ہے۔ مکتوب الیہ کو لکھتے ہیں کہ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ایک زمانے میں مجھے فن موسیقی کے مطالعے اور مشق کا شوق بھی رہ چکا ہے۔ پھر فن موسیقی اور دنیا جہاں کے مشہور موسیقاروں کی موسیقی کے اقسام پہ باتیں کرکے، قاری کو ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ جیسے کہ ''فقیر اللہ سیف خان عہد عالم گیری کا ایک امیر، ہندستانی موسیقی کے علم و عمل میں ماہر تھا۔ فن موسیقی کے متعلق اس کی کتاب 'راگ درپن' سنسکرت کی کتاب کا فارسی ترجمہ تھی۔ یہ کتاب جب میرے ہاتھ لگی تو میں نے اول تا آخر پڑھ لیا۔ اس کے بعد یہ سمجھ آئی کہ جب تک موسیقی کے مصطلحات پر کسی ماہر فن سے اس کی مبادیات نہ سمجھی جائیں کتاب کا سمجھ میں آنا کار مشکل ہے۔ پھر والد گرامی کا ایک مرید مسیتا خان جو کہ موسیقی جانتا تھا، سیکھنے کی ابتدا کی۔ مزید طلب و جستجو کے لیے دوسرے ماہر فن کے دروازوں پر دستک دی۔ اگر دیکھا جائے مذہب اسلام میں موسیقی سے ایک دوری روا رکھی گئی ہے۔ اس کے بعد بھی موسیقی میں امیر خسرو جو نظام الدین اولیا کے مرید خاص میں شمار ہوتے ہیں۔ موسیقی میں نئی دھنوں کے موجد ہیں۔'' اسی خط میں امراؤ جان ادا کے خالق مرزا محمد ہادی رسوا سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''وہ موسیقی میں کافی دخل رکھتے تھے۔ قیام لکھنؤ کے درمیان موسیقی سے متعلق ان سے مذاکرے ہوتے رہے۔

'معارف النغمات' کی ترتیب میں انھوں نے مدد بھی دی۔'' عربی موسیقی کے اسرار و موز پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا پتا دیتے ہیں کہ عربی موسیقی میں بارہ راگنیاں ہیں جو یونانی موسیقی کی تقلید میں وضع ہوئی تھیں۔ اسحاق موصلی اور ابراہیم بن مہدی ہارون رشید کے درباری موسیقار تھے۔ 'عراق' اور 'حجاز' جن کو ہم الگ الگ ملکوں کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ عربی موسیقی کی دو راگنیوں کے نام ہیں۔

> **''غبار خاطر کے آخری خط میں مولانا نے اپنے میدان کار کے بر عکس ایک نئی دنیا سے متعارف کرایا ہے۔ مکتوب الیہ کو لکھتے ہیں کہ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ایک زمانے میں مجھے فن موسیقی کے مطالعے اور مشق کا شوق بھی رہ چکا ہے۔ پھر فن موسیقی اور دنیا جہاں کے مشہور موسیقاروں کی موسیقی کے اقسام پہ باتیں کرکے، قاری کو ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔''**

مولانا کا موسیقی سے گہرا تعلق اس بات سے بھی پتا چلتا ہے کہ موسیقی کی دنیا میں کون، کہاں، کس شہرت کا مالک ہے۔ اپنے خط میں پوری تفصیل لکھتے ہیں۔ جیسے مصر کے شیخ سلامہ حجازی کی منڈلی کا ذکر، مصر کی مشہور عالمہ 'ظاہرہ' طنطا کی رہنے والی تھی۔ مصر میں عالمہ موسیقی کا علم جاننے والی کو کہتے ہیں، ۔ شیخ سلامہ حجازی بھی اس کے فن کا قدردان تھا۔ اس کی شکل و شباہت اور ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ خود بھی بلائے جان تھی۔ مگر اس کی آواز اس سے بھی زیادہ آفتِ ہوش وایمان تھی۔ اس سے بھی شناسائی بہم پہنچائی اور عربی موسیقی کے کمالات سنے۔ دیکھیے اس خانماں خراب شوق نے کن کن گلیوں کی خاک چھنوائی۔''

(غبار خاطر: مولانا ابوالکلام آزاد، خط نمبر 24، ص 263)

مصر کی ام کلثوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''میں نے اس کے بے شمار ریکارڈ سنے ہیں۔ جس شخص نے ام کلثوم کی آواز نہیں سنی وہ موجودہ عربی موسیقی کی دلآویزیوں کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتا۔'' اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''موسیقی کے اسرار و رموز کو جن گہرائیوں تک ہندستانیوں نے پہنچایا ہے۔ قدیم تمدنوں میں سے کوئی تمدن اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔'' اس کے ساتھ ہی یورپ کے باکمال موسیقار جنھوں نے موسیقی کی بنیاد رکھی اس کا اعتراف بھی کیا۔ یہی وہ باتیں جن سے مولانا آزاد کی فن موسیقی کی باریکیوں میں دلچسپی اظہر من الشمس ہے۔

ہندستان میں موسیقی کی سرپرستی مسلم بادشاہوں سے پہلے مسلم صوفیوں نے شروع کر دی تھی۔ پھر دیکھتے ہیں کہ ایک لمبی فہرست شمالی ہند کے بادشاہ خلجی اور تغلق کے دربار کے بعد دکن میں بہمنی اور نظام شاہی سلطنتوں کے ذوق و شوق کا مکمل احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''مالوہ کی سرزمین موسیقی کے علم و عمل کا تخت گاہ بن گئی۔ عہد جہانگیری میں موسیقی کا علم فنون دانشمندی میں شمار کیا جانے لگا۔'' آگے ذکر کرتے ہیں کہ ''جس طرح مدارس میں تمام فنون کی تحصیل کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اسی طرح موسیقی کی تحصیل کے لیے ملک کے ہر حصے سے فن موسیقی کے باکمالوں کو بلایا جاتا۔ امراء و شرفا کے گھروں میں بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھے جاتے۔ تاریخ فرشتہ کی ولادت 'مازندران' کی تھی لیکن اسے ہندستانی موسیقی سے اس درجہ تعلق ہوا کہ اس موضوع پر ایک پوری کتاب تصنیف کر دی۔'' غرض یہ کہ مولانا آزاد نے موسیقی کے موضوع پر تاریخ کے مختلف ادوار میں فن موسیقی کے باکمالوں کا ذکر اتنی تفصیل سے کیا ہے کہ انھیں مجتہد عصر، مفکر ملت، مجاہد آزادی، عظیم سیاستداں، امام الہند کے علاوہ موسیقی شناس کی حیثیت سے بھی یاد کیا جانا چاہیے۔

مولانا خود اپنے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اس کوچہ میں بھی قدم رکھا، تو جہاں تک راہ ملی، قدم بڑھائے جانے میں کوتاہی نہیں کی۔ ستار کی مشق چار پانچ سال تک جاری رہی تھی۔ بین سے بھی انگلیاں ناآشنا نہیں رہیں۔ لیکن زیادہ دلبستگی اس سے نہ ہو سکی پھر اس کے بعد ایک وقت آیا کہ یہ مشغلہ یک قلم متروک ہو گیا.......
البتہ انگلی پر سے مضراب کا نشان بہت دنوں تک نہیں مٹا تھا۔''

(غبار خاطر: مولانا ابوالکلام آزاد، خط نمبر 24، ص 57-256)

'غبار خاطر' اپنے اندر موضوعات کے لامتناہی سلسلے کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ارادے کی پختگی، تاریخی حقائق، مذہبی موشگافیاں، توحید کے لیے دلائل و براہین، درس قوت عمل، اخلاقیات کے پہلو، سحر خیزی جیسے بے شمار زاویے ہیں۔ جن پر روشنی پڑتی ہے۔

■

Md. Raihan
Research Scholar,
Depat. Of A,P,U & Islamic Studies
Visva Bharati University
Santiniketan - (WB)
Email : raihanansari53@gmail.com

طارق

اردو ادب میں انسانی اور سماجی اقدار کا تصور

'ادب' خواہ کسی بھی زبان کا ہو، سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسی لیے ہر ادیب سماج کے تانے بانے کو جوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نظریات مختلف ہوں، راستے الگ الگ ہوں، مگر سبھی انسانی سماج کا راگ الاپتے ہیں، جو جتنا بڑا ادیب ہوتا ہے، وہ اتنی ہی طاقت سے انسان اور انسانی سماج کے حق میں آواز بلند کرتا ہے۔ یہی عکس و نقش اردو ادب میں بھی نمایاں ہے۔ میر ہوں یا غالب، اقبال ہوں یا جوش، پریم چند ہوں یا منٹو سب انسانیت کی بات کرتے ہیں اور انسانی اقدار کو اپنے اپنے رنگ ڈھنگ سے تقویت پہنچاتے ہیں۔

غالب کی شاعری میں انسان کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ وہ انسان اور انسانی سماج کے حامی ہیں اور انسان کو انسان بنے رہنے کی صدا لگاتے ہیں۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں پہلی دفعہ آدمی اور انسان کے فرق کو واضح کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا مشہور شعر ہے۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اسی عہد کے ایک اور شاعر ابراہیم ذوق کی شاعری پر بھی انسان اور انسانی اقدار کا تصور چھایا ہوا ہے۔ ذوق کا خیال ہے کہ اگر انسان نفس امّارہ پر قابو پالے تو وہ ایک اچھا نیک انسان بن سکتا ہے۔ 'نفس امّارہ' اور 'نفس لوّامہ' کے حوالے سے ہمارے صوفی شعرا نے بڑی بحثیں کی ہیں، اور نفس امّارہ کو قابو کرنے پر زور دیا ہے۔ اس لیے کہ نفس امّارہ کا غلبہ انسان کو کمزور کر دیتا ہے۔ ذوق چونکہ انسانیت کے بڑے داعی تھے، اس لیے اس کے تحفظ کے لیے انھوں نے بھی نفس امّارہ پر غالب آنے کی بات کی۔ ذوق ان تمام اقدار کی حمایت کرتے ہیں جو انسان کو جلا بخشتی ہیں اور نیکی کے راستے پر لے جاتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

فکر قناعت ان کو میسر ہوئی کہاں
دنیا سے دل لے کے جو حرص و ہوا چلے

اقبال نے اور زیادہ موثر اور مستحکم انداز میں اپنی شاعری کا موضوع 'انسان' کو بنایا ہے۔ اقبال کا فلسفۂ خودی انسان کو انسان سے متعارف کراتا ہے، انسانیت کی منزلوں کو طے کرنے کی تلقین کرتا ہے اور اپنے جلو میں انسان کے مقام کو بلند کرنے کے تمام رموز و اسرار رکھتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں ایک ایسے انسان کا تصور پیش کیا ہے جو خاکی بھی ہے اور نوری بھی۔ انھوں نے اپنی شاعری میں مردِ مومن (مکمل انسان) کی بات کی ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ انسان کائنات میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ یعنی اسلامی نظریہ کے مطابق وہ انسان کو اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الارض مانتے ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد نے لکھا ہے کہ اقبال وہ پہلا شاعر ہے جس نے انسان کو کائنات کا مرکز بتایا ہے۔ علامہ اقبال کی نظر میں آفاقی انسان وہ ہے جس سے پوری انسانیت مستفید ہوتی ہے۔ دراصل اقبال عظمت انسان کے قائل ہیں اور انسان کو انسان کی دانائی، بینائی اور توانائی پر فخر بھی ہے۔ اقبال کا انسان متحرک اور فعال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے انسان کے یہاں مایوسی اور قنوطیت کا گزر نہیں ہے۔ اقبال کا انسان شاہین کی طرح پرواز کرنے کا نہ صرف حوصلہ رکھتا ہے بلکہ دنیا کو بدلنے کا خواہاں بھی ہے۔ انھوں نے کہا۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اکبر الہ آبادی کی شاعری کا موضوع بھی 'انسان' ہے۔ اگرچہ وہ طنز و مزاح کے عظیم ترین شاعر ہیں، لیکن اسی انداز میں انسانی سماج کو بلندیوں تک لے جانے کا عزم رکھتے ہیں۔ انھوں نے بڑی بے باکی سے غیر انسانی چیزوں پر طنز کیا ہے تاکہ معاشرہ برائیوں سے پاک ہو اور انسانی اقدار سے ہم آہنگ ہو۔ ان کا مشہور شعر ہے۔

وہ قتل سے بچوں کے یوں بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اس شعر میں تعلیم کے جدید طریقۂ کار پر گہرا طنز ہے، وہ مغرب کے تعلیمی نظام کو انسانیت کے حق میں زہر ٹھہرا رہے ہیں۔ ان کے اس خیال سے اتفاق کیا جائے یا نہ کیا جائے، بہرحال یہ طے ہے کہ اس شعر کے اندرون میں ان کا جذبۂ انسانیت کارفرما ہے۔ مغرب کے جدید تعلیمی نظام پر اقبال نے بھی ضرب لگائی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نگاہ میں یہ تعلیمی نظام انسانیت کے لیے مضرت رساں ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

مولانا الطاف حسین حالی کا شمار اردو کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ اردو تنقید کے بنیاد گزاروں میں سے بھی تھے۔ حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' میں شاعری کے حوالے سے جو باتیں بیان کی ہیں، کہیں نہ کہیں ان کے پیچھے ان کا نظریۂ انسانیت جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے شاعری میں اصلاح کی بات کی تو وہ بھی اس لیے تاکہ شاعری زیادہ سے زیادہ انسان اور انسانی سماج کی ترقی و تعمیر کے لیے ممد و معاون ثابت ہو سکے۔ حالی نے خود بھی ایسی ہی شاعری کی جو انسانی و سماجی قدروں کی آئینہ دار بن گئی۔ اس حوالے سے حالی کی نظمیں بہت اہم ہیں۔ ان کی ایک نظم کا درج ذیل بند ملاحظہ فرمائیں۔

بنے قوم کھانے کمانے کے قابل
زمانے میں ہو منہ دکھانے کے قابل
تمدن کی مجلس میں آنے کے قابل
خطاب آدمیت کا پانے کے قابل
سمجھنے لگیں اپنے سب نیک و بد وہ
لگیں کرنے آپ اپنی مدد وہ

مولانا محمد حسین آزاد کی نظموں میں بھی انسان کی اخلاقی

تربیت کا درس ملتا ہے۔انھوں نے اپنی نظموں میں آزاد انسان کو ترقی کی راہ دکھانے اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو اپنے اندر اتارنے پر خاص زور دیا ہے۔ان کے یہاں انسانوں کے مابین تفریق کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ انسان اعلیٰ ہو یا ادنیٰ دونوں کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔وہ کسی بھی انسان کو کمتر نہیں سمجھتے تھے۔ اس تناظر میں ان کی نظم 'صبح امید' بہت اہم ہے۔

جوش ملیح آبادی کی شاعری انسانیت کی موثر اور مستحکم آواز ہے۔ جوش شاعر شباب اور شاعر انقلاب تو ہیں ہی لیکن وہ شاعر انسان بھی ہیں۔ان کے شعری مجموعے میں سیف وسبو، سرود وخروش، عرش وفرش، الہام وافکار، نجوم وجواہر، فکر ونشاط، جنون وحکمت اور شعلہ وشبنم شامل ہیں۔انسانیت کے حوالے سے جوش کی شاعری کا لب لباب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی بھی چیز انسان سے بالاتر نہیں ہے۔انسان ان کے خیال میں خود مختار اور بااعتماد ہستی کا نام ہے۔انھوں نے انسان اور انسانیت کے حوالے سے اپنی شاعری کو رنگا رنگ بنایا ہے۔ان کی نظم 'درس آدمیت' دراصل انسانیت کی آواز ہے۔

کوئی چیز انسان سے بالا نہیں!
ہر اک شے گماں صرف انساں یقیں
مجاز و حقیقت کا شاہ آدمی
کلاہ سر مہر و ماہ آدمی

آل احمد سرور نے جوش ملیح آبادی کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''جس طرح یگانہ کا آدمی کا تصور غالب کی یاد دلاتا ہے، مگر غالب کی عظمت کو نہیں پہنچتا، اسی طرح جوش کا انسان کا ترانہ، اقبال کے انسان کی طرف ذہن کو لے جاتا ہے مگر جوش کے یہاں اقبال کی سی حکیمانہ آواز ہے نہ اقبال کا معجزۂ فن۔ جوش اقبال کے عشق کے مقابلے میں عقل کی بلندی کے ترانے گاتے ہیں مگر ان کی گھن گرج میں تشبیہات واستعارات کی ایک طلسم ہوش ربا کے باوجود فکری اعتبار سے ایک تہی مائیگی ہے۔ان میں اس اعلیٰ سنجیدگی کی کمی ہے جو بڑے فنکار کی پہچان ہے۔ہاں ایک طفلانہ شوخی اور ایک رومانی کھلنڈراپن ضرور ہے جو فطرت، شباب اور انقلاب سے کھیلتا ہے۔''

(تنقید کیا ہے؟ آل احمد سرور، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، 2011، ص 191)

اردو کی نثری اصناف میں بھی انسان اور انسانی سماج کے موضوع کو کثرت سے برتا گیا ہے۔ داستان، ناول، افسانہ، رپورتاژ، صحافت، ان سب کا محور انسان ہی ہے۔بوستان خیال، طلسم ہوشربا، باغ وبہار، آرائش محفل، فسانہ عجائب، رانی کیتکی کی کہانی میں انسانی تہذیب ومعاشرت کا بیان ہے اور ان میں انسانی قدروں کی باتیں بڑے موثر ڈھنگ سے پیش کی گئی ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر عہد حاضر کے ناول نگاروں تک اور پریم چند سے موجودہ دور کے افسانہ نگاروں تک سب نے اپنا مرکزی موضوع انسان کو ہی بنایا ہے۔

اردو میں باضابطہ ناول نگاری کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد سے ہوتا ہے۔مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، فسانہ مبتلا اور ایامیٰ ان کے قابل ذکر ناول ہیں۔نذیر احمد نے 'مراۃ العروس' میں دراصل انسان کی اچھائی اور برائی کو اکبری اور اصغری کے توسط سے پیش کیا ہے۔مراۃ العروس میں نذیر احمد نے ایک جگہ لکھا ہے:

''جو آدمی دنیا کے حالات میں کبھی غور نہیں کرتا اس سے زیادہ کوئی احمق نہیں۔غور کرنے کے واسطے دنیا میں ہزاروں طرح کی باتیں ہیں لیکن سب سے عمدہ اور ضروری آدمی کا اپنا حال ہے کہ جس روز سے آدمی پیدا ہوتا ہے، زندگی میں اس کو کیا کیا باتیں پیش آئیں اور کیونکر اس کی حالت بدلی۔''

(مراۃ العروس، نذیر احمد، کتابی دنیا نئی دہلی 2003، ص 5)

ڈپٹی نذیر احمد کا ناول 'مراۃ العروس' میں عورتوں کو برابری کا درجہ دیتا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ اس میں جن حقوق کا ذکر عورتوں کے حوالے سے آیا ہے، وہ حقوق عورتوں کو ضرور ملنے چاہئیں۔آج خواتین کے حقوق اور تعلیم کی بات بھی کی جارہی ہے اور اس تعلق سے عملی قدم بھی اٹھائے جارہے ہیں، مگر نذیر احمد کئی سو سال قبل اپنے اردو ناولوں کے ذریعے خواتین کی تعلیم اور حقوق کی آواز اٹھا چکے ہیں۔ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، فسانہ مبتلا، ابن الوقت، ایامیٰ، رویائے صادقہ میں سے کوئی ایک ناول بھی ایسا نہیں ہے جس میں انیسویں صدی کی سماجی زندگی اور اس زمانے کے مسلمان گھرانوں کی حقیقت شعارانہ عکاسی نہیں کی گئی ہو۔''

(بیسویں صدی میں اردو ناول، ڈاکٹر یوسف سرمست، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2016، ص 32,33)

رتن ناتھ سرشار اردو ناول کا ایک نمایاں نام ہے۔ 'فسانہ آزاد، جام سرشار، اور سیر کہسار ان کے نمائندہ ناول ہیں۔'فسانہ آزاد' رتن ناتھ سرشار کا بہترین ناول ہے۔اس میں انسان اور انسانی سماج کو خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ناول کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں صرف انسان اور انسانی سماج ہی نہیں بلکہ پورا لکھنؤ زندہ جاوید ہے۔رتن ناتھ سرشار نے اپنے ناول میں لکھنؤ کے رسم ورواج اور تہذیب وثقافت کو جس طرح پیش کیا ہے، اردو کے کسی دوسرے ناول میں کمیاب ہے۔ انھوں نے لکھنؤ کی انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ اس طرح کیا ہے کہ پورا منظر نامہ قاری کی آنکھوں کے سامنے گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔رتن ناتھ سرشار کی نظر اس وقت کے انسانی سماج پر بہت گہری تھی، وہ اپنے گرد ونواح کے لوگوں کو سماجی زاویوں سے بغور دیکھتے تھے، اسی لیے انھوں نے اپنے ناول میں مصاحب، مسخرے، عامل، مولوی، مجاور، شاعر، پروفیسر، فوٹو گرافر، وکیل، بیرسٹر سب کی تصویر کشی کی ہے۔

اردو ناول نگاری میں عبدالحلیم شرر کی بھی ایک الگ شناخت ہے۔انھوں نے تاریخی ناول لکھے اور ان میں بہادر انسانوں کے کارناموں کو پیش کیا۔گویا کہ عبدالحلیم شرر انسان کو بہادر دیکھنا چاہتے ہیں۔دراصل شجاعت وبہادری انسان کی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔یہ خوبی انسان کو بلندی پر لے جاتی ہے اور اپنی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کی پرواہ نہ کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔عام طور سے وہی انسان آگے بڑھتے ہیں اور دنیا کی منزلوں کو طے کرتے ہیں جو بہادر ہوتے ہیں۔جن لوگوں میں بہادری نہیں پائی جاتی، ان سے بڑے کارناموں کی توقع بھی نہیں کی جاتی۔

اردو کے بلند پایہ ناول نگاروں میں مرزا ہادی رسوا کا نام سرفہرست ہے جنھوں نے افشائے راز، امراؤ جان ادا، ذات شریف، شریف زادہ جیسے ناول لکھے، لیکن 'امراؤ جان ادا' نے انھیں زندۂ جاوید کردیا۔مرزا ہادی رسوا نے اپنے ناولوں میں انسان اور سماج کے مسائل کو پیش کیا ہے اور 'امراؤ جان ادا' میں انسان اور سماج کا تصور زیادہ واضح اور موثر طور پر سامنے آتا ہے۔یہ اردو کا پہلا ناول ہے جس میں لکھنوی تہذیب وثقافت کو

پورے جاہ وجلال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مرزا ہادی رسوا نے اس ناول میں جہاں امرا وحکام کے عیش وطرب اوران کے معیارِ زندگی کا مرقع کھینچا ہے، وہیں انھوں نے سماج کے ان طبقات کو بھی اجاگر کیا ہے جو آخری پائیدان پر نظر آتے ہیں۔ اس ناول کے توسط سے ایک طوائف کی زندگی کو رسوا نے جس طرح پیش کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسوا کی نگاہ میں انسان کی کتنی قدر ومنزلت تھی۔ امراؤجان ادا میں طوائف کی زندگی کو نہ صرف پیش کیا گیا ہے بلکہ یہ بتانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ کوٹھے پر رہنے والی طوائف محض تعیش کا سامان نہیں ہے بلکہ یہ کوٹھے ہماری زبان اور تہذیب وثقافت کی پاسداری بھی کرتے ہیں۔ اس ناول کے ذریعے قارئین نہ صرف ایک طوائف کی دکھ بھری زندگی سے آشنا ہوتے ہیں بلکہ امراؤجان ادا اس معاشرے کا نمائندہ کردار ہے جس کے توسط سے ہم طوائفوں کے بالا خانوں کی آن بان سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ گوہر مرزا، سلطان مرزا، بوڑھے نواب، فیض علی ڈاکو، قانونی شاطر اکبرعلی اور اکبر علی کی بیوی نواب سلطان کی بیگم یہ سب کے سب انسانی کردار ہیں جو امراؤجان ادا کی کہانی کو آگے بڑھانے میں پیش پیش ہیں۔

پریم چند کے ناولوں میں بھی مرکزی موضوع انسان ہی ہے۔ مگر انھوں نے دبے کچلے انسانوں کی بات کرکے یہ تاثر دیا ہے کہ انسان بلند مقام کا حامل ہے۔ اس کی قدر کی جانی چاہیے، چاہے وہ سماج کے کسی بھی شعبے سے جڑا ہوا ہو۔ پریم چند کا ناول 'گئودان' اردو کا معرکۃ الآراء ناول ہے اور انسانیت کی مستحکم آواز بھی۔ غریب کسان کی زندگی کو پیش کرکے پریم چند نے یہ درس دینے کی کوشش کی ہے کہ سماج میں ایسے مفلوک الحال اور پریشان حال لوگ بھی ہیں جن پر توجہ دی جانی چاہیے اور استحصال کے دروازے بند ہونے چاہئیں۔ پریم چند کے بعد کرشن چندر، بیدی، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر جیسے بہت سے ناول نگاروں کی ایک پوری کہکشاں موجود ہے، جنھوں انسان اور انسانی سماج کے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔

اگر اردو افسانہ نگاری کی بات کریں تو بڑے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو میں افسانہ نے زبردست ترقی کی ہے اور اس کا یہ سفر ہنوز جاری ہے۔ اردو کے پہلے افسانہ نگار پریم چند ہیں۔ جنھوں نے بہت سے افسانے لکھے، انھوں نے اپنے زیادہ تر افسانوں میں سماج کے دبے کچلے طبقات وافراد کی زندگی اور مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ 'کفن' اور 'عیدگاہ' جیسے ان کے افسانے ذہن پر لگی زنگ کو ہٹا دیتے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''دراصل پریم چند کے دل میں سماج کے دبے کچلے ہوئے غریب انسانوں کے لیے بے پناہ ہمدردی تھی۔ اب یہ حقیقت ان پر روشن ہوگئی تھی کہ مہاجنوں یا زمینداروں کا قلب ماہیت کرکے کروڑوں غریب انسانوں کی غریبی دور نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں کے خلاف انسانی ضمیر کو بیدار کیا جائے۔ نجات، دودھ کی قیمت اور کفن ایسی کہانیاں ہیں جن میں پریم چند کی حقیقت پسندی زندگی کی المناک سچائیوں کو برہنہ کرکے پیش کردیتی ہے۔ ان میں جو کردار دکھی، منگل، گھیسو، مادھو، وہ اس سماج میں جانوروں سے بھی زیادہ گھناؤنی آمیز زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے ہیں۔''

(پریم چند کے نمائندہ افسانے، مرتبہ: قمر رئیس، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 2010، ص 22)

اردو افسانہ نگاروں میں منٹو کی عظمت سے کسی بھی صورت انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے افسانوں کی مقبولیت آج بھی برقرار ہے۔ زندگی کو جس طرح سے منٹو نے پیش کیا ہے، وہ دراصل انہی کا خاصہ ہے۔ ان کے افسانوں میں انسان کا درد سامنے آتا ہے۔ ان کا انداز اچھوتا ہے اور بلا کی تاثیر رکھتا ہے۔ تقسیم وطن کے حوالے سے بہت سے افسانے لکھے گئے، مگر 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کی بات ہی کچھ اور ہے۔ منٹو نے اپنے کئی افسانوں میں طوائف کے مسائل کو بھی بیان کیا ہے۔ اور سماج میں ہونے والی ناانصافی اور زیادتی کو انھوں نے کھول کر رکھ دیا ہے۔ گوپی چند نارنگ 'منٹو کی نئی پڑھت' میں لکھتے ہیں:

''جو چیز منٹو کے تخلیقی ذہن میں اضطراب پیدا کرتی ہے وہ خریدی یا بیچی جانے والی جنس نہیں بلکہ انسانی روح کا وہ درد وکرب ہے، جو جسم کو بکاؤ مال بنانے سے پیدا ہوتا ہے۔''

(افسانوں کے درمیان، محمد اسلم پرویز، ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی 2018، ص 49-48)

اردو کے مقبول افسانہ نگاروں کی فہرست میں ایک نام کرشن چندر کا ہے۔ انھوں نے ناول، افسانے اور ڈرامے تینوں اصناف میں طبع آزمائی کی، تاہم ان کی اصل شناخت افسانے کے میدان سے ہوئی۔ ان کے قابل ذکر افسانوں کے مجموعوں میں نظارے، زندگی کے موڑ پر، ان داتا، تین غنڈے، سمندر دور ہے، اجنتا سے آگے ہیں۔ کرشن چندر نے انسانی زندگی کے پہلوؤں کو ذرا مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں رومان اور حقیقت دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔

منٹو اور کرشن چندر کی بات ہو اور راجندر سنگھ بیدی کی بات نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔ بیدی اردو افسانہ کی آبرو ہیں۔ انھوں نے اردو کی افسانوی کائنات کو خاصا وسیع کیا ہے۔ بیدی کے یہاں انسان اور انسانی سماج کا تصور اچھوتے انداز میں سامنے آتا ہے۔ بیدی اپنے افسانوں کی تخلیق کے لیے سماج کے چھوٹے چھوٹے زندہ جاوید انسانی کرداروں کو نہ صرف پیش کرتے ہیں بلکہ ان کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں فطری انسان کو پیش کرنے میں زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں۔ وہ انسان کی فطرت اور جبلت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان معاشرتی سطح پر کس طرح سمجھوتہ کرسکتا ہے اور کس سطح پر نہیں۔ وارث علوی رقمطراز ہیں:

''ان کا سروکار زندگی کے بنیادی محرکات سے ہے۔ آدمی اپنی فطرت اور اپنی اصل میں کیا ہے۔ زندگی کی بنیادی جبلتیں اور ان کی تشفی کے ذرائع کیا ہیں۔ معاشرتی سطح پر انسان ان جبلتوں کو مسخ کیے بغیر کیا ان سے اطمینان بخش سمجھوتہ کرسکتا ہے۔ انسان کی جذباتی ضرورتیں کیا ہیں۔ اور اگر ان ضرورتوں کو پورا نہ کرسکنے کے سبب اس کی زندگی میں بگاڑ اور انتشار پیدا ہوتا ہے تو اس کی ذمے داری خود اس پر اور اس کے معاشرتی اور تمدنی طریقہ حیات پر کس حد تک عائد ہوتی ہے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن میں بیدی کو دلچسپی ہے۔ گویا بیدی کو حیات انسانی کے ان مسائل میں دلچسپی ہے جن کا ادراک صرف فنکارانہ تخیل سے کیا جاسکتا ہے۔''

(راجندر سنگھ بیدی: ایک مطالعہ: وارث علوی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2012، ص 17-16)

اردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی کا نام زیادہ اہم ہے۔ انھوں نے عورتوں کے مسائل کو زیادہ بیان کیا ہے بالخصوص متوسط مسلم گھرانے کی عورتوں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ عصمت چغتائی ترقی پسند تحریک سے باضابطہ وابستہ رہی ہیں، اس لیے ان کے افسانوں میں ترقی پسند خیالات کے عناصر بخوبی ملتے ہیں۔ پریم چند، اوپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، منٹو، بیدی اور عصمت چغتائی کے علاوہ دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی انسان کا تصور ملتا ہے۔ گویا کہ ہر ادیب انسان کے اردگرد سے ہی اپنی تخلیقات کا مواد فراہم کرتا ہے اور انسانی سماج کی تشکیل وتعمیر میں اپنا تعاون پیش کرتا ہے۔

■

Tariq
S/o Shamusuzzoh, House No 626,
Nav Jeewan Colony, Tahirpur
Road No 64, New Seemapuri
Delhi- 110095

ترجمے کے ذریعے اردو کا فروغ

شاہ جہاں بیگم

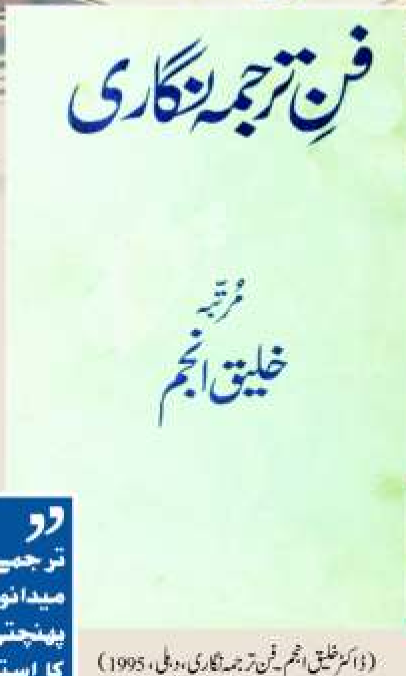

زبان کا تہذیب سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ زبان نہ صرف خیالات کا آئینہ ہوتی ہے بلکہ انسانی گروہوں اور قوموں کی زندگی، عادت واطوار کو محفوظ کرنے کا بھی ایک موثر ذریعہ ہے۔ کسی بھی زبان کی ترقی اور تحفظ کا ایک بڑا ذریعہ ترجمہ ہے۔ قوموں کی ترقی میں ترجمے بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے دوسری زبانوں میں موجود علوم وفنون تک ایسے شخص کی رسائی بھی ممکن ہوجاتی ہے جو اپنی مادری زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں جانتا۔

ڈاکٹر خلیق انجم ترجمے کی اہمیت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

"ترجمے کے ذریعے علم وفن کے میدانوں میں انسانی فتوحات ہم تک پہنچتی ہیں۔ اگر انسان ترجمے کے فن کا استعمال نہیں کرتا تو ہماری علمی روایات ہزاروں سال پیچھے رہ جاتی ہیں۔ مترجموں نے اپنی جدوجہد سے ہر قدم پر انسانی علم میں اضافہ کیا ہے ترجمے کے ذریعے ہی ایک مخصوص ملک کسی بھی جغرافیائی علاقے اور کسی بھی خاص قوم کے حالات اور اُس کے علوم وفنون حاصل کر کے تمام دنیا تک پہنچاتا ہے"

(ڈاکٹر خلیق انجم۔فن ترجمہ نگاری، دہلی، 1995)

اُردو میں ترجمے کا عمل زبان کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔ ابتدا میں مذہبی موضوعات کے ترجمے کیے گئے بعد میں یہ محسوس کیا گیا کہ فنی اور علمی کتابوں کے بھی ترجمے کیے جانے چاہئیں۔ چنانچہ مختلف اداروں نے ترجمے کے کام کو آگے بڑھایا جن میں فورٹ ولیم کالج، فورٹ سینٹ جارج کالج، دلی کالج وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ، نوابین اودھ اور حیدرآباد میں شمس الامرا کی سرپرستی میں علمی وفنی تراجم کیے گئے۔ سرسید احمد خاں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کر کے کئی علمی کتابوں کے ترجمے کروائے۔ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں طلبا کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے سیکڑوں کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔

موجودہ دور میں انجمن ترقی اردو، این سی ای آر ٹی، نیشنل بک ٹرسٹ جیسے اداروں نے بھی اس ضمن میں کام کیا ہے۔ حکومت ہند کے ادارے، قومی کونسل برائے فروغ اُردو نے سیکڑوں علمی وفنی کتابیں اردو میں منتقل کیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ ترجمہ نے طلباء کی کئی نصابی کتب کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

"ترجمے کے ذریعے علم و فن کے میدانوں میں انسانی فتوحات هم تک پهنچتی هیں. اگر انسان ترجمے کے فن کا استعمال نهیں کرتا تو هماری علمی روایات هزاروں سال پیچھے رہ جاتی هیں. مترجموں نے اپنی جدوجهد سے هر قدم پر انسانی علم میں اضافه کیا هے ترجمے کے ذریعے هی ایک مخصوص ملک کسی بهی جغرافیائی علاقے اور کسی بهی خاص قوم کے حالات اور اُس کے علوم و فنون حاصل کر کے تمام دنیا تک پهنچاتا هے."

ترجمہ وہ دریچہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں ترجموں کے ذریعے نئے الفاظ اور تصورات زبان میں داخل ہوتے ہیں اردو نثر میں سجاد حیدر یلدرم، منٹو، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور حسن عسکری اور شاعری میں اقبال سے لے کر شان الحق حقی تک نے تراجم کیے ہیں۔ فرانسیسی میں بودلیر سے لے آندرے نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہر ادیب کے لیے لازم ہے کہ عالمی ادب کا کم سے کم ایک شاہکار اپنی زبان میں منتقل کرے۔ سیسرو 46 قبل مسیح نے ترجمہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

''مترجم کا کام لفظ کی جگہ لفظ رکھنا نہیں بلکہ مصنف کے اسلوب اور زبان کی طاقت کو اپنی زبان میں محفوظ کرنا ہے'' (ترجمہ کا فن، مرزا حامد بیگ)

مذکورہ اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جہاں مترجم کسی متن کا ترجمہ کرتا ہے وہیں پر وہ تہذیب کا بھی ترجمہ کرتا ہے اگر مترجم تہذیب سے واقف نہیں تو ترجمہ بھی کامیاب نہیں۔ کامیاب ترجمہ کے حوالے سے یہ بات بتائی جاتی ہے کہ'ترجمہ رواں' سلیس اور عام فہم ہو، ایسے ہی ترجمہ کو کسی حد تک درست کہا جاسکتا ہے، لیکن حتمی فیصلہ نہیں'' (حوالہ سابق)

مواد کے اعتبار سے ترجمہ کی تین قسمیں ہیں:

1۔ علمی ترجمہ
2۔ ادبی ترجمہ
3۔ صحافتی ترجمہ

طرز اور اسلوب کی بنیاد پر ترجمہ کی مزید تین قسمیں کی جاسکتی ہیں:

1۔ لفظی ترجمہ
2۔ آزاد ترجمہ
3۔ معتدل ترجمہ، تخلیقی ترجمہ

پہلی صنف اور قسم یعنی علمی و لفظی ترجمہ کا عمل مذہبی اور سائنسی علوم میں ہوتا ہے جبکہ دوسری قسم یعنی ادبی اور آزاد ترجمہ کے اندر محاورہ۔ تشبیہات، ضرب المثل اور استعارات کا استعمال ہوتا ہے آخرالذکر صحافتی اور معتدل ترجمہ کا اصل مقصد بقول غلام رسول مہر

''اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح ہو اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو تاکہ پڑھنے والوں کو کوئی الجھن نہ ہو''

(مغرب سے نثری تراجم ص،45)

زندگی کے بیشتر شعبوں میں ترجمہ شدہ مواد کی بہت اہمیت ہے۔ اس سلسلے میں موجودہ دور کے ایک اہم ادارے National Translation Mission (NTM) قومی ترجمہ، مشن حکومت ہند کی ایک مُہم ہے جس نے ہندوستان کے دستور میں شامل 22 زبانوں میں علوم کے تراجم کا بیڑا اٹھایا ہے اس کے مقاصد اس طرح ہیں

1۔ ہندوستانی زبانوں میں علمی متون کے ترجمے کا ایک اعلیٰ و معیاری ذخیرہ تیار کرنا
2۔ ترجمے کے سافٹ ویئر کی تحقیق و ترقی میں تعاون فراہم کرنا جیسے میموری، ورڈ فائنڈر، ورڈ نیٹ وغیرہ
3۔ انگریزی اور ہندوستانی زبانوں میں دنیا میں دیگر زبانوں سے ہندوستانی زبانوں اور بصورت دیگر معکوس اور ایک ہندوستانی زبان سے دوسری ہندوستانی زبان کے مابین مشین امدادی ترجمہ اور مشینی ترجمے کا فروغ
4۔ ترجمہ کو ایک صنف کے طور پر فروغ دینا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر اُردو کے نصاب میں ترجمہ نگاری کو اُردو کے فروغ کے لیے شامل کیا جائے۔ آج کا طالب علم صرف اُردو پڑھ لیتا ہے دوسری زبان میں ترجمہ نہیں کرسکتا۔ تیسرے یہ کہ آج کا طالب علم بالعموم فارسی، عربی زبان و ادب سے شناسائی نہیں رکھتا جس کی وجہ سے وہ اردو میں ترجمہ نگاری کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ اُردو میں ثانوی سطح کے جو نصابات دستیاب ہیں عام طور پر وہ پرانے نصابات ہیں جس میں ترجمہ کی تدریس کو شامل کرنا چاہیے اور اس کے متعلق باضابطہ اسباق تیار کرائے جائیں تاکہ انھیں کلاس روم میں لفظ بہ لفظ پڑھا کر اُن اسباق سے ترجمہ کی مشقیں بھی کروائی جاسکیں۔

اعلیٰ ثانوی سطح پر ترجمہ نگاری کے تحت زیادہ تفصیل اور کچھ زیادہ گہرائی کے ساتھ مشق کروائی جائے یہ موضوعات ٹکسٹ کا حصہ نہ ہوں بلکہ ان پر علاحدہ علاحدہ معاون کتب ہوں۔

آج ہم گلوبلائزیشن کے دور میں زندگی گزار رہے ہیں پوری دنیا ایک مٹھی میں سما گئی ہے۔

تجارت، سیاست، اور مذہب، تینوں میدانوں میں ترجمہ کی اہمیت مسلمہ ہے انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقی نے ترجمے کو موجودہ ترسیلی دنیا کا جزو لاینفک بنادیا ہے۔ ترجمے کی ضرورت کے اس پھیلاؤ میں اس میدان میں افراد کی ترتیب و تیاری تعلیم، تعلم، تربیت و اکتساب کے دروازے ہی نہیں کھولے بلکہ تحقیقی جستجو اور اس میدان کے متعلق تدبر اور نظریات سازی کے دروازے بھی کھول دیے۔

> ترجمہ وہ دریچہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں ترجموں کے ذریعے نئے الفاظ اور تصورات زبان میں داخل ہوتے ہیں اردو نثر میں سجاد حیدر یلدرم منٹو، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور حسن عسکری اور شاعری میں اقبال سے لے کر شان الحق حقی تک نے تراجم کیے ہیں. فرانسیسی میں بود لیر سے لے آندر یے نے توبھاں تک کہا ہے کہ ہر ادیب کے لیے لازم ہے کہ عالمی ادب کا کم سے کم ایک شاہکار اپنی زبان میں منتقل کرے۔ سیسرو46 قبل مسیح نے ترجمہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

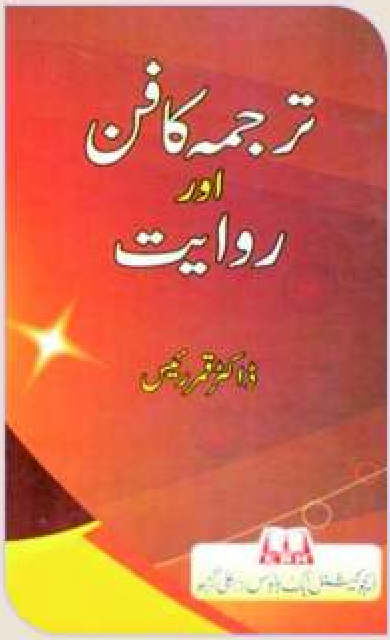

ترجمے کی اہمیت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے بادشاہوں اور جاگیرداروں کے زمانے میں ترجموں کی سرپرستی کا کام اسی اعلیٰ طبقے کے لوگ کرتے تھے۔ دور دور سے مختلف زبانوں اور علوم کے ماہر بلائے جاتے اور کتابیں ترجمہ کرائی جاتی تھیں۔

اردو کو ایک جدید زبان بنانے، اس میں ادب کی روایت کو مستحکم کرنے اور زبان کو وسعت دینے میں ان تالیفات و تراجم نے اہم رول ادا کیا ہے بقول شہباز حسین کے:

''ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعے علوم و فنون کے خزانے سب کے لیے کھل جاتے ہیں اسی لیے ترجموں کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اور ترجمہ نے تخلیق کا درجہ پالیا ہے۔''

[ترجمہ کی اہمیت، شہباز حسین، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت ڈاکٹر قمر رئیس صفحہ نمبر 181 سنہ اشاعت 2004)

اس ترجمہ کی کنجی کا آج یہ حال ہے کہ دنیا کی ساری زبانیں ترجمہ کے بغیر بیکار ہیں اور جب تک ترجمہ نہ ہوگا زندگی میں آسانیاں پیدا ہونا ممکن نہیں۔

■

Shah Jahan Begum Gohar Kurnoli
H.No: 49-50A/83/H8
Lakshmi Nagar
Kurnool - 518002 (AP)

تبصرے اور حوالہ جات
(References)

کبھی بھی آپ کو اپنی دستاویز میں خاص تبصرے اور حوالہ جات، جیسے مشمولات یا موضوعات کی فہرست، فٹ نوٹ، اینڈ نوٹ وغیرہ جوڑنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایم ایس- ورڈ میں اس کی بھی سہولت موجود ہے۔ ورڈ کے ربن میں ریفرنسز (References) ٹیب کی مدد سے آپ دستاویز میں تبصرے آسانی سے جوڑ سکتے ہیں۔ یوں تو References ٹیب کی مدد سے آپ متعدد کام کرسکتے ہیں، لیکن ان سبھی کے بارے میں تفصیلی جانکاری دینا یہاں ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس باب میں صرف انھیں آپشنز کے متعلق بات کریں گے، جن کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ بقیہ کے بارے میں جاننے کے لیے آپ ہیلپ سہولت کا استعمال کرسکتے ہیں۔

تصویر WD-8.1: ریفرنسز ٹیب

ربن میں References کلک کرنے پر آپ کو ٹیب تصویر WD-8.1 کی طرح نظر آتا ہے۔ اس میں بھی متعدد حصے اور بٹن ہیں، جن کی مدد سے آپ کئی مخصوص کام کرسکتے ہیں۔

موضوعات کی فہرست کا حصہ (Table of Contents Section)

References ٹیب میں سب سے پہلے موضوعات یا مشمولات کی فہرست کا حصہ (Table of Contents Section) دیا گیا ہے۔ اس میں کل تین بٹن ہیں۔ مشمولات کی فہرست (Table of Contents)، ٹیکسٹ جوڑو (Add Text) اور فہرست کی تجدید کاری (Udpate

تصویر WD-8.2: مشمولات کی فہرست کی گیلری

Table) ۔ ان سبھی کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(i) مشمولات کی فہرست جوڑنا (Adding Table of Contents): References ٹیب کے Table of Contents حصہ میں Table of Contents بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر ایک پل- ڈاؤن مینو تصویر WD-8.2 کی طرح کھلتا ہے، جس میں Automatic Table1، Automatic Table 2 اور Manual Table نامی تین آپشن ہوتے ہیں۔

Automatic Table1 یا Automatic Table2 کو چننے پر ایم ایس- ورڈ خود ہی آپ کی دستاویز میں ہیڈنگ اور سب- ہیڈنگ ڈھونڈ کر مشمولات کی ایک فہرست تیار کر دیتا ہے لیکن اس کے لیے ضرورت ہے کہ آپ نے Home ٹیب کے Styles حصہ میں اسٹائل گیلری کی مدد سے اپنی دستاویز میں ہیڈنگ اور سب- ہیڈنگ کا فونٹ، رنگ، شکل وغیرہ طے کیا ہو۔ ایم ایس- ورڈ صرف اسٹائل کی مدد سے جوڑی گئی ہیڈنگ اور سب- ہیڈنگ کو پہچانتا ہے۔ تصویر WD-8.3 میں ایک دستاویز کا پریویو دکھایا گیا ہے، جس کی ہیڈنگ اور سب- ہیڈنگ کو اسٹائل گیلری میں دیے گئے Heading1، Heading2، Heading3، Heading4 اور Heading آپشنز کے مطابق سیٹ کیا گیا ہے۔

اگر آپ ورڈ سے ہی مشمولات کی فہرست تیار کروانا چاہتے ہیں، تو Table of Contents کے پل- ڈاؤن مینو میں Automatic Table 1 یا Automatic Table 2 آپشن پر کلک کیجیے۔ مشمولات کی فہرست فوراً آپ کی دستاویز میں جڑ جائے گی۔ جیسا کہ آپ تصویر WD-8.4 میں دیکھ سکتے ہیں، مشمولات کی فہرست میں عموماً

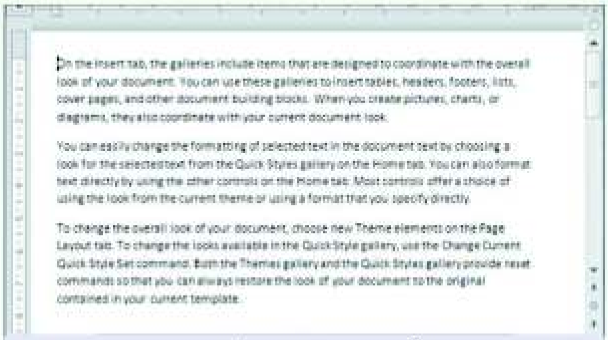
On the Insert tab, the galleries include items that are designed to coordinate with the overall look of your document. You can use these galleries to insert tables, headers, footers, lists, cover pages, and other document building blocks. When you create pictures, charts, or diagrams, they also coordinate with your current document look.

You can easily change the formatting of selected text in the document text by choosing a look for the selected text from the Quick Styles gallery on the Home tab. You can also format text directly by using the other controls on the Home tab. Most controls offer a choice of using the look from the current theme or using a format that you specify directly.

To change the overall look of your document, choose new Theme elements on the Page Layout tab. To change the looks available in the Quick Style gallery, use the Change Current Quick Style Set command. Both the Themes gallery and the Quick Styles gallery provide reset commands so that you can always restore the look of your document to the original contained in your current template.

تصویر WD-8.3: دستاویز کا پریویو

تین درجات، یعنی Heading1، Heading2 اور Heading3 ہی جوڑے جاتے ہیں۔ اگر آپ Heading4 اور Heading5 کو بھی جوڑنا چاہتے ہیں، تو Table of Contents کے پل- ڈاؤن مینو (تصویر WD-8.2) میں Insert Table of

Contents...' ہدایت دیجیے۔ ایسا کرنے پر Table of Contents ڈائیلاگ باکس تصویر WD-8.5 کی طرح کھلے گا، جس کی Table of Contents ٹیب شیٹ ایکٹو ہوگی۔ مشمولات کی فہرست میں لیول بڑھانے کے لیے :Show Levels اسپن کنٹرول باکس یا '...Options' بٹن کے کلک کرکے کھلنے والے Table of Contents Options ڈائیلاگ باکس کا استعمال کیجیے۔

اس کے اضافی Table of Contents ڈائیلاگ باکس کے ذریعے آپ مشمولات کی فہرست کا فارمیٹ اور ٹیب لیڈر بھی سیٹ کرسکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں Modify بٹن پر کلک کرکے آپ مشمولات کی فہرست کا فونٹ وغیرہ بھی بدل سکتے ہیں۔ مطمئن ہوجانے پر OK بٹن پر کلک کیجیے۔

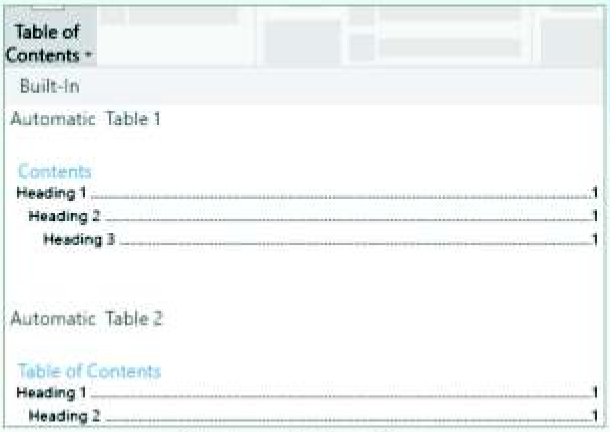

تصویر WD-8.4: مشمولات کی فہرست جوڑنے کے بعد دستاویز

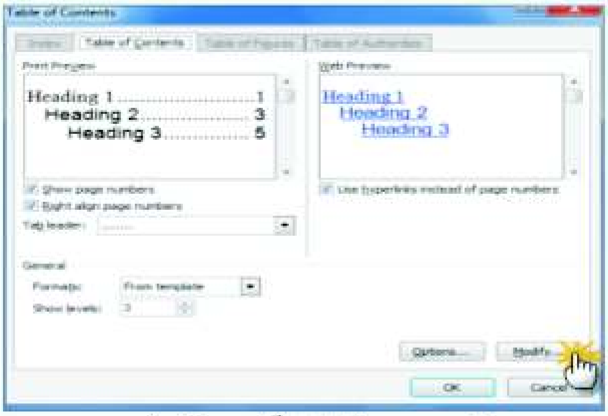

تصویر WD-8.5: ٹیبل آف کانٹینٹس ڈائیلاگ باکس

اگر آپ نے یہ کام مشمولات کی فہرست جوڑنے کے بعد کیا ہے، تو ورڈ پرانی فہرست کو نئی فہرست (جس کے زیادہ لیول ہوں) سے بدلنے کی اجازت مانگے گا۔ Yes بٹن پر کلک کیجیے۔ پرانی فہرست نئی فہرست سے فوراً بدل دی جائے گی۔

اگر آپ مشمولات کی فہرست ورڈ کے ذریعے تیار نہ کروا کر خود بنانا چاہیں، تو Table of Contents کے پل-ڈاؤن مینو میں Manual Table آپشن چنیں۔ ایسا کرنے سے تصویر WD-8.6 کی طرح مشمولات کی فہرست کا ایک خاکہ دستاویز میں جڑ جاتا ہے، جس میں آپ اپنی ضرورت کے مطابق ہیڈنگ خود ٹائپ کرتے ہیں۔ بقیہ کام Automatic Table کی طرح ہی ہے۔

مشمولات کی فہرست ہٹانے کے لیے Table of Contents کے پل-ڈاؤن

تصویر WD-8.6: مشمولات کی فہرست کا خاکہ

مینو میں Remove Table of Contents ہدایت دیجیے۔

(ii) ٹیکسٹ جوڑنا اور فہرست اپڈیٹ کرنا (Adding Text and Updating Table): اگر آپ ہیڈنگ کے علاوہ کوئی اور ٹیکسٹ بھی مشمولات کی فہرست میں جوڑنا

تصویر WD-8.7: فہرست اپڈیٹ کرنے کے لیے ڈائیلاگ باکس

چاہیں، تو اس ٹیکسٹ کو چن کر Table of Contents بٹن کے بغل میں دیے گئے Add Text بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کیجیے۔ اس کے بعد Add Text کے نیچے دیے گئے Update Table بٹن پر کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر Update Table of Contents کا چھوٹا ڈائیلاگ باکس تصویر WD-8.7 کی طرح کھلتا ہے۔ Update Entire Table آپشن چن کر OK بٹن پر کلک کردیجیے۔ فہرست خود اپڈیٹ ہوجائے گی۔

اس کے علاوہ اگر آپ اپنی دستاویز میں ہیڈنگ کی جگہ بدلتے ہیں، تو مشمولات کی فہرست میں اس کے سامنے لکھے صفحہ نمبر کو بدلنے کے لیے بھی Update Table بٹن کا استعمال کیجیے۔ یہاں آپ کو Update Table of Contents ڈائیلاگ باکس میں Update page numbers only آپشن چننا ہوگا۔

یاد رکھیں، اگر آپ نے دستاویز میں Manual Table جوڑا ہے، تو اسے اپڈیٹ بھی آپ کو خود ہی کرنا ہوگا۔ اس کے لیے آپ Add Text اور Update Table بٹنوں کا سہارا نہیں لے سکتے۔

ان مشمولات کی فہرست کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں دی گئی ہیڈنگ اور سب-ہیڈنگ (Entries) ہائپرلنک کا کام کرتی ہے، یعنی جیسے ہی آپ ان پر کلک کرتے ہیں، دستاویز میں وہ موضوع (Topic) کھل جاتا ہے۔

(جاری)

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8/ آفس 2007)،
سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ وتعارف

معاصر تنقیدی رویے

مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 280، قیمت: 125.00 روپے، سنہ اشاعت: 2019
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف میاں سرائے سنبھل، یوپی

اردو میں تنقیدی نوعیت کی بھی اب کافی کتابیں آرہی ہیں مگر ابوالکلام قاسمی کی زیر تبصرہ کتاب اس حیثیت سے کافی اہمیت کی حامل ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ خود بھی اردو کی عظیم شخصیت ہیں پھر اس کتاب میں جن موضوعات پر آپ نے قلم اٹھایا ہے وہ بھی کلیدی نوعیت کے ہیں۔ اور وہ مغربی اور مشرقی تنقید کا حسین امتزاج ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد کے رشحات قلم ہیں جن میں آپ نے ابتدائی سطور میں ہی کتاب کی اہمیت بڑے حسین و خوبصورت انداز میں پیش کی ہے۔ پیش گفتار میں مصنف کتاب نے اس کا مقصد تحریر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تنقیدی رویے میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اردو کی ادبی تنقید اور مختلف نظری و عملی تنقیدی رویوں کی اہمیت اور قدر و قیمت نشان زد کی گئی ہے۔''
(کتاب ہذا ص viii)

اس کتاب میں کل اُنیس مضامین ہیں۔ جن میں پہلے چھ مضامین تنقید کے فن پر ہیں ان میں تنقید کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن کا اندازہ ان کے عنوانات سے لگایا جاسکتا ہے۔ جو اس طرح ہیں۔
ادبی تنقید کی نظریاتی بنیادیں، معاصر تنقید کی نارسائیاں، جدید اور مابعد جدید تنقید کی کشمکش، مابعد جدید تنقید: اصول اور طریقہ کار، اردو تنقید اور نوآبادیاتی فکر، ہیئتی تنقید کی مبادیات، یہ ایسے مضامین ہیں جن کے مطالعے سے قاری کو تنقید کو اچھی طرح سمجھنے اور اس کی ہیئت و مبادیات سے متعارف ہونے میں پوری رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ ان کے ذریعے تنقید کو پوری طرح جاننے اور اس کی باریکیوں کو پرکھنے میں اچھی طرح کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔

ان کے بعد نو (9) مضامین ایسے ہیں جن کے ذریعے اردو میں تنقید کے حوالے سے بڑی اہم شخصیات کو سمجھنے اور ان کے فکر و نظریات سے آگاہی حاصل کرنے میں آسانی ہوسکتی ہے۔ ان مضامین کے عنوان یہ ہیں۔ الطاف حسین حالی اور غزل کی تنقید، کلیم الدین احمد کی ناقدانہ انفرادیت، احتشام حسین کے تنقیدی رویے، آل احمد سرور اور نقد اقبال، گوپی چند نارنگ کا تنقیدی دائرۂ کار، سجاد ظہیر کے تنقیدی رویے، سردار جعفری کے تنقیدی رویے، اسلوب احمد انصاری کی تنقیدی فکر کا ارتقاء، وہاب اشرفی کی ناقدانہ شناخت۔ ان مضامین کے عنوانات سے ان کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قارئین یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ان مضامین میں تقریباً سبھی اہم تنقیدی شخصیات کے فکر و فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے بعد قدیم شعری متن اور جدید تعبیری رویے، نقد میر کے بدلتے ہوئے رویے، میر انیس کا ناقدانہ شعور، تانیثیت: نظریہ اور تنقید کے عنوان سے، چار اور اہم مضامین دیے گئے ہیں۔ جن میں پہلے مضمون میں اردو کے قدیم شعری متن کو جدید انداز پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے مضمون میں میر کے ناقدانہ شعور کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔ تیسرا مضمون میر انیس کے ناقدانہ شعور کے تعلق سے ہے۔ اس حصے کے چوتھے مضمون میں تانیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس کے نظریہ و تنقید کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ یہ چاروں مضامین بھی اپنے اپنے موضوع پر بڑے اہم ہیں۔

اس کتاب کے ذریعے جہاں ہمیں تنقید کے تعلق سے بہت اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں وہیں کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جو اردو کے کلیدی اہمیت کے حامل تنقید نگاروں کا تعارف کراتے ہیں۔ ان کے ذریعے قارئین کو ایسے ناقدین کے فن کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے جو اردو میں تنقید نگاری کی حیثیت سے ایک سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں حالی، کلیم الدین احمد، احتشام حسین، اور آل احمد سرور جیسے قد آور ناقدین کے ساتھ ہی عصر حاضر کے اہم نقاد وہاب اشرفی، گوپی چند نارنگ، سجاد ظہیر اور اسلوب احمد انصاری کی شخصیت وفن سے متعارف ہونے کا بھی موقع ملتا ہے۔ فن تنقید پر ایک مضمون ''ہیئتی تنقید کی مبادیات'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں آسکر وائلڈ کا قول بھی نقل کیا گیا ہے جس میں وہ تنقید کی ہیئت کو ان الفاظ میں واضح کرتا ہے:

''ہیئت ایک اسطور ہے اور یہ اسطور ہی زندگی کے سربستہ راز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کوئی ہیئت پرستی سے اپنی بات شروع کرے تو پھر فن کے اندر کوئی ایسا راز باقی نہ رہ جائے گا جو اس پر منکشف نہ ہوجائے۔'' (کتاب ھذا ص 73)

اس مضمون میں مغربی تنقید کی روشنی میں تنقید کی ہیئت و مبادیات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جس کے ذریعے رینسم، آسکر وائلڈ، رچرڈز، ولیم ایمپسن، جان کرو رینسم، ایلین ٹیٹ، رابرٹ پین وارن جیسے معروف مغربی نقادوں کے فن اور نظریات کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ اور تنقید کی ہیئت کے تعلق سے ان کے نظریات منظر عام پر آتے ہیں۔ یہ بھی مغربی تنقید کے اہم ستون ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب مشرقی و مغربی تنقید نگاروں کی شخصیت وفن اور ان کے افکار و نظریات کا حسین مجموعہ ہے۔ جن کے ذریعے قدیم و جدید تنقید کو بخیر و خوبی جاننے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تنقیدی ذوق رکھنے والے قارئین کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بڑا ہی مفید و سودمند ثابت ہوگا۔

یہ کتاب اپنے مشمولات کے حوالے سے بڑی اہم اور قابل قدر ہے۔ جس کا ہر مضمون اپنے موضوع پر سند کا درجہ رکھتا ہے۔ اور اس کے ذریعے اردو تنقید کے کسی نہ کسی گوشے پر سیر حاصل بحث کرتا ہے۔ غرض یہ کہ تنقیدی مضامین پر محیط 280 صفحات پر

مشتمل یہ کتاب ہر طرح سے اس لائق ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ کتاب کونسل کے ذریعے اس کی کم قیمت والی اسکیم کے تحت شائع کی گئی ہے۔ اس لیے اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کو آسانی سے خریدا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب کونسل کے معیار پر بڑی حسین اور دلکش طباعت سے مزین ہے۔ اردو قارئین بالخصوص تنقیدی مزاج رکھنے والے شائقین سے التماس ہے کہ کتاب کو خرید کر اردو دوستی کا ثبوت دیں۔

فرہنگ مولانا ابوالکلام آزاد

(جملہ ادبی تصانیف کی روشنی میں)

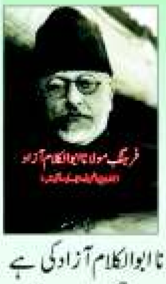

مصنف: رفیع اللہ مسعود

صفحات: 644، قیمت: 290 روپے، اشاعت اول: 2019

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی، S-2/5A تیسری منزل

فاطمہ اپارٹمنٹ، جوگا بائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی

برصغیر کی معتبر اور مستند شخصیات میں ایک اہم شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی ہے جن کی ذات سے ہندوستان کا تقریباً ہر ذی شعور شہری اور تعلیم یافتہ طبقہ اچھی طرح واقف ہے۔ یہاں نہ تو شخصیت اور نہ ہی ان کی تمام علمی کاوشوں کا احاطہ مقصود ہے بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ نئی نسل کے جواں سال اسکالر ڈاکٹر رفیع اللہ مسعود نے مولانا آزاد کی تمام تر علمی اور ادبی تصانیف کی روشنی میں ایک فرہنگ تیار کی ہے جسے 'فرہنگ مولانا ابوالکلام آزاد' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ کتاب ایک تحقیقی نوعیت کی کتاب ہے جسے مولف نے انتہائی جانفشانی سے بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ مولانا آزاد کی شخصیت جس طرح قاموسی تھی اسی طرح اس کتاب کی حیثیت بھی ایک قاموس کی ہے۔ مولانا آزاد کو بیک وقت جن زبانوں پر عبور حاصل تھا ان میں اردو، عربی اور فارسی نمایاں ہے۔ مذکورہ زبانوں کے علاوہ ان کی تحریروں میں جن دیگر بیرونی زبانوں کی آمیزش ہے ان میں ترکی، انگریزی، عبرانی اور فرانسیسی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں مذکورہ زبانوں کے محاورات اور ضرب الامثال کا جس کثرت سے استعمال کیا ہے رفیع اللہ مسعود نے ان تمام کا تفصیلی احاطہ اس کتاب میں کیا ہے۔ محاورات اور ضرب الامثال کے علاوہ اردو، عربی، فارسی اور ہندی کے ساتھ جن دیگر زبانوں کے الفاظ وتراکیب اور اصطلاحات کا استعمال مولانا آزاد نے اپنی تصنیفات وتالیفات میں کیا ہے مولف نے ابجدی ترتیب کے ساتھ جہاں جہاں جن جن معنوں میں استعمال ہوئے ہیں ان کا تحقیقی انداز میں احاطہ کیا ہے۔ مولانا آزاد کی تحریروں کی تفہیم عام قاری کے لیے انتہائی مشکل امر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں عربی وفارسی کے ثقیل اور ادق الفاظ وتراکیب کی کثرت پائی جاتی ہے، اسی لیے ایک عام اور ادنیٰ قاری اس کے معانی اور مفاہیم تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چند عربی کے ثقیل مفردات اور مرکبات کے نمونے ملاحظہ کیجیے: تعقبات، تحمیق، تفہیمات، تشددات بدعیہ، تنازع فی الدین، تداوی ارواح وقلوب، تلصص تشکیکات، تفانی فی السنت، تفضیل اصحاب عزائم دعوت، خزینہ دفاع حقوق مطابع وغیرہ۔ مذکورہ تمام مفردات ومرکبات کو مولانا آزاد نے اپنی تحریروں میں جس طرح برتا ہے اس سے ان کی تحریر کی چاشنی کم ہونے کے بجائے مزید نکھرتی معلوم ہوتی ہے۔ رفیع اللہ مسعود نے مولانا آزاد کی جملہ علمی وادبی تصانیف کی روشنی میں فرہنگ تیار کر کے ایک عام قاری کے تفہیمی مسائل کو کچھ حد تک آسان کر دیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو ترتیب دینے میں جن دیگر معاون کتابوں سے اخذ واستفادہ کیا ہے اس کا مکمل حوالہ بھی دیا ہے۔ مولف نے ایک بڑا کام یہ کیا ہے کہ ایک ہی کتاب کے مختلف نسخوں کے اختلاف صفحات، مضامین اور مصطلحات ومرکبات کو نہ صرف ایک دوسرے سے ملا کر دیکھا ہے بلکہ اسے رد وقبول کے مرحلے سے گزار کر اصل تک رسائی حاصل کی ہے۔

مولانا آزاد کی تحریروں میں جہاں جہاں اردو، عربی اور فارسی کے اشعار استعمال کیے گئے ہیں مولف نے ان کے اصل ماخذ تک رسائی حاصل کی ہے اور ان کے مراجع کا ذکر کر کے محققین اور عام قارئین کے مشکلات کو نہ صرف دور کیا ہے بلکہ ان کے معنی اور مفاہیم کا ذکر کر کے مزید آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ مولف نے ان آیات اور احادیث کے معانی اور مطالب کی صراحت کر کے قارئین کے لیے بڑا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر رفیع اللہ مسعود نے اپنے مقدمے میں 'لغت' اور 'فرہنگ' کے مابین جو بنیادی فرق ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'لغت کسی زبان میں مستعمل ہونے والے معنی اور معنی کے ہر ممکنہ پہلو کا احاطہ کرتی ہے اور اس کے عام معانی کے ساتھ وہ معنی بھی بیان کیے جاتے ہیں جو تعلیم یافتہ طبقے میں رائج ہیں، جب کہ فرہنگ میں الفاظ کے محض وہی معانی بیان کیے جاتے ہیں جن میں وہ لفظ اس خاص جملے یا شعر یا خط میں مستعمل ہوا ہے'۔

مصنف نے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ 'فرہنگ مولانا ابوالکلام آزاد' کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں مختلف زبانوں مثلاً اردو، عربی، فارسی، ہندی، ترکی، انگریزی، عبرانی، فرانسیسی، سنسکرت وغیرہ کے الفاظ، جملے، تراکیب، اصطلاحات، محاورات اور ضرب الامثال وغیرہ کا تفصیلی احاطہ ابجدی ترتیب میں کیا گیا ہے ساتھ ہی ان کے معانی اور مفاہیم کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں مولانا آزاد کی تحریروں میں مستعمل عربی کے اشعار کی وضاحت کی گئی ہے اور ان کے اردو ترجمے بھی پیش کیے گئے ہیں اس کے علاوہ شاعر کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ جب کہ تیسرے حصے میں مولانا آزاد کی تحریروں میں فارسی کے جو اشعار استعمال کیے گئے ہیں ان کا اردو ترجمہ کرتے ہوئے اس شعر کے خالق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کتاب کے ابتدا میں 'فرہنگ مولانا ابوالکلام آزاد پر دو باتیں' کے عنوان سے پروفیسر کوثر مظہری کی جامع تحریر شامل ہے جو اس کتاب اور صاحب کتاب کی خوبیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب درس وتدریس سے وابستہ اساتذہ اور طلبا وطالبات کے لیے انتہائی سودمند ہے۔ ان محققین کے لیے اور بھی زیادہ کارآمد ہے جو مولانا آزاد کی تحریروں کے حوالے سے کچھ بھی کام کر رہے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159
E-mail:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

سرسید کی لبرل، سیکولر اور سائنسی طرز فکر

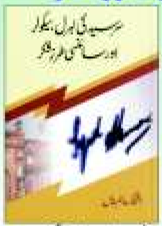

مصنف: افتخار عالم خاں

قیمت: 180 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصر: فیروز ہارونی

پی ایچ ڈی اسکالر، دہلی یونیورسٹی دہلی

سرسید احمد خاں پر دنیا بھر میں سیکڑوں لوگوں نے دسیوں زبانوں میں کام کیا ہے لیکن جتنا کام سرسید پر اردو زبان میں ہوا ہے اتنا کام کسی دوسری زبان میں نہیں ہوا ہے۔ اسی اردو زبان میں ایک شخص ایسے ہیں جنھوں نے سرسید کو ایک نئے زاویہ سے دیکھا اور لوگوں کو دکھایا بھی جس کو لوگ ماہر سرسیدیات کے نام سے بھی جانتے ہیں۔ پروفیسر افتخار عالم خاں نے سرسید پر متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں سرسید کا نظریہ تعلیم، سرسید اور ہندوستانی نظام زراعت، سرسید اور جدیدیت، سرسید تحریک کا سیاسی اور سماجی پس منظر، سرسید دروں خانہ، سرسید اور فن تعمیر، مسلم یونیورسٹی کی کہانی وغیرہ قابل ذکر ہیں ان تمام کتابوں کو پڑھیے جو آپ کو سرسید بالکل ایک نئے زاویہ سے سمجھنے کو ملیں گے۔

زیر نظر کتاب 'سرسید کی لبرل سیکولر اور سائنسی طرز فکر' پروفیسر افتخار عالم خاں کی ایک مایہ ناز کتاب ہے۔ کتاب کا پیش لفظ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے لکھا ہے۔ سرسید کے لبرل سیکولر اور سائنسی فکر کو سمجھانے کے لیے مصنف نے کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے پہلے باب میں سرسید کے جدید اور لبرل رویے کو تفصیل سے دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اس باب میں سرسید کے نظریہ دین و دنیا، سرسید اور ارکیالوجی، سرسید اور تھیٹر، سرسید اور تعلیم نسواں، سرسید اور مس میری کارپنٹر، سرسید اور جدیدیت کو مختلف کتابوں سے اور سرسید کے مختلف اقوال و افعال و دیگر مضامین سے بہترین انداز سے ثابت کیا گیا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب 'سرسید اور سیکولرزم' ہے اس باب کے تحت سرسید اور سیکولرزم، سرسید اور قومیت کا تصور۔ سرسید اور ہندوستان کا تصور، سرسید اور قومی یکجہتی وغیرہ مضامین کے تحت سرسید کے سیکولر انداز فکر اور سرسید کے سیکولر چہرے کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ باب اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ اس باب میں دلائل پیش کیے گئے ہیں کہ سرسید دو قومی نظریے کے کبھی بھی حامی تھے ہی نہیں۔

تیسرے باب میں 'سرسید کے ذریعے دیہی عوام کے مسائل' کو لکھا گیا ہے جس کے تحت سرسید اور زراعت، گوبر کی کھاد کا استعمال، تندرستی کے لیے صاف پانی کی ضرورت، سماجی مسائل کا عکس سوسائٹی کے آئینے میں وغیرہ عناوین سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ سرسید عوام کے عمومی اور خصوصی دونوں مسائل سے متعلق کتنے سنجیدہ تھے۔

کتاب کا چوتھا باب 'سرسید پر تنقید کی تفسیر' ہے اس باب میں انگریزوں کی جانب سرسید کا رویہ، ہندوستانیوں کا خون، سرسید پر مسلم پرستی کا الزام، سرسید اور نیشنل کانگریس وغیرہ مضامین ہیں یہ باب اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ ہندوستان کے بہت سارے مصنفین نے سرسید کو کئی بار انگریزوں کا مرید اور کانگریس کے مخالف کے طور پر نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں مشہور کیا ہے حالانکہ حقیقی امر اس الزام کے بالکل خلاف ہے اس باب میں سرسید کے انگریزوں سے اور کانگریس سے تعلقات کو بہتر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

آخری باب جو سب سے اہم باب ہے 'سرسید کی سائنسی طرز فکر' اس باب کے تحت سرسید کے مذہب اور سائنس، سرسید کی سائنسی طرز فکر، سرسید اور عصری سائنسی نظریات وغیرہ مضامین ہیں جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ سرسید کو سائنس سے کتنی دلچسپی تھی کئی بار سرسید پر الزام لگتا ہے کہ سرسید نئی نئی سائنسی ایجادات کے قطعی مخالف تھے بلکہ حقیقت بات اس کے بالکل خلاف ہے سرسید ہر نئی چیز کو من و عن قبول کرنے کے قائل تھے۔

سرسید احمد خان ایک لبرل سیکولر اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے کتاب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح سے سرسید نہ صرف ہندو مسلم بلکہ پورے ہندوستانیوں کو ایک ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی نظر میں سبھی قوم و ملت کے لوگ ایک جیسے تھے چاہے وہ کسی بھی مذہب کسی بھی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں۔ کتاب میں پروفیسر افتخار عالم خاں سرسید کے مضمون 'رسم و رواج کا فلسفہ اور اس میں اصلاح کی ضرورت' کے سلسلے میں لکھتے ہیں ''اس مضمون میں سرسید نے راجہ رام موہن رائے کے ساتھ ساتھ فرداً فرداً بابو کشیپ چندر، ایشور چندر ودیا ساگر، تلیش بھٹاچاریہ، جی رام تنولا ہیٹری، ستیندر ناتھ ٹیگور اور سوامی دیانند سرسوتی جیسے (روایت پرستی کی مخالفت کرنے والے) روشن خیال افراد کے اصلاحی کارناموں کی بھرپور ستائش کی''

پروفیسر افتخار عالم خاں نے کتاب کو آسان اور سلیس زبان میں لکھا ہے۔ کچھ جگہوں پر جہاں انگریزی الفاظ کی ضرورت پڑی ہے وہاں بخوبی استعمال کیے گئے ہیں۔

بہر کیف پروفیسر افتخار عالم خاں قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے سرسید کے ایک اچھوتے پہلو اور طرز فکر پر کتاب لکھی ہے۔

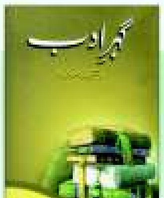

گہر ادب (تنقیدی مضامین)

مصنف: ڈاکٹر سرور حسین

صفحات: 230، قیمت: 280 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: ڈاکٹر عبدالناصر، C-24، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

پیش نظر کتاب 'گہر ادب' ڈاکٹر سرور حسین کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مختلف اوقات میں لکھے تھے۔ ان کی کل تعداد 14 ہے۔ ان میں سے کئی مضامین کافی عمدہ ہیں۔ مثلاً 'عصر حاضر میں فیض کی معنویت'، 'ظریات مانپوری کی عصری معنویت'، 'کلام عاجز کا جدلیاتی مطالعہ'، 'وہاب اشرفی کا سماجی و تہذیبی رویہ'، 'لکشمن ریکھا کے پار — ایک تہذیبی و تاریخی بحران کا منظرنامہ' اور 'جہد زندگی کا شاعر — اویس احمد دوراں اور اس کی آپ بیتی' اچھے مضامین میں شامل ہیں۔

'عصر حاضر میں فیض کی معنویت — مکتوبات فیض کے آئینے میں' کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فیض کی شخصیت محض ایک ترقی پسند شاعر کے علاوہ بھی بہت کچھ تھی۔ انھیں نثر و نظم دونوں پر عبور حاصل تھا۔ چنانچہ ان کی شخصیت کا حقیقی عکس ان کے خطوط کا مجموعہ 'صلیبیں میرے دریچے میں' میں ابھر کر سامنے آتی ہے جو انھوں نے اپنی شریک حیات ایلیس فیض کو لکھے تھے جب وہ پاکستان کی جیلوں (حیدرآباد، کراچی اور لاہور) میں چار سالہ قید و بند کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ ان دنوں وہ جس کرب تنہائی سے دوچار تھے اس کا اظہار ان کے خطوط کے مطالعے سے ظاہر ہے بقول مصنف ''ایک وفادار شوہر، ایک شفیق باپ' ایک دردمند دل رکھنے والا شفیق انسان بھی تھا جس کا دل اپنے متعلقین کی کس مپرسی اور بے سروسامانی پر ہی نہیں بلکہ بلا امتیاز ہر مجبور و محکوم انسان کے لیے ہر وقت کڑھتا اور دھڑکتا رہتا تھا۔'' (گہر ادب، ص 41)

فیض کا ذہنی شعور اعلیٰ اقدار پر مبنی تھا۔ اس لیے وہ گزرتے ہوئے وقت اور حالات کا مشاہدہ بڑی باریک بینی سے کیا کرتے تھے۔ ان کے سوچنے کا انداز کسی بڑے دانشور یا مفکر کا تھا۔ وہ اپنے غم کو غم کائنات اور کائنات کے غم کو اپنا غم تصور کرتے تھے۔ چنانچہ 'نثار میں تری گلیوں کے اے وطن... والی نظم' میں بھی اس کا اظہار کیا ہے۔

اس مجموعے میں شامل ایک مضمون 'ظریات مانپوری کی عصری معنویت' کے عنوان

سے ہے جیسا کہ کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ طنز و مزاح پر مشتمل کتاب ہے۔ یہاں مزاح کی شیرینی موجود ہے اور کسی کو بھی موضوع مذاق بنانا یا دل شکنی کرنا ان کا مقصد نہیں تھا۔ یہاں انھوں نے محض اپنے تجربات زندگی کو پیش کیا ہے جس میں عصر حاضر کے تضادات کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ طنزیات مانپوری میں شامل مضامین میں پنک آشرم، اینٹی فادر کانفرنس، اپٹوڈیٹ شاعری، صاحب کا کتاب، اسٹوڈنٹ لائف، سفارش، میرا سفر، اسٹیشن کی سیر اور انٹرویو کا نام آتا ہے۔

انجم مانپوری نے برطانوی عہد میں زندگی بسر کی تھی جب مہاتما گاندھی و دیگر کانگریسی لیڈران اپنی تحریکیں چلا رہے تھے، انھوں نے اس عہد کی بے اعتدالیوں پر اس طرح خامہ فرسائی کی کہ ان کی تحریریں آج بھی جاذب نظر اور زمانۂ حال کی معلوم ہوتی ہیں جسے ہم ان کا ایک قابل قدر کارنامہ کہہ سکتے ہیں۔

'کلیم عاجز کا جدلیاتی مطالعہ' نامی بھی اپنی جگہ خاص ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک بیدار مغز اور پختہ کار انسان تھے۔ تقسیم ہند کے ہولناک المیے کو نہ صرف برداشت کیا بلکہ اسے اپنی شاعری میں جذب کردیا۔ اس لیے ان کی شاعری اپنے عہد کے دیگر شعرا سے ممتاز رہی۔ کلیم عاجز کی شاعری میں تمام عالم کا درد و کرب سمایا ہوا ہے لیکن وقت اور حالات کے منفی اثرات کو قبول کرنے سے انھوں نے انکار کردیا بلکہ شاعری کے حوالے سے اپنے ساتھ دوسروں کے زخموں پر بھی مرہم رکھنے کا انھوں نے کام کیا۔ اگر دیکھا جائے تو ان کی شاعری کی بنیاد جبر و استحصال، فرقہ پرستی اور منافرت کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سدا پر عزم رہے جیسا کہ ان اشعار سے بھی ظاہر ہے۔

عشق کی بربادیاں قسمت سے ہوتی ہیں نصیب — جس قدر بگڑیں گے اتنا ہی سنورتے جائیں گے
عاجز غم شکست محبت ہے عارضی — ہم نے یہ کھیل بارہا جیتا ہے ہار کے

اگلا مضمون 'وہاب اشرفی کا سماجی و تہذیبی رویہ' بھی اہم ہے۔ 'قصہ بے سمت زندگی کا' ان کی خودنوشت ہے جس میں ان کے فکر و نظر کے نقوش تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اس سوانح میں ان کے آبائی وطن کاکو اور بی بی پور کا ذکر آتا ہے۔

'لکشمن ریکھا کے پار' ایک تہذیبی و شناختی بحران کا منظرنامہ' کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں الیاس احمد گدی کے سفرنامہ کو پیش کیا گیا ہے۔ یہاں الیاس احمد گدی ایک سیاح کی حیثیت سے بنگلہ دیش کے مختلف علاقوں کی سیاحت کرتے نظر آتے ہیں۔

اس طرح اس سفرنامے کی اہمیت کافی بڑھ جاتی ہے جس میں ایک تہذیب کے خاتمے کا پورا المیہ نظر آتا ہے۔ مصنف نے اس سفرنامے کا بغور مطالعہ کر کے الیاس احمد گدی کے سفرنامے کو حیات جاودانی بخش دی ہے۔ اسی طرح مصنف کا اویس احمد دوراں پر لکھا گیا مضمون بھی ان کے گہرے ادبی مطالعے کو نمایاں کرتا ہے۔ مجموعہ میں شامل دیگر مضامین بھی اپنی جگہ خوب ہیں۔ زبان و اسلوب کے لحاظ سے بھی یہ مجموعہ قابل قدر ہے۔

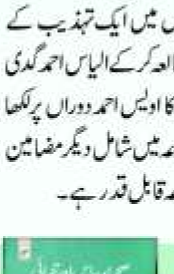

فکشن

صحرا، پیاس اور تنہائی

مصنف: شاکر کریمی

صفحات: 160، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: اسماء، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'صحرا، پیاس اور تنہائی' اردو کے کہنہ مشق افسانہ نگار جناب شاکر کریمی صاحب کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے جسے حال ہی میں اردو ڈائریکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے مالی تعاون سے شائع کیا گیا۔ اس کتاب سے قبل مصنف کے تین افسانوی مجموعے 'پردے جب اٹھ گئے 1963'، 'اپنی آگ 1979' اور 'ایک دن کا لمبا سفر 2014' منظر عام پر آ چکے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ ایک شعری مجموعہ 'ریزہ مینا 1985' اور ایک ناول 'جشن کی رات 2017' بھی زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔

شاکر کریمی کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے 1960 سے لکھنا شروع کیا اور اس دوران ان کا تخلیقی سفر جاری رہا۔ ان کے افسانے ملک کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں پابندی کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے ادب کے قارئین میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم کرلی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'صحرا، پیاس اور تنہائی' 21 افسانوں پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں 'پیش لفظ' کے تحت افسانہ نگاری کے فن اور موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔ افسانہ نگار کا خود اپنے افسانوں پر اظہار خیال کرنا اور غیر جانب داری سے کرنا ہمت کی بات ہے۔ کتاب کے بیک جیج پر پروفیسر شہزاد انجم صاحب کی رائے اس اعتبار سے اہم اور معلوماتی ہے کہ اس میں بہت ہی جامعیت اور اختصار سے شاکر کریمی کی افسانوی جہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب میں شامل افسانوں کی قرأت سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاکر کریمی نے اپنے افسانوں کے موضوعات سماجی اور معاشرتی زندگی سے اخذ کیے ہیں جس میں انسانی زندگی اپنی تلخیوں، پیچیدگیوں اور محرومیوں کے ساتھ رقصاں ہے۔ ایک حساس فنکار کی طرح شاکر کریمی کی نظر ہمیشہ معاشرتی مسائل اور سماجی احوال و کوائف کے گرد طواف کرتی نظر آتی ہے، وہ جب بھی کسی حادثہ، سانحہ یا واقعہ سے متاثر ہوتے ہیں اسے اپنے افسانوں کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کے افسانے مختلف نوعیت کے حامل ہیں جن میں یکسانیت کے بجائے نیرنگی کا احساس نمایاں ہے۔ کہیں دیہی زندگی میں پنپنے والی حقیقی محبت کا بیان ہے تو کہیں شہر کی ہوس کاریوں کا ذکر، کہیں مرد و عورت کے تعلقات کی عکاسی ہے تو کہیں ازدواجی زندگی کے مسائل، غرض انھوں نے اپنے افسانوں میں سماج میں رونما ہونے والے نت نئے موضوعات، مسائل و آلام اور حالات و واقعات کو افسانے کے کینوس میں اتارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

افسانہ 'صحرا، پیاس اور تنہائی' ترتیب کے لحاظ سے پانچواں افسانہ ہے جس میں مصنف نے شہروں میں پروان چڑھنے والی کھوکھلی محبت کی عکاسی کی ہے اس کے بر خلاف افسانہ 'بدلہ' میں دیہی زندگی میں پنپنے والی حقیقی محبت کو دکھایا گیا ہے جہاں 'بلونت سنگھ' جیسا نوجوان ہے جو بجلی سے محبت کرتا ہے لیکن اسے پانے کے بجائے اس کی شادی کے لیے اپنی زمین جائداد تک قربان کردیتا ہے جو، اس کی زندگی گزارنے کا واحد اثاثہ تھی۔ اس موقع پر مصنف نے شہری اور دیہی زندگی کے رہن سہن، طور طریقے اور عادات واطوار کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

شاکر کریمی انسانی نفسیات کے بھی نبض شناس ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں مرد و عورت کے تعلقات کو مختلف رنگوں اور مختلف نوعیتوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں عورت 'محبوبہ' کے علاوہ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے طور پر بھی سامنے آتی ہے۔ افسانہ 'زخم اور مرہم'، 'واپسی' اور 'تازیانہ' اس کی بہترین مثالیں ہیں جس میں بھائی بہن کے پاکیزہ جذبات و تعلقات کی عکاسی کی گئی ہے۔

مجموعے میں شامل کچھ افسانے ایسے بھی ہیں جن میں انسانی سماج کے منافقانہ رویوں اور فرد کی ذات کے کھوکھلے پن کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں خود فریبی اور ہوس پرستی کا ماحول ہے، جہاں مغربیت اس حد تک سرایت کر چکی ہے کہ انسان کے رہن سہن، طور طریقے اور لباس کے ساتھ ساتھ ان کے فکر و خیالات میں بھی مغربیت داخل ہو چکی ہے۔ افسانہ 'ہوس کار' اور 'گھٹی ہوئی چیخ' اس کی عمدہ مثالیں ہیں، جس میں بدلتے ہوئے سماج کی کریہہ تصویریں دکھائی گئی ہیں۔ اول الذکر میں مرد کی عورتوں کے تئیں جنسی بھوک اور ہوس کو دکھایا گیا ہے اور موخر الذکر میں دو دوستوں کے مکالموں کے

ذریعے موجودہ عہد میں مغرب پرستی کی گھناونی شکلیں دکھائی گئی ہیں۔

مجموعے میں شامل دیگر افسانے 'بے بسی'، 'فنکار'، 'خوبصورت نام'، 'احساس ندامت'، 'اور یہ مجبوری'، میری موت' اور' زندہ آباد'وغیرہ اپنے موضوع، اسلوب اور تکنیک کے سبب منفرد ہیں جس سے مصنف کی زندگی کے تئیں گہری بصیرت اور فنی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔

درد کے سائے

مصنف: گیان چند کیتھ نشتر دہلوی

صفحات: 194، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: ساحر داؤدنگری

275/6، للیتا پارک، لکشمی نگر، دہلی 110092

'درد کے سائے' گیان چند کیتھ نشتر دہلوی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں اپنے گردوپیش کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ ان کے افسانوں میں گھر، خاندان، سماج کے ماحول نیز ذاتی تجربات ومشاہدات کا مطالعہ کثرت کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ کہانی 'مرغ مسلم' کہانی میں رکشا ڈرائیور کی ٹکر ماروتی کار والے سے ہوجاتی ہے۔ کار مالک اسے سخت سست کہتا ہے تو وہ بتاتا ہے کہ صاحب میری ماں کی دوا کے پیسے میرے پاس نہیں ہیں۔ غربت کی وجہ سے میں نے ان بھی نہیں کھایا۔ وہ ترس کھا کر اسے سو سو کے دو کرارے نوٹ دیتا ہے تو وہ ایک ریسٹورنٹ میں جا کر مرغ مسلم اور بئیر منگاتا ہے۔ بیرے کے پوچھنے پر کہتا ہے جب تک بخیل اور بیوقوف قسم کی مخلوق اس دنیا میں موجود ہے تب تک ہم جیسے لوگ یوں ہی مرغ مسلم کھاتے رہیں گے۔

'درد کے سائے' اس کتاب میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ مصنف نے اسی افسانے کے تعلق سے اپنی کتاب کا نام 'درد کے سائے' رکھا ہے۔

'افوہ' جناب کس قدر روٹی ہوئی باتیں کررہے ہیں۔ ارے اگر تھوڑا سا وقت لگ بھی گیا۔ مجھے یہاں جناب کے پاس پہنچنے میں تو کون سا جہاز ڈوب گیا۔ تھوڑی تاخیر سے کیا آئی کہ طوفان ہی برپا ہوگیا۔ جناب بارش کا موسم ہے۔ پھر کہیں دور سے یہاں آنا ہے۔ درمیان میں کتنی ہی مشکلات کی دیواریں کھڑی ہیں۔ جگ کی رسوائی سے بھی بچنا ہے۔ جناب میں ایک لڑکا نہیں لڑکی کی حیثیت رکھتی ہوں۔ پھر بھی اگر تھوڑی سی دیر ہو بھی گئی تو کون سی قیامت آگئی؟ شوخی سے رچنا نے راکیش کے ماتھے پر لہراتے بالوں کو اپنے گورے گورے ہاتھوں سے ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔''

کہانی بدستور جاری ہے۔ مزاج کی تبدیلی ملاحظہ کیجیے۔ راکیش رچنا کے ساتھ رومانی کیفیت کا اظہار کرتا ہے تو رچنا کھردرے سے لہجے میں جواب دیتی ہے وہ دیکھنے لائق بات ہے۔

''چھوڑو بھی ان خشک باتوں کو آؤ موسم کی رنگینوں میں ڈوب جائیں۔ تھوڑا سا پیار کرلیں۔ راکیش نے رچنا کا موڈ بدلتے دیکھ کر مصنوعی قہقہہ لگاتے ہوئے رچنا کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ ''نہیں مسٹر راکیش۔ اب یہ سب کچھ نہیں چلے گا۔ تمہارے ماڈرن فلسفے نے مجھے بیدار کردیا ہے۔ ڈرامہ ختم ہوچکا ہے جناب عالی۔ میرے دماغ پر چھایا ہوا عشق کا بھوت اب بھاگ چکا ہے۔ اور تمہیں اس حقیقت سے آگاہ کردوں کہ اس ناچیز کی زندگی کا رخ بدل چکا ہے۔ لہذا اب میری راہ بھی تبدیل ہوگئی ہے۔ تمہارے خیالات کو میرا سلام۔ اور پھر رچنا نے اپنی جانب بڑھتے راکیش کے ہوس زدہ ہاتھ کو جھٹکے کے ساتھ پیچھے دھکیل دیا۔ مایوس راکیش نے اپنے ہاتھوں سے نکلتی چڑیا کو شپٹاتے ہوئے دیکھا جو اس کی پہنچ سے دور ہوتی چلی جارہی تھی۔

دوسرے افسانوں میں بھی افسانہ نگار معاشرہ کے افراد کو سامنے لاکر کھڑا کردیتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں وسعت اور تنوع ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی ناآسودگی، بے چارگی اور محرومی کی کرب ناک اور تلخ صورت حال کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کے بیشتر افسانے تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی پاسداری کرتے نظر آتے ہیں۔

گیان چند کیتھ نشتر دہلوی جہانِ افسانہ میں درخشندہ ستارے کی صورت اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے تمام افسانے اپنے معانی ومطالب کے ساتھ بآسانی ترسیل کے مرحلے عبور کرجاتے ہیں۔ ان کے افسانے فنی رکھ رکھاؤ اور آب وتاب کے ساتھ اپنے موضوع کے اعتبار سے رواں دواں دکھائی دیتے ہیں۔

تاریخ

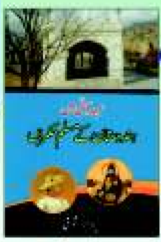

عہد وسطیٰ میں ہندوستان کے مسلم حکمراں

مصنف وناشر: پرویز اشرفی

صفحات: 272، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ملنے کا پتہ: اردو بک ریویو، 1739/104، دریا گنج، نئی دہلی-2

مبصر: محمد عارف اقبال، ایڈیٹر، اردو بک ریویو، نئی دہلی

ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کی آمد کا سلسلہ گیارہویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا؛ لیکن تاجر پیشہ مسلمانوں کی آمد کے آثار ساتویں صدی عیسوی میں ملتے ہیں۔ اس وقت کے ہندوستان کی جغرافیائی وسعت اور انتظام وانصرام کو آج کے ہندوستان پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ ساتویں صدی میں مسلمانوں کی آمد کی تاریخ درحقیقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہجرت سے مربوط ہے۔ اس نکتے کو سمجھے بغیر ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد یا مسلم حکمرانوں کی تاریخ کا ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ واضح ہو کہ ہجرت کے سات آٹھ سال کے اندر عرب کے سیکڑوں قبائل حلقہ اسلام میں شامل ہوگئے تھے۔ ان میں بڑے بڑے سرداروں نے وفود بھیج کر قبول اسلام کا اقرار کیا تھا۔ یمن اور حضر موت کے ساحلی باشندے بھی 9 اور 10 ہجری (630-631) میں مطیع اسلام ہوگئے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سب کے سب تجارت پیشہ قبائل تھے۔ ان کے جہاز فارس اور مصر ہی نہیں بلکہ سندھ، ملیبار، معبر، سرندیپ اور چین وغیرہ ممالک میں آیا جایا کرتے تھے۔ تجارت پیشہ قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگ جن جن علاقوں میں پہنچے وہاں اسلام کی آواز کو بھی پہنچایا۔ ان کے ذریعے خیرالقرون ہی میں ظہور اسلام کی کیفیت ہندو سندھ سے گزر کر جزیرہ سرندیپ (موجودہ سری لنکا) تک پہنچ گئی تھی۔

زیر نظر کتاب 'عہد وسطیٰ میں ہندوستان کے مسلم حکمراں' پر اظہار خیال سے قبل اس طویل تاریخی تمہید کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کو ان دنوں مخصوص حلقے کی طرف سے 'مسلمان حملہ آوروں' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ جزوی حقیقت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ایک باعزت پیشہ تجارت کے سبب ہوئی۔ تجارت کے ساتھ ہی انھوں نے اشاعت اسلام کا کام کیا۔ 'حملہ آوروں' کا معاملہ خالصتاً حکمرانی کی سطح پر ہے۔ کسی مسلم حکمراں کی تاریخی غلطی سے بلاشبہ صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اس تعلق سے دو ہی نام قابل ذکر ہیں اول محمد بن قاسم اور دوم محمود غزنوی۔ محمد بن قاسم، حجاج بن یوسف ثقفی کا داماد تھا۔ اسی نے عرب تاجروں کے اہل وعیال کے لٹیروں کو 93 ہجری (713) میں سندھ میں راجا داہر اور اس کے بحری قزاقوں کو سبق سکھایا تھا۔ غزنی کا سپہ سالار محمود غزنوی (و: 1030) نے ہندوستان پر 17 مرتبہ حملہ کیا۔ اسی نے سومناتھ مندر پر حملہ کرکے وہاں کے سونے جواہرات کو لوٹ لیا تھا۔ محمود غزنوی بلاشبہ فطرتاً ایک اچھا اور سخی انسان تھا۔ علم وادب کی اس نے سرپرستی کی۔

لیکن اس کے حملہ آور ہونے کو جھٹلایا نہیں جاسکتا اور اس بنیاد پر ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کو مشکوک کر دینا، تاریخ کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ یہ ایک شخصی واقعہ تو ہے لیکن اس کا اسلام اور عام مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ محمود غزنوی کے بعد ہندوستان میں حکومت قائم کرنے والے دیگر مسلمان حکمرانوں پر 'حملہ آور' ہونے کا الزام عاید نہیں کیا جاسکتا۔

زیر نظر کتاب کے مصنف پرویز اشرفی نے عام تعلیم یافتہ حضرات کو کم سے کم وقت میں ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی تاریخ سے واقف کرانے کا ایک اہم فریضہ ادا کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کے بعد جن حکمرانوں پر بھرپور تاریخی مستند معلومات فراہم کی ہے ان کے نام سلسلے وار ذیل میں دیے جارہے ہیں:

شہاب الدین محمد غوری، قطب الدین ایبک، شمس الدین التتمش، رضیہ بیگم، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن، خاندانِ غلاماں، جلال الدین فیروز خلجی، علاؤالدین خلجی، غیاث الدین تغلق، محمد بن تغلق، فیروز شاہ تغلق، سیّد خاندان، لودھوی خاندان وغیرہ۔ مغلیہ خاندان میں ظہیر الدین محمد بابر (1483-1530) ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا بانی تھا۔ بابر کی شخصیت اتنی بلند، شفاف اور ذہانت سے لبریز تھی کہ مورخین اسے دنیائے تاریخ کی پرکشش ترین ہستیوں میں شمار کرتے ہیں۔ وہ علم وادب کا دلدادہ تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت نشین ہوا۔ تاہم ایک وقفے میں شیر شاہ سوری (1486-1545) ہندوستان کا حکمراں ہوا جس نے ہندوستان کی تعمیر میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ اس کی حکومت فرقہ وارانہ تعصب سے بالکل پاک تھی۔ پھر اس کے بعد مغلیہ حکومت میں اکبر، جہانگیر، ملکہ نور جہاں، شاہ جہاں، اورنگ زیب عالمگیر حکمراں ہوئے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور اورنگ زیب کی طویل حکمرانی کے بعد اس کے انتقال (1707) سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد محمد اعظم شاہ، بہادر شاہ اول، جہاں دار شاہ سے ہوتے ہوئے محمد شاہ (رنگیلے) اس کے بعد احمد شاہ بہادر، عالمگیر دوم، شاہ عالم دوم، اکبر شاہ دوم، پھر بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہی مغلیہ حکمرانی کے شاندار دور کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے میں بہادر شاہ ظفر (1757-1862، رنگون) کی قربانیوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ شعر وادب کے دلدادہ بہادر شاہ ظفر کا ایک معروف شعر ہے:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے　　دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

مصنف نے دو عنوان 'مغلیہ سلطنت کے روشن پہلو' اور 'مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب' پر بھی بڑی پُرمغز گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے جنوبی ہند کے دو بڑے مسلم حکمراں حیدر علی اور ان کے بیٹے شیر میسور فتح علی ٹیپو سلطان کے عہد کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔ آخر میں مصنف نے 'ہندوستان کو مسلم حکمرانوں کا تحفہ' کے عنوان سے مسلم حکمرانوں نے اس ملک ہندوستان کو جو نادر و نایاب چیزیں عطا کیں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم حکمرانوں نے ہندوستان کو نہ صرف اپنا مادر وطن تصور کیا بلکہ اس کی ترقی اور ارتقا میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔

یہ کتاب مستند مآخذ اور کتابیات (Bibliography) سے مزین ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کی تیاری میں محنتِ شاقہ سے کام لیا ہے اور تاریخ کی موٹی موٹی کتابوں سے آج کے اردو قارئین کو بے نیاز کردیا ہے۔ کتاب کی زبان عام فہم ہے۔ ہر شخص بہ آسانی اپنے ملک کے مسلم حکمراں کی تاریخ کو کم سے کم وقت میں مستند مآخذ کے ساتھ بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ مصنف کے 'پیش لفظ' سے قبل اس کتاب کی تقریظ مشرف عالم ذوقی کے قلم سے ہے۔ اس کا 'مقدمہ' شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی نے لکھا ہے۔ بعض مقامات پر پروف ریڈنگ کا سہو ہوگیا ہے۔ توقع ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کردی جائے گی۔

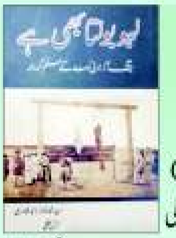

لہو بولتا ہے: جنگ آزادی ہند کے مسلم کردار

مصنفین: سید شاہنواز قادری، کرشن کلکی

صفحات: 550، قیمت: 500 روپے

ناشر: لوک بندھوراج نرائن کے لوگ، لکھنؤ۔ 226001 (یوپی)

مبصر: سلیم شیرازی، این۔103، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

'لہو بولتا ہے' تحریک آزادی کے مسلم مجاہدین کی وطن پرست خدمات کی مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوشیلسٹ تحریک کے سرگرم رہنما جناب سید شاہنواز قادری اور جناب کرشن کلکی کی مشترکہ طور سے تحریر کی گئی اس تصنیف میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے 1857 سے 1947 تک کے 90 برسوں کے حالات کا انتہائی غیر جانب دارانہ اور منصفانہ طریقے سے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس تصنیف کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ جہاں اس میں مسلم مجاہدین آزادی کی سرفروشانہ خدمات پر روشنی ڈالی گئی وہیں کسی بھی دوسرے فرقے کے مجاہدین آزادی کی خدمات پر کسی منفی تبصرے سے گریز کیا گیا ہے۔ تاہم جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے، اس میں ملک کی جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین کی خدمات پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم ایک ایسی قوم بنتے جارہے ہیں جس کا حافظہ دن بہ دن کمزور ہوتا جارہا ہے۔ اس لیے ہمیں ملک کے بےلوث اور سچے وطن پرست مجاہدین آزادی کی خدمات سے واقف کرانا میرے خیال سے کسی اہم قومی خدمت سے کم نہیں ہے۔ مصنفین نے انتہائی محنت، جانفشانی اور جاں سوزی کرکے ان گم نام مسلم مجاہدین آزادی کی خدمات کو اجاگر کیا ہے جو گمنامی میں ہی تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئے تھے۔ ان معنوں میں یہ تصنیف اپنی نظیر آپ ہی کہی جائے گی۔

تصنیف کے دوسرے پیش لفظ میں جناب افروز قادری چریاکوٹی نے غلط نہیں لکھا ہے کہ وطن عزیز کی جنگ آزادی میں 21 ہزار علمائے اسلام اور پانچ لاکھ مسلم مجاہدین آزادی نے مادر وطن کو فرنگی غلامی کے شکنجے سے آزاد کرانے کی تحریک میں اپنی جان عزیز کی بےلوث قربانیاں دے کر آزادی کی روشن صبح سے ہمکنار کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس تصنیف کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں مرد مجاہدین آزادی کے ساتھ ساتھ خواتین مجاہدین آزادی کی خدمات کا بھی انتہائی منصفانہ طور سے احاطہ کیا گیا ہے۔ 1857 سے 1947 تک کی 90 سالہ تحریک میں جہاں سیکڑوں مسلم خواتین نے بھی وطن عزیز کے لیے بیش قیمت خدمات کے نذرانے پیش کیے ہیں جب کہ ہزاروں مرد مجاہدین آزادی نے بھی وطن عزیز کی آزادی کے لیے سرروش خدمات انجام دی ہیں اور جان پر کھیلنے سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ مسلم مجاہدین آزادی نے مادر وطن کو فرنگی غلامی سے آزاد کرانے کی تحریک میں جہاں اپنی جان عزیز کی بےلوث قربانیاں دے کر ملک و قوم کو آزادی کی روشن صبح سے ہمکنار کیا ہے۔ اس تصنیف میں مرد مجاہدین آزادی کے سرفروشانہ کارناموں کے ساتھ ساتھ مسلم خواتین کی بےخوف جدوجہد کا بھی منصفانہ احاطہ کیا گیا ہے۔ فاضل مصنفین کے مطابق 1857 سے 1947 تک کے 90 سالہ دورِ تحریک میں 262 سے زائد مسلم خواتین مجاہدین آزادی نے بھی وطن عزیز کی آزادی کے لیے اپنی عزیز جانوں کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جبکہ ہزاروں مرد مجاہدین آزادی نے بھی وطن عزیز کی آزادی کے لیے سرفروشانہ خدمات انجام دیں اور بیشتر معاملات میں تو اپنی جانوں سے کھیل کر تحریک آزادی کے تئیں اپنی سچی خدمات پیش کیں۔

فاضل مصنفین کے مطابق 1857 کی جنگ آزادی کو باطل پرست انگریزوں نے تو غدر یا میوٹنی (Mutiny) کا نام دیا تھا لیکن یہ دراصل جنگ آزادی کا وہ آغاز تھا جس کی قیادت آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر مرحوم نے کی تھی۔ یہ جنگ محض دو برس کی مدت میں ملک کی فوجی چھاؤنیوں سے نکل کر پورے ملک میں پھیل گئی تھی۔ یہی وہ زمانہ

تھا جب عظیم مجاہد آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی نے سب سے پہلے دلی کی جامع مسجد سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا اور بہادر شاہ ظفر مرحوم کے ساتھ مل کر آزادی کی اس جنگ کو آگے بڑھایا تھا جس کے نتیجے میں پورے ملک کے مسلمان اپنی اپنی سطح پر جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لیے بے چین نظر آنے لگے تھے۔

کتاب میں تحریک آزادی کے مسلم مجاہدین آزادی کے حالات و واقعات کا حتی المقدور احاطہ کیا گیا ہے اور 1725 مسلم مجاہدین آزادی کے نام اور ان کے مختصر کوائف بیان کیے گئے ہیں لیکن میرے خیال سے تحریک آزادی کے حالات پر اس وقیع تصنیف میں بعض ابتدائی مجاہدین آزادی کے نام شامل نہیں ہوسکے ہیں۔ مثال کے طور پر دہلی کی شیعہ جامع مسجد کے امام شہید مولوی محمد باقر مرحوم جنھیں تحریک آزادی کے پہلے شہید صحافی کا اعزاز حاصل ہوا۔ شہید مولوی محمد باقر مرحوم اپنے اخبار میں انگریز حکومت پر کھل کر تنقید اور نکتہ چینی کیا کرتے تھے جس کی پاداش میں ان پر حکومت وقت کے خلاف بغاوت کا مقدمہ قائم کیا گیا اور فیصلے میں سزائے موت دی گئی۔ بالآخر انھیں توپ کے دہانے سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ اس کتاب میں تحریک آزادی، اس کے شرکا، مکاتیب فکر، نظریات و خیالات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ کل ملا کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جناب سید شاہنواز قادری اور جناب کرشن کلکی کی یہ مشترکہ تصنیف وطن عزیز کی تحریک آزادی کی تاریخ کے حوالہ جات کے لیے ناگزیر ہونے کا حکم رکھتی ہے۔

رپورتاژ

ادبی و تہذیبی رپورتاژ

مصنف: ڈاکٹر محمد ناظم علی

صفحات: 165، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: کے جی این پرنٹنگ پریس

مبصر: معصوم زہرا، 39۔ٹی، سیکٹر 7، جسولا وہار، نئی دہلی

زیر نظر کتاب میں حیدرآباد کی مختلف ادبی سرگرمیوں کو رپورتاژ کی شکل میں جمع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو ادبی پروگراموں کو رپورتاژ کی شکل میں جمع کرنے میں دلچسپی ہے۔ کیونکہ اس کو جمع کرنے سے سمینار یا کوئی بھی ادبی تقریب کی روداد صفحہ قرطاس پر آ کر نہ صرف محفوظ ہوجاتی ہے بلکہ آئندہ کے تشنگان ادب کی سیرابی کا سبب بھی بنتی ہے۔ گرچہ اس کتاب 'ادبی و تہذیبی رپورتاژ' میں محض ادبی تقاریب کو جگہ دی گئی ہے لیکن اس میں شخصیات کی جھلک کے ساتھ ادب کا معیار، ادب کی صورتحال اور امکانات کو سمجھنے کے لیے کافی کچھ موجود ہے۔ ان سب سے آگے نکل کر سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس طرح کے دستاویزات ادبی سرگرمیوں، کوششوں اور نتائج کا اندازہ لگانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ مصنف کی وابستگی اردو درس و تدریس سے بھی رہی اور انھوں نے اپنے درس و تدریس کے تجربات کے ساتھ ان ادبی سمیناروں، کانفرنسوں، اردو ریفریشر کورسوں، اورینٹیشن کورسوں، اردو ٹریننگ پروگراموں، ادبی تحریکات، اردو زبان کے تحفظ، ادبی شخصیات کی سالگرہ تقاریب، اکیسویں صدی میں ادب کو درپیش مسائل، علم عروض پر ہفت روزہ ورک شاپ، اردو کانفرنسیں، عہد حاضر میں اردو تحقیق و وسائل اور مسائل، جلسہ سیرت النبیؐ و نعتیہ مشاعرہ، امن کے لیے ایک قدم، سلور جبلی و گولڈن جبلی تقریبات کی روشنی میں ادب کا جائزہ رپورتاژ کی شکل میں جمع کیا ہے۔ کتاب کا پیش لفظ پروفیسر محمد انوارالدین سابق صدر شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی، نے تحریر کیا ہے اور مصنف اور کتاب کا تعارف کرایا ہے۔

کتاب کے مصنف ڈاکٹر محمد ناظم علی ادبی تقاریب پر حیدرآباد کے کئی روزناموں میں اپنی رپورٹیں اور تجزیے پیش کرتے رہے ہیں۔ ان اہم اخبارات میں روزنامہ منصف، روزنامہ سیاست، روزنامہ اعتماد، روزنامہ رہنمائے دکن، روزنامہ عوام قابل ذکر ہیں۔ ان اخبارات کی حیثیت ہندوستان کے صف اوّل کے اردو اخبارات کی ہے۔ ساتھ ہی ہفتہ وار نئی دنیا اور ادبی جریدہ سب رس میں بھی وہ ادبی معاملات پر بات کرتے رہے ہیں۔ جس کو انھوں نے اپنی اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ تقریباً دو دہائیوں پر مبنی دکن خصوصاً حیدرآباد کی تقریبات جس میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد یونیورسٹی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ادبی پروگراموں سمیت تربیتی پروگراموں اور ورک شاپ میں شرکت کرکے ان کی تفصیلات جمع کرنا بھی ایک دشوار ترین مرحلہ ہے، بہرحال انھوں نے ایسا کیا اور ادبی و تہذیبی رپورتاژ کی شکل میں جمع کر دیا۔

کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر انوارالدین صاحب نے رپورتاژ نگاری کے تعلق سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے، یہ صنف مغرب سے اردو ادب میں آئی اور ترقی پسند تحریک کے زمانے میں اس کو خوب ترقی حاصل ہوئی۔ پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ رپورتاژ صحافت اور ادب کے میل سے وجود میں آتی ہے۔ کسی بھی ادبی اجلاس کی روداد تحریر کرنے والا واقعات کو دلچسپ انداز میں اس طرح کرے کہ روداد کے ساتھ لکھنے والا اسلوب میں دلچسپی پیدا کردے اسے رپورتاژ کہتے ہیں۔ اچھا رپورتاژ لکھنے والا وہی سمجھا جاتا ہے جس کے یہاں روداد کے ساتھ افسانوی رنگ اور اسلوب کی چاشنی ہو۔ ڈاکٹر محمد کاظم صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ جس بھی سیمینار میں وہ شرکت کرتے ہیں، اس کی روداد کو پہلے محفوظ کر لیتے ہیں۔ پھر اس کو جذبات نگاری کے ساتھ پیش کرتے ہوئے اپنی تنقیدی رائے بھی دیتے ہیں۔ اس طرح مصنف کی اس کتاب کو پڑھنے سے ایسے بہت سے اردو پروگراموں، تربیتی پروگراموں، ادبی سمیناروں، کانفرنسوں، اردو ریفریشر کورسوں، اورینٹیشن کورسوں، اردو ٹریننگ پروگراموں، ادبی تحریکات، اردو زبان کے تحفظ، ادبی شخصیات کی سالگرہ تقاریب، اکیسویں صدی میں ادب کو درپیش مسائل، علم عروض پر ہفت روزہ ورک شاپ، جلسہ سیرت النبیؐ و نعتیہ مشاعرہ، امن کے لیے ایک قدم، سلور جبلی و گولڈن جبلی جیسی تقریبات کے تعلق سے آگاہی ہوتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس کتاب میں 24 پروگراموں کی روداد جمع کی ہے۔ حرف اوّل میں ناظم صاحب تحریر کرتے ہیں کہ زیر نظر کتاب ان کی دسویں تصنیف ہے، جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھیں درس و تدریس اور تحریر سے کس قدر شغف ہے اور وہ اپنی کتابوں کے ذریعے اپنی باتیں عوام الناس تک پہنچا رہے ہیں۔ اس کتاب میں فروغ اردو اور اردو زبان کی بقا اور تحفظ کے تعلق سے ایک سمینار کی روداد کو قلمبند کیا گیا ہے، جس میں اردو کے تحفظ کے تعلق سے سمینار میں تفصیلی بات کی گئی ہے جس میں مختلف ریاستوں میں اردو کے ختم ہونے، اردو کے گرتے معیار، اردو اخبارات، رسائل و جرائد کا کم ہوتا دائرہ، اردو کے تعلق سے لمبی لمبی باتیں تو بہت کی جاتی ہیں، طویل طویل مقالے لکھ کر ورق سیاہ کیے جاتے ہیں لیکن موثر عملی اقدامات کا فقدان رہتا ہے اور پھر زبان کی بربادی کا رونا رویا جاتا ہے۔ بہرحال ان کی دسویں تصنیف 'ادبی و تہذیبی رپورتاژ' میں دکن کے ادبی پروگراموں کو یکجا کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی اپنی اہمیت ہے۔ امید ہے ادبی حلقوں میں یہ پسند کی جائے گی۔

شہر نامہ

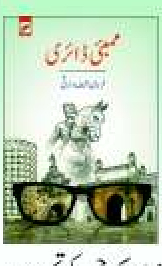

ممبئی ڈائری

مصنف: فرحان حنیف وارثی

صفحات: 192، قیمت: 125 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: سراج نقوی، A-101، ایسٹ ایونیو، اہنسا کھنڈ 2 اندراپورم، غازی آباد۔ 201014 (یوپی)

فرحان حنیف ان گنے چنے صحافیوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں کہ جن کی تحریروں

میں عروس البلاد ممبئی کی دھڑکنوں کو سنا جا سکتا ہے۔ ’ممبئی ڈائری‘ اس کا ثبوت ہے۔ صحافی معاشرے کا نباض ہوتا ہے، لیکن میٹرو شہروں کی نبض ٹٹولنا ہر ایک صحافی کے بس کا کام نہیں کہ ان شہروں کی تہذیبی وسعتوں میں اتنے رنگ اور اتنے پہلو ہوتے ہیں کہ جن پر گرفت کے لیے گہری قوت مشاہدہ اور صحافتی نگاہ درکار ہوتی ہے۔ فرحان حنیف کی صحافتی تحریریں ان دونوں خوبیوں سے مزین ہیں۔ ’ممبئی ڈائری‘ اس شہر کی روز مرّہ کی زندگی کا قلمی البم ہے۔ اس البم میں ایسی بہت سی تصویریں ہیں کہ جو ایک عام انسان کے لیے بے معنی اور ناقابل توجہ ہو سکتی ہیں، لیکن فرحان حنیف کے صحافتی شعور و دور رس نگاہ نے ان تصویروں میں اپنے قلم نما برش سے رنگ بھر کر انھیں قابل توجہ بنا دیا ہے۔ ان میں کچھ تصویریں جاذب نظر ہیں کئی زندگی کی ان تلخ اور کھردری سچائیوں کا آئینہ ہیں کہ جن سے ایک عام اور پست حوصلہ آدمی آنکھیں چرا کر آگے بڑھ جانا پسند کرتا ہے۔ فرحان حنیف کی کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے آخر الذکر طبقے کو بھی ان تحریروں کا قاری بنانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ’ممبئی نمبر 800004‘ کے عنوان سے تحریر کیے گئے کتاب کے پیش لفظ میں فرحان حنیف نے لکھا ہے کہ ”شہروں کی اس دلہن کو میں نے بھی ایک نئے انداز میں دیکھا ہے اور اس سے لطف اندوز بھی ہوا ہوں۔ ممکن ہے ممبئی کا یہ روپ آپ نے ابھی تک نہیں دیکھا ہو اور شاید جنھوں نے دیکھا بھی ہو تو بس سرسری طور پر، اور اسے کوئی اہمیت نہیں دی ہو۔ ممبئی ایسا شہر نہیں ہے کہ جسے آپ اچٹتی نظروں سے دیکھیں اور آگے بڑھ جائیں۔ میں نے اس شہر کو بچوں کی طرح ٹھہر کے kaleidoscope سے دیکھا ہے اور جو کچھ دیکھا ہے اسے اس کتاب میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔؟“

فرحان حنیف ایک صحافی بھی ہیں اور ادیب بھی، شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ ان کی قابل ذکر خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ادب اور شاعری میں بھی اپنی صحافتی فکر کے چراغ روشن کیے ہیں۔ فرحان نے اپنے قلم کو محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں بنایا۔ میٹرو شہروں کی زندگی کے کینواس پر بکھرے رنگوں کو انھوں نے پوری صحافتی دیانتداری اور قوت مشاہدہ کے ساتھ سمیٹ کر اپنے قاری کے سامنے ایسی قلمی تصویریں پیش کی ہیں جو ہمیں دعوت فکر دیتی ہیں، اور ان شہروں کی زندگی کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں ہماری مددگار ہوتی ہیں۔ ’ممبئی ڈائری‘ میں شامل مختصر مختصر تحریروں دراصل اس شہر کی تہذیبی، ثقافتی، ادبی، سماجی اور اقتصادی زندگی کی جھلکیاں ہیں۔ لیکن ان جھلکیوں کی سب سے بڑی اور نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کے پس پشت ایک ذمے دار اور حساس صحافی کا شہری مسائل کے تئیں دردمندانہ رویہ اور فکر بھی جھلکتی ہے۔ جو اپنے قاری کو بھی دعوت فکر دیتی ہے۔

’ممبئی ڈائری‘ میں تقریباً 581 تحریریں یا ممبئی کی روز مرّہ کی زندگی کی جھلکیاں ہیں۔ ان تحریروں میں ممبئی کی تاریخ اور ماضی کے قصے بھی ہیں اور تیزی سے اپنا روپ بدلتی ہوئی عروس البلاد کے حال کا نوحہ بھی اور قصیدہ بھی۔ ممبئی کے بدلتے ہوئے منفی روپ سے فرحان حنیف دکھی ہیں جس کا اظہار کتاب کے آغاز میں دی گئی اپنی نظم میں کیا ہے۔

’فٹ پاتھ پر پڑا ہوا ایک مجاہد آزادی، انجان کی موت سے میڈیا انجان، بھکاری مجرم اور بے روزگاری، ممبئی اور ایڈس، اندھیرے جیون میں اجالے کی کرن، بے بالا اور مہرو برڈی، اور اسپتال میں تنہا ہیں قمر جلال آبادی‘ کے عنوانات سے کتاب میں شامل تحریریں رونقوں کے شہر ممبئی کا وہ چہرہ پیش کرتی ہیں کہ جو مادی ترقی کے نتیجے میں زخمی ہو رہا ہے۔ بات صرف ممبئی کی ہی نہیں ہے بلکہ مادی ترقی کا یہ خمیازہ دنیا کے تمام بڑے شہروں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ جدید سہولتوں سے آراستہ اور مادی ترقی سے مالا مال ہوتے ہوئے شہروں کا سب سے بڑا المیہ ہی یہ ہے اس ظاہری امیری کی متوازی سطح پر ان میں جذباتی و اخلاقی قدروں سے محرومی بڑھ رہی ہے۔ انسانی دردمندی سماج سے رخصت ہو رہی ہے۔ ’یہاں کبھی گوالے نہایا کرتے تھے، دی پیلیس جناح ہال، پرانی کتابیں ملتی ہیں یہاں، سب سے پرانا پرنٹنگ پریس، اورنگ زیب کے دور اقتدار کا ناگ مندر، یہ ہے ردھم ہاؤس، ٹرینوں کے جب سینگ ہوتے تھے‘ اور ’سالویشن آرمی‘ عنوانات سے لکھی گئی تحریریں تاریخ کے کسی گمنام گوشے پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ’ماؤنٹ میری کا میلہ، پرتھوی تھیٹر اور مراٹھی ناٹک، فیشن اسٹریٹ، عورتوں کی لوکل ٹرین کا ایک اور فائدہ، چوپاٹی کے مالش والے، یہ ہے ممبئی میری جان، دھاراوی کا کمہار واڑہ، اور ’جوہو کے غبارہ ٹھگ‘ میں ممبئی کی ثقافتی اور روزمرہ کی زندگی کے مختلف عکس نظر آتے ہیں۔ ’وہ واپس نہیں آئے گی، چیکو کھاؤ جے سوریہ بنو، اپیل اچھی لگی تو آؤٹ دے دیا، زنڈو بام ریلوے اسٹیشن، صاحب ٹھیک ہی سوچیں گے، پیاز کا عطر، اور ’آنٹی کیا وڈا الہٰ‘ جیسی تحریریں طنز و مزاح کے رنگ سمیٹے ہوئے ہیں۔ ممبئی کے مختلف کرداروں کو فرحان حنیف نے اپنی صحافتی تحریروں میں جس صحافتی شعور کے ساتھ جگہ دی ہے وہ قابل داد ہے۔ ’ممبئی ڈائری‘ ماضی اور حال کی ممبئی کو سمجھنے میں دلچسپی رکھنے والوں اور اس شہر کی تہذیب و ثقافت کے تعلق سے تجسس رکھنے والوں کے لیے ایک اہم کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ آج کی بھاگتی دوڑتی اور تیزی سے تغیر پذیر ممبئی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں مددگار ہوگا۔

سائنس

سائنسی قوس قزح

مصنفین: سیدہ فاطمہ زہرہ و ڈاکٹر رفیع الدین ناصر

صفحات: 204 قیمت: -/130 روپے

ناشر: رومان پبلی کیشنز، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

مبصر: ڈاکٹر مرزا محمد خضر، ماڈل کالونی‘

مقابل حمایت باغ‘ اورنگ آباد (مہاراشٹر) 431001

سائنس کے موضوعات پر لکھنے والوں میں ڈاکٹر رفیع الدین ناصر اور دوسرے سیدہ فاطمہ زہرہ (موظف پرنسپل ’ڈاکٹر ذاکر حسین کالج‘ اورنگ آباد) کے نام بہت اہم ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کی 34 / کتابیں ’سیکڑوں مضامین‘ 25 / مقالات وغیرہ قومی و بین الاقوامی سطح پر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ سیدہ فاطمہ زہرہ بھی ملک کے نامی گرامی سائنسی رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ وہ سائنسی موضوعات جو طلباء اور عام قاری کے لیے مفید ہیں انھیں سلیقے سے موثر انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں جناب عبدالودود انصاری (کولکتہ) نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ”ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ بھائی (رفیع الدین ناصر) اور بہن (سیدہ فاطمہ زہرہ) کے مشترکہ سائنسی مضامین کا مجموعہ بنام ’سائنسی قوس قزح‘ منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوا ہے۔ میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک اس طرح کا مجموعہ شاید ہی شائع ہوا ہو“۔

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر اور محترمہ سیدہ فاطمہ زہرہ دونوں بھائی بہن کی مشترکہ تصنیف ’سائنسی قوس قزح‘ سائنس کے اہم موضوعات پر مشتمل ہے۔ قوس قزح تو سات رنگوں کو لیے افق سے کچھ اوپر چھائی رہتی ہے لیکن سائنسی قوس قزح 31 اہم سائنسی موضوعات کے مختلف رنگوں کو اپنے اندر سجائے ہوئے ہے۔

محترمہ سیدہ فاطمہ زہرہ کے پہلے پانچ ابواب جیسے جدید ٹیکنالوجی اور اردو زبان‘ جدید ٹیکنالوجی سے مربوط اردو کے مسائل‘ اردو داں طبقہ کے تعلق سے ان کے ذہنی کرب کی عکاسی کرتے ہیں۔ تیسرا باب اسلام اور جدید سائنس میں مسلمانانِ عالم کی بے حسی پر کہہ اٹھتی ہیں ”علمبردار علم و دانش نے ان سائنسی ایجادات کو اپنے نام کر لیا ہے اور ہم بے حسی و کاہلی کے کمبل میں لپٹے ان تجلیوں کو غیر کی ملکیت سمجھ کر ایک تماش بین کی طرح تالیاں بجا رہے ہیں۔“

”سائنسی ایجادات اور جدید انکشافات کا اصل ماخذ قرآن ہے اور یہ تمام

ایجادات اور ترقیات مظاہر قدرت ہیں جس کی تلاش وجستجو اور فکر وتدبر کی قرآن کریم نے جگہ جگہ دعوت دی ہے"۔

قرآن الفرقان میں 756 آیات مظاہر قدرت کے تعلق سے ہیں لیکن ہم نے کبھی ان پر تحقیقی کام نہیں کیا۔ جب سے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا، سائنس اس کی دامن گیر رہی۔ آگ اور پہیہ کی ایجاد سے لے کر انٹرنیٹ' جراحی کے آلات وغیرہ سب انسان کی کاوشوں کا ثمر ہے۔ لیکن ان ایجادات کی قطار میں ہم کہاں ہیں' ان مضامین میں ہمیں جگہ جگہ اس کی نشاندہی کی جاتی ہے کہ ہنوز اب تو کچھ پہل کریں۔ اسی کتاب کا چھٹا باب 'نومولود بچہ اور ماں کی ذمہ داری' خواتین کی رہنمائی کے لیے نہایت اہم ہے۔ ماں کی ممتا و پیار اپنے بچے کے تعلق سے کتنا زیادہ ہوتا ہے، اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن صحیح انداز میں بچے کی پرورش کیسے ہو جو اس کے مستقبل کے لیے کارآمد ہو' اس پر نہایت مشفقانہ انداز میں بتایا گیا ہے۔ اسی طرح دیگر ابواب بھی عام قاری کے لیے معلومات کے دریچے وا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کے پیش کردہ مضامین میں بالاوراثیات' جدید انقلابی سائنس (Epigenetics) جدید سائنسی تحقیقات اور انسانی زندگی' انسانی نفسیات پر نباتات کے اثرات' سائنسی اور تکنیکی تعلیم' نباتات سے پلاسٹک کی تیاری' بایوٹیک فصلیں۔ ایک نعمت اور ایبولا وائرس۔ اثرات وتحفظ اردو طبقہ کے لیے نئے ہیں اور اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کتاب کے دیگر مضامین بھی ضرورت وقت کے پیش نظر اہم ہیں۔

بالاوراثیات (Epigenetics) سائنس سے اور اس کے فوائد سے سائنس کے بھی اکثر طلبا واقف نہیں ہیں۔ دیگر شعبوں سے وابستہ لوگوں کا اس سے صحیح طرح واقف ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں اس کو پیش کیا ہے۔ پہلے انھوں نے زندگی کی بنیادی اکائی یعنی De oxy Ribose Nucleic Acid - DNA کو سمجھایا ہے جس سے اکثر لوگ واقف نہیں ہیں۔ گو کہ اکثر اخباروں اور رسالوں میں ڈی این اے پڑھتے رہتے ہیں لیکن اس سے واقفیت نہیں رکھتے۔

ڈاکٹر رفیع الدین نے اپنے دیگر مضامین جیسے صوفیانہ نظریات اور جدید سائنس میں اس بات کی وضاحت کی کہ اسلامی نظام حیات کو کس طرح آج کی سائنس قبول کر کے نئے انداز میں پیش کرتی ہے۔ انھوں نے سائنس اور تکنیکی تعلیم کی ضرورت پر بھی بہت موثر انداز میں خامہ فرسائی کی۔ چندریان۔ I مشن' اس طرح ماحولیات کے تحفظ میں ہماری ذمہ داریوں پر فاضل مصنف نے جنبش قلم کی ہے۔

بہرحال کتاب 'سائنسی قوس قزح' مکمل طور سے عام سائنسی معلومات کے وہ رنگ لیے ہوئے ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہر ایک عام اردو قاری کے گھر میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے کیونکہ اس کتاب کے تمام مضامین ہمیں تخیلاتی دنیا سے نکال کر عہد حاضر کی حقیقتوں سے روشناس کراتے ہیں۔

شاعری

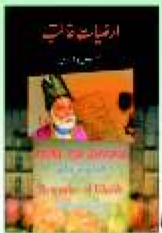

ارضیات غالب

تخلیق کار: سہیل کاکوروی

صفحات: 350، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: احساس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، بارودخانہ، گولاگنج لکھنؤ

مبصر: مصطفیٰ علی، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب مرزا غالب کی زمین میں کہی گئی سو غزلوں پر مشتمل سہیل کاکوروی کا شعری مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ سہ لسانی ہے۔ پہلے اردو میں شعر تحریر ہے پھر اس شعر کا ہندی لپیا نترن اور اس کے بعد اس کا انگریزی ترجمہ دیا ہوا ہے۔ ہر غزل کے آخر میں مشکل اردو الفاظ اور اس کے ہندی معانی ہندی زبان میں درج ہیں اور ہر غزل کے آغاز میں غالب کا مطلع مذکور ہے تاکہ مذکورہ غزل غالب کی کس زمین میں ہے اس کی شناخت ہو سکے۔ اس مجموعے کی تمام غزلوں کا پیٹرن یہی ہے، جس سے اس مجموعے کی افادیت اور ترسیلی دائرۂ وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں سے کسی بھی زبان کا جاننے والا اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس میدان میں سہیل کاکوروی نے ایسی مشق ومہارت بہم پہنچائی ہے کہ غالب کی سنگلاخ زمینوں کو بھی اپنے لیے ہموار کرلیا ہے۔ الفاظ کے دروبست اور اس کے برتنے کے سلیقے سے وہ بخوبی واقف نظر آتے ہیں۔ ان کی عروضی مہارت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ سہیل صاحب نے 'ارضیات غالب' میں جتائی کے لیے کہیں کہیں پر غالب کی نقل ضروری ہے لیکن بیج خالصتاً اپنا بویا ہے، اس لیے کھیتی بھی غالب سے جداگانہ نظر آتی ہے۔ اس کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

کانٹے کہاں سے کیسے چھپاتا ہے کیا کہیں
جس کو زمانہ کہتا ہے وہ گل فروش ہے

صد شکر دونوں پا گئے ہیں منزل مراد
مجھ کو نہ ہوش ہے نہ تو ساقی کو ہوش ہے

ایسا نہیں کہ سہیل صاحب نے غالب کی زمین میں غزل کہتے ہوئے انہی کے قوافی پر اکتفا کرلیا ہو بلکہ انھوں نے اپنے مضامین غزل کے مطابق الگ قوافی کا انتخاب روا رکھا ہے۔ ان کا انداز بیان بھی غالب سے جداگانہ ہے۔ ان کے اشعار میں شعریت، نغمگی اور روانی کی کوئی کمی نہیں دکھائی دیتی ہے اور مضمون بھی تازہ نظر آتا ہے مگر غالب کے اشعار پر استعاروں کا جو حجاب پڑا ہوا ہے اور وہ وقفہ جو اس کی شاعری کو ہزار معنوی جہتیں عطا کرتا ہے وہ سہیل صاحب کی شاعری میں مدھم دکھائی دیتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

بدلی ہوائے عشق سے رنگت بہار کی
چہرہ وہ سرخ ہو گیا جو پہلے زرد تھا

حاصل تھی مجھ کو دولت دیدار یار جب
جو سیم و زر تھا میری نگاہوں میں گرد تھا

غالب کی شاعرانہ حیثیت سے ہم سب تو واقف ہی ہیں۔ اس کی سی تعمیم، ہمہ گیری، تہہ داری، معنی آفرینی، بلندی پرواز، برجستہ تشبیہات واستعارات، شوخی وظرافت اور شگفتہ تراکیب کا پیدا کرنا ذرا مشکل کام ہے۔ دیوان غالب کے دیباچے میں علی سردار جعفری نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "غالب یا شیکسپیئر کا ایک مصرعہ ہزار نئے معنی پیدا کرسکتا ہے، اس کے دامن میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ وہ آنے والی زندگی کے ہنگاموں کو سمیٹ سکے۔" یوں تو اردو میں استاد شعرا کی خوبصورت زمینوں میں غزل کہنے کی ایک روایت رہی ہے، خود غالب نے ناسخ وغیرہ کی زمین میں غزلیں کہی ہیں لیکن دو، چار، دس بس، مگر سہیل نے پورا دیوان ہی زمین غالب میں تخلیق کرکے ایک نیا کام کیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ گلشن اردو ادب میں غالب کی زمین کی اپنی الگ شناخت ہے، اس لیے اس میں کسی اور مالی کا اپنے پھول کھلانے کا جذبہ ہی حوصلہ افزا اور قابل ستائش بجا ہے۔ اس پر بھی اپنی چمن زاری وآبیاری کا سچا ثبوت فراہم کردینا سہیل صاحب کو اردو ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ آپ غالب کی مشہور زمین میں سہیل صاحب کا یہ پھول ملاحظہ کیجیے

اپنا دل اپنے پاس ڈھونڈھ ذرا
میرے پہلو میں دیکھتا کیا ہے

سہیل صاحب نے غالب کا صرف مطالعہ نہیں کیا بلکہ اس کی شاعری کو اپنی رگ و پے میں اتار لیا اور پھر اپنے مخصوص مزاج میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ انھوں نے اس کی تقریباً تمام مشہور زمینوں کو اپنی غزل سرائی کے لیے برتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ غالب کی سی تشکیک اور ان کی طرح سوالات سہیل صاحب اپنے کلام میں پیدا نہیں کرتے لیکن کلام میں سکتے کا عمل وہ غالب کے جیسا ہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح دیگر خصوصیات کے علاوہ غالب کا ایک وصف خاص ان کی شوخی و ظرافت ، اسی طرح سہیل کا ایک وصف خاص ان کی معصومیت ۔ وہ بڑے ہی

معصومانہ انداز میں اپنی بات کہہ کر انسانی ذہن کو سوچتا ہوا چھوڑ کر پرے ہٹ جاتے ہیں۔

کتاب میں بعض جگہوں پر پروف اور ٹائپنگ کی غلطیاں در آئی ہیں، امید ہے کہ مصنف اس پر توجہ فرمائیں گے اور اگلے ایڈیشن میں اسے درست کرنے کی کوشش کریں گے۔

کتابت، طباعت، کاغذ اور جلد بندی عمدہ ہے۔ فکری وفنی بالیدگی، تازہ مضامین اور منفرد انداز بیان کے ساتھ استاذ شعراء کی زمین میں نئے مضامین کس طرح نکالے جاتے ہیں اس کے لیے ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس مجموعے کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

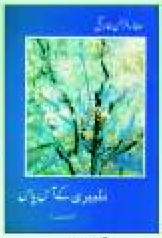

ملبیری کے آس پاس

شاعر: عطاء الرحمٰن طارق

صفحات: 128، قیمت: 150 روپے

ناشر: ایڈ شاٹ پبلی کیشنز، ممبئی

مبصر: سعید اختر اعظمی، نزد جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، یوپی

رنگ مہک، گیت سپن، رات ندی، چاند گگن، ہونٹ کنول، دیپ نین اور روپ دھنک کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ ان کی وابستگی ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہے۔ ان کا ملن خوشگوار اور جانفزا ہوتا ہے۔ الکھ نصاب میں عشق جناب و حسن مآب کی شمولیت پلک پلک مہتاب سجاتی ہے اور کافوری خواب عطا کرتی ہے۔ عطاء الرحمٰن طارق تشریح وفا کرتے ہوئے اسے پنکھڑی پنکھڑی رقص سے تعبیر دیتے ہیں۔ پگ پگ باندھے گئے پریم کے گھنگھرو، کچی گگری لے کر پنگھٹ کی جانب پیش قدمی اور کافوری شام میں یادوں کے چراغ جلانا اتنا سہل نہیں۔ یہ روشن آگ رومان کی حرارت کو زندہ رکھتی ہے اور وجود کو سرشار کیے رہتی ہے۔

دھانی دھانی، ہرے ہرے، دھم دھم اور بوندا باندی کے بعد عطاء الرحمٰن طارق کا پانچواں سخن زاویہ قارئین کے روبرو ہے۔ ان میں مجموعہ ثانی، ثالث ورابع ادب اطفال کا نمائندہ تھا، اس لحاظ سے بالغ نظر قاری کی عدالت میں یہ دوسرا مجموعہ ہے۔ ان مجموعوں کا خالق تنوع پسند ہے اور روایتی ڈگر پر چلنا پسند نہیں کرتا۔ وہ جدید تلازمات، تشبیہات واستعارات اور تراکیب میں سرگرداں رہتا ہے۔ اپنی بات میں جدت لانے اور انفرادیت عطا کرنے کے لیے وہ ہندی الفاظ وتراکیب کا سہارا لینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ کمال فن یہ ہے کہ اس سے کہیں بھی شعریت مجروح نہیں ہوتی اور نہ ہی قرات سخن کی روانی میں فرق پڑتا ہے۔ صوفیانہ کلام ہو یا مدحت نبوی، موضوعاتی قطعات اور دوہے ہوں یا گیت نما نظمیں یا پھر دو لفظی غزلیں، تجربات کا ہر رنگ جاندار اور ہر آہنگ شاندار ہے۔ بطور نمونہ یہ رنگ وآہنگ۔

سکھی سیج ان کی سجائی ہے میں نے   بڑی آس ان سے لگائی ہے میں نے
مگر دیپ اب تک جلایا نہیں ہے   ابھی میں نے ساجن کو پایا نہیں ہے

دھان کے کھیت میں اس نے دیکھا مجھے   کچی کچی منڈیروں سے آتے ہوئے
اور کانوں میں اترا کے جھٹ پہن لیں   دھان کی بالیاں مسکراتے ہوئے

من میں یادیں اس طرح کرتی ہیں آواس   جیسے ریلوے لائن پر اگ آتی ہے گھاس

غزلوں میں الگ راہ بنانے کی سعی خوب سے خوب تر ہے اور کہیں بھی نامانوس محسوس نہیں ہوتی۔

چیونٹیوں کے پر ہوتے ہیں   تنکوں سے گھر ہوتے ہیں

میں وہ خودسر کہ بات خود اپنی   کبھی مانی، کبھی نہ مانی بھی

چاٹ جائیں گی خواہشیں مجھ کو   ایک دیمک زدہ مکان ہوں میں

غار میں قہقہوں کی گردش تھی   رقص میں خوف کے اشارے تھے

شہر کی دیکھا دیکھی جنگل   کم پوشاک ہوا جاتا ہے

جانے کیوں انھوں نے احمد علوی اور ندا فاضلی کے شعور سے عاری کرداروں کو اپنی شاعری میں جگہ دے کر جدیدیت کے معماروں میں اپنا نام شامل کر لیا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے۔

چوہا بولا باغ میں بیٹھیں   تتلی بولی، یس سر، یس سر
بحریں فیڈ کرا دی جائیں   شعر کہے گا اب کمپیوٹر

اگر ایسا ہوا تو اشعار کا فطری پن رخصت ہو جائے گا اور 'ملبیری کے آس پاس' ایسے اشعار کی موجودگی عنقا ہو جائے گی۔

مجھ پہ عائد لوگوں نے الزام کیے   میں نے اپنے گیت تمہارے نام کیے
یوں لگتا ہے جیسے صدیاں بیت گئیں   ندی کنارے ساتھ تمہارے شام کیے

خوشبو کے حوالے سے

شاعر و ناشر: بدر محمدی

صفحات: 160، قیمت: 251

مبصر: علیم صبا نویدی 266، ٹرپلی کین، ہائی روڈ فلیٹ نمبر 16 دوسری منزل، رائس منڈی، اسٹریٹ، چنئی 600005 (تمل ناڈو)

ڈاکٹر بدر محمدی کا شمار دور جدید کے معتبر ومستند شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی سخن شناسی، خوش گفتاری، خوش ادائی اور وضع داری نے انھیں شہرت سے بے نیازی کے باوجود سنجیدہ حلقوں میں ایک منفرد مقام عطا کیا ہے۔ اپنی شاعری میں موصوف نے جابہ جا خندہ لبی اور سادہ دلی کو بجا طور پر اپنا وصف بنایا ہے۔ انھوں نے قاری کے لیے ایک نئی سوچ، نئی فکر کی راہ ہموار کی ہے اور اپنے زمانے کے خوب وخراب، غم دوراں وغم ہجراں کی وادیوں کی سیر کرادی ہے۔ شاعر دنیا کی چکاچوندھ میں اپنے لیے سایۂ اماں کی تلاش میں کبھی خارزاروں سے گزرتا ہے تو کبھی چلاتی ہواؤں اور بے نوا اندھیروں میں بھٹکتا ہے۔ بدر محمدی کی شاعری تپتے ہوئے صحرا میں ایک فرحت بخش اور روح افزا صبح کے جھونکے کی طرح شام جاں کو معطر کرتی ہے۔ نمونتاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہاں سے دور کہیں وہ نکل گئی ہوگی   ہوا تو رہتی ہے آوارگی کی دنیا میں
خشک ہو جاتا ہے دریا بھی اثر سے اس کے   تم نے دیکھا ہی نہیں دیدۂ تر کا جادو
ڈھوتے ڈھوتے تجھ کو ہم بھی خود پہ بھاری ہو گئے   بوجھ تیرا اے لباس زندگی ہلکا نہ تھا

سماجی ناہمواری، مفاد پرستی اور معاشی الجھنیں غرض کہ زندگی کے ہر مرحلے ہر موضوع پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے، بقائے امن پر پرمغز اشعار کہے ہیں۔ انسانوں کے غم ورنج کی تصویریں ان کے اشعار میں ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں کہیں حسن وعشق کے پاکیزہ جلوے نظر آتے ہیں، تو کہیں آرائش لب ورخسار کے تذکرے ملتے ہیں۔

مجھ کو کیا اسیر تری زلف نے مگر   بیگانے کیوں ترے لب ورخسار ہو گئے
دوسرا کوئی کہاں ہے ہو بہو اس کی طرح   ہو، بہو اس کی طرح ہاں خوبرو اس کی طرح
چلی نہ جائے یہ جاں تن کے دائرے سے الگ   مجھے نہ کیجیے یوں اپنے آسرے سے الگ

موصوف کی ایسی ہی تغزل آمیز شاعری ہے جن میں سوز دل کی کیفیتیں دیکھی

جاتی ہیں۔ ان کی شاعری کو پڑھ کر ڈاکٹر مظفر حنفی نے یوں کہا:

''جناب بدر محمدی کی غزلیں اپنی تازگی، ندرت، طرز ادا، طرفگی خیال اور علوئے فکر کے اعتبار سے کسی بھی اہل زبان غزل گو کی تخلیقات کے مقابل رکھی جاسکتی ہے۔''

اردو زبان میں اتنی کوئی بھی صنف مقبول نہیں ہوئی جتنی کہ غزل۔ غزل کا ایک اچھا شعر آنکھ سے ٹپکے آنسو کے قطرے کی طرح ہوتا ہے جس میں ساری کائنات سما جاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

بدر آساں نہیں شاعر کا غزل خواں ہونا　　　یہ نہیں جادو مگر جادو بیانی مانگے
اے بدر تیرے شعر کا لہجہ ہے دلنشیں　　　ہر بات میرے دل میں کہیں بیٹھنے لگی

جب ہم بدر کو پڑھتے ہیں تو پڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ان کے کلام سے کبھی بھی جی اکتاتا نہیں۔ ان کا شعری ڈکشن بڑا ہی پرکشش اور منفرد ہے اور ان کا روایتی انداز قطعی مختلف ہوتا ہے جو اپنی اثر آفرینی اور حسن آرائی کی وجہ سے دلوں کو چھو لیتا ہے۔ دیکھیے ان کے اشعار میں صداقت اور پاکیزگی کس قدر جھلکتی ہی۔

جناب بدر شاعری کے رموز وقواعد پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان ے اشعار میں زبان کی شائستگی اور بیان کی پختگی نظر آتی ہے۔ کلام کی نفاست و لطافت کی بنا پر انھیں لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ جناب بدر کا شائستہ اسلوب تہذیبی روایات کی پاسداری کی علامت ہے۔ موصوف نے ہمیشہ غزل اور متعلقاتِ غزل کو ہی اپنا وسلۂ اظہار بنایا ہے اور جس محفل میں بھی انھوں نے اپنی شاعری سنائی، لوگوں کو متاثر کیا۔ انھوں نے زبان وفن کی قدروں کو بحال رکھتے ہوئے شاعری کی ہے۔ سماج کی ناہمواریوں اور رشتوں کی ناپائیداری پر بھی بدر نے اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ اس شعری تصنیف کے صفحات پر ایسے بے شمار اشعار بکھرے پڑے ہیں جو اپنے سبک لہجے اور زبان کی تر وتازگی کی بنا پر پسند کیے جائیں گے۔ ان کے شعروں میں شاعری کی بے ساختگی اور زبان کی جو صفائی ہے وہ اردو شاعری کا معیار پیش کرتی ہے۔

عام فہم زبان میں اظہار کی خوش سلیقگی کوئی موصوف سے سیکھے۔ اس کے علاوہ خیال کی تازگی، تجربے کی ندرت اور جذبے کی شدت سے بھی ان کی شاعری مالا مال ہے۔

ہماری دعا ہے کہ جناب بدر آسمان ادب پر بدر منیر کی طرح جگمگاتے رہیں۔

شاعری تک آگئے

مصنف: ناظم اشرف

صفحات: 202، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: ماسٹر نثار احمد

413 مین روڈ، نئی کردم پوری، شاہدرہ، دہلی 94

نوجوان شاعر حافظ وقاری ناظم اشرف بجنوری، شاعری کے افق پر جس آب وتاب کے ساتھ ابھرتے ہوئے نظر آرہے ہیں، مستقبل میں ان سے بہت توقعات وابستہ ہیں کیونکہ ان کی شاعری کے اندر جو لطافت وندرت، رکھ رکھاؤ اور ٹھہراؤ وفنی پختگی ہے اس عمر کے شاعروں میں کم دیکھنے کو ملتی ہے عمر کے ساتھ ساتھ تجربات بھی جوان ہوتے ہیں جو اپنے اردگرد کے حالات اور مشاہدات کائنات کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ فن تجربات کی بھٹی میں تپ کر اپنے جوہر اصلی پر آجاتا ہے۔ ایسے قلم کار پہلی صفوں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

ناظم اشرف اول تو جس سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں وہ ادب کا گہوارہ رہی ہے ادبی دنیا میں اس سرزمین نے بہت سے فنکاروں کو جنم دیا ہے، وہاں شاعری کے اعلیٰ نمونے پہلے ہی سے موجود تھے۔ دوسرے دارالعلوم دیوبند جیسے عالمی شہرت یافتہ مرکز اسلامی کی علمی آب وہوا نے ان کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع دیا جو نواز دیوبندی جیسے معتبر عالمی شہرت یافتہ شاعر کی زیر نگرانی میں پروان چڑھتا گیا۔

اچھوتے مفاہیم اور تخیلات کو جس سلیقے سے شعری جامہ پہنا کر ناظم اشرف نے محفوظ کیا ہے وہ اپنا اثر چھوڑنے میں کامیاب ہے۔

دیگ کے ایک چاول کے مانند اندر اثاثۂ شاعری کے معتبر ہونے کا پتہ دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بڑے بڑے معتبر شعراء کرام کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہے۔ شہپر رسول، ابرار کرتپوری، طالب رامپوری، نواز دیوبندی، منظور عثمانی، ڈاکٹر طارق قمر، مہندر اشک، معین شاداب، فاخر ادیب، شاکر کرتپوری، تناور کرتپوری، اور بھی دیگر شعراء کرام کا ان کی شاعری کے حوالے سے نام آتا ہے اور اساتذہ کا دعاؤں سے نوازنا میری رائے کے معتبر ہونے کی دلیل ہے۔

پورا مجموعہ دیکھ لیجیے جہاں بھی آپ دیکھیں گے منھ بولتے ہوئے اشعار نظر آئیں گے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں یہ پرمغز تخیل پرواز۔ بے ساختہ دل سے داد نکلتی ہے اور دعا بھی۔ دیکھیے کتنی اصلاحی اور علمی بات کو اپنی شاعری کا حصہ بنا کر اپنے حصہ میں اہل فن کی دعائیں اور سعادتیں محفوظ کرلی ہیں۔

ہونٹ میں نے سی لیے تھے اپنی ماں کے سامنے　　　میں زمیں تھا بولتا کیا آسماں کے سامنے
مشورہ بھی نہ کروں اپنے بزرگوں سے میاں　　　خود کو اتنا بھی سمجھ دار نہیں مانتا میں

شاعری کا یہی کمال ہے کہ وہ جو بات کہہ رہا ہے اس میں سچائی نظر آئے۔ یہ بات نہ ہو تو اشعار کا برجستہ زبان زد ہونے کا کوئی مطلب نہیں۔ لایعنی اور فضول وغلط بات کوئی اپنی یادداشت کا حصہ نہیں بنانا چاہتا۔ سیدھی سیدھی سامنے کی بات کو بیان کرنا آسان ہے مگر منفی پہلو پر مثبت کی چادر ڈال کر لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کرنا کہ بات صحیح اور درست معلوم ہو فن کاری سے عبارت ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ لوگ اس کو باوجود اس کی بنیاد منفی ہونے کے اس کو یاد رکھنا اور گنگنانا پسند کرتے ہیں اور بات چونکہ نئے انداز میں پیش کی گئی ہوتی ہے اس لیے زیادہ توجہ کا سبب بنتی ہے۔

صحن میں دیوار اٹھانے کو عام طور پر معیوب سمجھا جاتا ہے اسی حوالے سے اکثر شعرا اشعار تخلیق کرتے ہیں اور یہ کہ ایک مثبت پہلو ہے جبکہ دوسرا پہلو جو منفی ہے وہ صحن میں دیوار اٹھانا ہے مگر ناظم اشرف نے منفی پہلو کو اس خوب صورت انداز میں پیش کیا کہ صحیح اور درست معلوم ہو رہا ہے۔

گھر میں ہر روز کے جھگڑے سے یہی بہتر ہے　　　صحن کے بیچ میں دیوار کیے لیتے ہیں

آپ پورے مجموعہ پر نظر ڈال لیجیے آپ کو شائستگی، خوش سلیقگی، سنجیدگی اور سہل ممتنع کا مشاہدہ جگہ جگہ ہوگا۔

سوز وگداز اور زلف ورخسار کی شاعری تو آج جس دور سے گزر رہی ہے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ انسان کی زندگی آج جن گوناگوں مسائل سے دوچار ہے وہ تمام مسائل ذہن ودل پر اپنے سوار رہتے ہیں کہ وہ سوز وگداز اور زلف ورخسار کے بارے میں سوچنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ ایسے میں اگر کوئی اپنے تجربات ومشاہدات کو سلیقے سے شعری جامہ پہنا دیتا ہے تو یہ بڑی بات ہے او پھر ویسے بھی شاعری اشارہ وکنایہ کی زبان ہوتی ہے۔ نہ زلف ورخسار صرف زلف ورخسار تک محدود ہیں نہ کعبہ وبکسر اور بت وصنم سے اس کے اصلی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ بس یہ تو سامع اور قاری کی فہم وادراک پر منحصر ہے کہ وہ اس میں کیا دیکھتا ہے، شاعری کے اندر کبھی تو لفظی معنی مراد لیے جاتے ہیں اور کبھی یہ استعارہ اور کنایہ کی زبان ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے۔

کوئی اسباب تلک کوئی رساں تک پہنچے　　　جس کا ادراک یہاں تک ہے وہاں تک پہنچے

اردو ادب کو ایک بہتر شعری مجموعہ دینے کے لیے ناظم اشرف کو بہت بہت مبارکباد!

شفیق الحسن کے اعزاز میں دبئی میں شاندار تقریب

دبئی: صحافت کی دنیا میں منفرد کام انجام دینے والے

شفیق الحسن ان دنوں دبئی کے دورے پر ہیں۔ انجمن ادب دبئی کے زیر اہتمام یہاں ان کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ نظام حیدرآباد ریستوران، دبئی میں منعقد اس تقریب میں دبئی میں مقیم مختلف شعبہائے زندگی سے وابستہ افراد نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس موقعے پر شفیق الحسن کو ایک مومنٹو پیش کیا گیا اور شال پہنا کر ان کا استقبال کیا گیا۔ اس موقعے پر ان کی اہلیہ حنا شفیق اور ان کے دونوں بچے بھی موجود تھے۔ اعزازی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے سب سے پہلے شفیق الحسن نے اپنے دوست خلیق الرحمٰن، منتظمین اور خاص طور پر البہار ریئل اسٹیٹ کے محمد منیر اور نظام حیدرآباد کے محمد قادری کی نظامت کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر شفیق حسن نے بتایا کہ اخبارات سے وابستگی، کچھ نہ کچھ لکھتے رہنے کا شوق اور ملک وقوم کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ ہمیشہ سے رہا۔ فیس بک اور ٹوئیٹر پر کبھی کبھی کچھ اخباروں کے تراشے شیئر کرتا رہتا تھا لیکن یہ چند لوگوں تک محدود تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اس میں اہم موڑ اس وقت آیا جب 24 جون 2017 کو دہلی کے نزدیک ٹرین میں جنید کی لنچنگ کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے ساتھ ہی سوشل میڈیا پر افواہوں اور فیک نیوز کا سلسلہ بھی دراز ہوتا جارہا تھا۔ ایسے میں مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ جہاں تک ممکن ہو سکے لوگوں کو سچی اور مستند خبروں سے روشناس کرایا جائے۔ دو سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی آج تک یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 اکتوبر 2019

شارجہ لائبریری میں بزم اردو کے فن اسٹوڈیو کا انعقاد

دبئی: شارجہ لائبریری میں بزم اردو کے فن اسٹوڈیو کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس تقریب کو عملی جامہ پہنانے میں محکمۂ شارجہ لائبریری نے بزم اردو کا بھرپور تعاون کیا۔ فن اسٹوڈیو بزم اردو کا ایک مستقل پروگرام ہے جس کے تحت کسی معروف شاعر کی شاعری اور اس کے حالات زندگی پر بات کی جاتی ہے۔ اس کی شاعری موسیقی کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ فن اسٹوڈیو کے اس جلسے میں نئی نسل کے معروف شاعر عاطف توقیر کے فن اور شخصیت پر بات کی گئی۔ فن اسٹوڈیو کا یہ اجلاس اس معاملہ میں منفرد رہا کہ اس میں عاطف توقیر خود موجود تھے۔ بزم اردو کی رکن ترنم احمد نے ان سے ان کی زندگی اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر دلچسپ بات چیت کی۔ عاطف توقیر جرمنی سے بالخصوص اس تقریب کے لیے تشریف لائے تھے۔ ان کے کلام کو دہلی سے تشریف لائے ہوئے گلوکار سید مہران شاہ نے موسیقی میں ڈھال کر پیش کیا جسے حاضرین نے بے انتہا پسند کیا۔ سدھی، سراج اور سمیر نے سازوں پر سید مہران شاہ کا بھرپور ساتھ دیا۔ تقریب کے دوسرے حصہ میں سید مہران شاہ نے اپنی گائیکی کے ذریعے معروف گلوکار مہندی حسن کو خراج تحسین پیش کیا اور حاضرین کا دل لوٹ لیا۔ تقریب کے آغاز میں شارجہ لائبریری کی ڈائرکٹر ایمان بوشلیبی نے حاضرین کا استقبال کیا اور اس تقریب کے منعقد ہونے پر خوشی کا اظہار کیا۔ آخر میں بزم اردو کے بانی اور جنرل سکریٹری ریحان خان نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اکتوبر 2019

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

قومی یومِ تعلیم

نئی دھلی: مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار دنیا کی ان منتخب ہستیوں میں ہوتا ہے جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان جیسے جہاں دیدہ ہمہ گیر اور ہمہ جہت رہنما بہت کم

پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد بے پناہ خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست علمبردار تھے اور متحدہ ہندوستان ان کا خواب تھا۔ انھوں نے پورے ملک میں رواداری اور بھائی چارہ کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے تعلیمی سطح پر بہت سے انقلابی اقدامات کیے اور ملک کے تعلیمی نظام کو استحکام بخشا۔ اسی لیے حکومت ہند نے 11 رنومبر کو ان کی یوم پیدائش کے موقع پر ملک بھر میں یوم تعلیم منانے کی ہدایت دی۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ یوم تعلیم کے موقع پر کہیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد نے ہندوستان کو جس طرح متحد کرنے کی کوشش کی موجودہ وقت میں اس اتحاد کی بے حد ضرورت ہے۔

اس موقعے پر کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے مولانا آزاد کی پیدائش سے لے کر موت تک تمام باتوں کو مربوط اور مبسوط رتیقے سے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی پوری سیاسی زندگی متحدہ قومیت، رواداری کے لیے وقف تھی۔ ملک کی آزادی میں مولانا کی صحافتی کوششوں سے انکار ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے انگریزوں کے ظلم وتشدد کے خلاف پوری قوم کو بیدار کرنے کے لیے 'الہلال' نامی رسالہ جاری کیا۔ اس پر پابندی لگنے کے بعد 'البلاغ' نامی رسالہ نکال کر مجاہدین آزادی کے اندر جذبہ تحرک کو بیدار کیا۔ مولانا آزاد کو اس ملک سے بے پناہ محبت تھی۔ تقسیم ہند کے وقت مسلمان اپنے آبا واجداد کی سرزمین چھوڑ کر پاکستان کوچ کر رہے تھے اس وقت مولانا آزاد نے جامع مسجد کی سیڑھیوں سے جذباتی تقریر کی جسے سننے کے بعد پاکستان جانے کا ارادہ مسلمانوں نے ترک کر دیا۔ انھوں نے اس موقع پر کہا کہ مولانا آزاد کی ذاتی لائبریری میں لگ بھگ آٹھ ہزار کتابیں تھیں جسے انھوں نے ICCR کے حوالے کر دیا۔ ان کتابوں میں کچھ ایسی کتابیں تھیں جس پر مولانا آزاد نے پنسل سے حواشی لکھے تھے اس کے علاوہ ترجمان القرآن کے قلمی نسخے کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ اس پر مزید کام کی ضرورت ہے۔

اس موقعے پر پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ماضی پرستی گرچہ بہت بڑا گناہ ہے لیکن ماضی کے ان حصوں کو تراش خراش کرنا چاہیے جو سڑ گل گیا ہے اور جو چیزیں اچھی ہیں ہمیں ان کو قبول کرنا چاہیے۔ آج مولانا آزاد کی باتوں کی بازیافت ضروری ہے اور یہ موجودہ وقت کا تقاضا بھی ہے۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ مولانا آزاد کی بہت مخالفت ہوئی تھی مگر اب مولانا آزاد کے نظریات کی بازگشت صاف سنائی دے رہی ہے۔ ایک طرح سے مولانا آزاد کے نظریات کی پھر سے تجدید ہو رہی ہے۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا۔

اس پروگرام میں دہلی کے مشہور شاعر جناب شاداب الفت اور بریلی سے جناب شارق کیفی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر توقیر عالم خان، پروفیسر دیوان حنان خان، ڈاکٹر ریاض احمد، ڈاکٹر ابوبکر عباد، جناب عبدالسلام (یو این آئی)، جناب معصوم مرادآبادی، جناب عقیل احمد (سکریٹری غالب اکیڈمی) کے ساتھ کونسل کا عملہ بھی موجود تھا۔ پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 11 نومبر 2019

اردو املا کے حوالے سے میٹنگ

نئی دھلی: اردو میں املا کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ درست املا تحریری تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے اور غلط املا سے لفظ کے معنی اور حسن میں تبدیلی کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں مگر المیہ یہ ہے کہ اس تعلق سے بڑے پیمانے پر لاپرواہی برتی جا رہی

ہے اور املے کی سطح پر بہت سے الفاظ کو الگ الگ انداز میں لکھا جا رہا ہے، جس کے سبب قارئین اور اردو کے عام طلبا کے لیے مشکلات پیدا ہو رہی ہیں، اس لیے قومی کونسل اردو املا کے حوالے سے باضابطہ ایک گائیڈ لائن بنانے پر کام کر رہی ہے تاکہ مسائل کو حل کیا جا سکے۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے قومی کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ املا کے تعلق سے اعتدال کی راہ اختیار کی جانی چاہیے۔ اگر قدیم املا میں وقت کے تقاضے اور سہولیات کے تحت تبدیلی کی گنجائش ہو تو اس بارے میں غور کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ نئی نسلوں کے لیے اردو پڑھنا، لکھنا اور بولنا آسان ہو۔ ماہرین کی مدد سے کونسل یہ کام کر رہی ہے۔ داستانوں کی قرأت کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ داستانوں کے بہت سے الفاظ کو آج ٹھیک طور پر پڑھنا دشوار ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں موجودہ نسلوں کے لیے ان سے استفادہ مشکل ہے۔ اس لیے اس سمت میں بھی پیش رفت کی ضرورت ہے۔

میٹنگ کی صدارت کر رہے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے املا کے مسائل پر تحقیقی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو صرف بولی نہیں بلکہ زبان ہے جو لکھی بھی جاتی ہے۔ ایسے میں رسم الخط اور املا کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہمزۂ کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ جہاں ہمزہ ناگزیر ہو، وہاں اس کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ زبان کو منطقی نہیں بنایا جاسکتا۔ عربی الفاظ کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ جہاں عربی کی ترکیب ہے وہاں ان کے املا کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ پروفیسر نصیر احمد خاں نے کہا کہ جب بھی اردو املا کی بات کریں، تو اردو کے صوتی مزاج کو سامنے رکھیں۔ انھوں نے کہا کہ الفاظ کے اسٹرکچر ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہوتے ہیں، اس لیے املا کی سطح پر اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ قومی کونسل اردو کا ایک ایسا ادارہ ہے جس کی طرف اردو والوں کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ یہاں سے شائع ہونے والی چیزوں کو معیاری خیال کیا جاتا ہے۔ املا کے حوالے سے قومی کونسل کی کوششیں لائق تحسین ہیں اور یہ امید کی جاسکتی ہے کہ کونسل کے ذریعے تیار کیے ہوئے املا نامہ کو ہر جگہ قبول کیا جائے گا۔

میٹنگ میں جن حضرات نے شرکت کی، ان میں ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، ڈاکٹر فیروز عالم، ڈاکٹر عبدالحی، جناب اجمل سعید، محترمہ آبگینہ، شہاب الدین، ڈاکٹر بہلول، ڈاکٹر شاہد اختر انصاری، ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی، جناب مشہود احمد، جناب محمد اکرام اور جناب امین اللہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 اکتوبر 2019

فاصلاتی تعلیم کے حوالے سے میٹنگ

نئی دھلی: قومی اردو کونسل کے فاصلاتی تعلیم کورس کا مقصد یہ تھا کہ غیر اردو داں طبقہ کو اردو سے قریب کیا جائے۔ اس کورس سے نہ صرف آئی ایس اور آئی پی ایس افسران بلکہ ملک کی دوسری اعلیٰ جیسی ایجنسیوں اور عدالتوں سے جڑے ہوئے افراد کے لیے قومی اردو کونسل نے ابتدائی اردو سکھانے اور پڑھنے کا اہتمام کیا۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل

کے صدر دفتر میں منعقدہ فاصلاتی تعلیم پینل کی میٹنگ میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ ملک کے ایسے آدی واسی علاقے جہاں سے درخواستیں موصول نہیں ہوتیں ان علاقوں میں بھی اردو کے فروغ کے لیے قومی اردو کونسل پہل کرے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ فاصلاتی تعلیم کے ضابطے کے مطابق اساتذہ کی صلاحیت گریجویشن رکھی گئی ہے لیکن ملک کے کچھ ایسے علاقے ہیں جہاں کرائٹیریا (Criteria) کی بنیاد پر اساتذہ کا انتخاب دشوار کن ہے۔ وہاں کے لوگوں کی درخواست پر قومی اردو کونسل غور وخوض کرکے ترمیم کرسکتی ہے۔ میٹنگ کی صدارت روپ کرشن بھٹ نے کی۔ انھوں نے فاصلاتی تعلیم میں طلبا کی تعداد میں لگاتار اضافہ کو خوش آئند قرار دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ نئے سینٹر کھولنے کے لیے قومی اردو کونسل کے ضابطے کے ساتھ ساتھ پوری شفافیت برتی گئی ہے۔ میٹنگ میں پروفیسر محی الدین سنگھی، پروفیسر سید عمادالدین، ڈاکٹر شبیر حسین، محترمہ افشاں رحمان، جناب صلاح الدین سیفی کے علاوہ قومی اردو کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)، ڈاکٹر جاوید اقبال (ٹیکنیکل اسسٹنٹ)، ڈاکٹر انوارالحق، مسرور سعید، ڈاکٹر فیاض عالم، محترمہ نیلم نیگی، مبشرہ خلیل اور ڈاکٹر شاہد اختر نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 نومبر 2019

شیلانگ کے اوم شرپی کالج میں محفل قوالی

شیلانگ: مشاعرے، قوالی، غزل کی محفلیں سجانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اردو زبان کی شیرینی سبھی کے کانوں میں رس گھول دے۔ خاص طور پر قوالی میں ایسا جادو ہوتا ہے جو

دلوں کی دنیا بدل دیتا ہے۔ تصوف سے قوالی کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سبھی مذاہب کو ایک دوسرے سے جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ قوالی نے اردو زبان کے فروغ خصوصاً اردو غزل کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ قوالی کی وجہ سے ہی امیر خسرو، بلھے شاہ، بابا فرید گنج شکر اور دیگر معتبر اور مستند شعرا وصوفیا کرام کا کلام عام لوگوں تک پہنچا اور غیر اردو داں حلقہ بھی اردو زبان وادب کی جانب متوجہ ہوا۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے شیلانگ کے اوم شرپی کالج کے آڈیٹوریم میں قومی اردو کونسل کے ذریعے منعقدہ محفل قوالی کے آغاز سے قبل کہیں۔ انھوں نے پروگرام کی غرض وغایت بھی بیان کی اور ملک کے مشہور قوال نظامی برادران کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے مزید کہا کہ ہمارے عزت مآب وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ڈاکٹر رمیش پوکھریال نشنک بھی اردو کے دلدادہ ہیں اور اردو کو ساری دنیا میں پھولتا اور پھیلتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اردو زبان ملک کے دور دراز علاقوں تک پہنچے۔ ہم نے اس سے قبل بھی یہاں اردو زبان کے فروغ کے لیے ایک انٹریکٹیو پروگرام کا انعقاد کیا تھا، جس کی یہاں بے حد پذیرائی کی گئی۔ ہم شیلانگ کے محبان اردو کو یہ بتانا چاہیں گے کہ قومی اردو کونسل دہلی میں ہو کر بھی آپ سے بے حد قریب ہے اور ایک ماہ کے قلیل عرصے میں ہم یہاں دوسرا پروگرام کر رہے ہیں۔ ہمارا مقصد بس اتنا ہے کہ آپ سب اردو کے قریب آئیں۔ پھر دیکھیں اردو آپ کو کتنا مالا مال کرتی ہے۔ قوالی کا پروگرام شام 4 بجے شروع ہوا جس میں شیلانگ کی مقتدر شخصیات نے شرکت کی۔ پروگرام کے انعقاد میں جناب سیداللہ اور ان کی ٹیم کا بھرپور تعاون شامل رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 25 اکتوبر 2019

معروف شاعر حیدر امان حیدر کو استقبالیہ

نئی دھلی: مشاعرہ قومی ثقافت کا ایک اہم جزو ہے۔ ایک شاعر اپنی تخلیقات میں وہی باتیں، وہی تجربات پیش کرتا ہے جو سماج میں وقوع پذیر ہوتی ہیں، گویا اشعار کے پیکر میں معاشرے کی تاریخ ہوتی ہے۔ شاعر اپنے گرد وپیش سے حد درجہ متاثر ہوتا ہے تب ایک شعر کی تخلیق ہوتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں دبئی سے تشریف لائے جناب حیدر امان حیدر

کے اعزاز میں منعقدہ تقریب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ ہماری اردو کونسل، قومی سطح کا ادارہ ہے لیکن فروغ اردو کے لیے ہماری سوچ عالمی سطح کی ہے۔ ہم دنیا کے ہر کونے میں ایک ہندوستان دیکھنا چاہتے ہیں جو اردو زبان سے ہی ممکن ہے۔

تقریب میں مہمانِ اعزازی حیدر امان حیدر نے اپنا تعارف پیش کیا اور اپنی مترنم آواز میں چند قطعات نیز غزلوں سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے ان کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ حیدر امان حیدر کی شاعری دل کی آواز ہے۔ ان کی شاعری نوجوانوں کو فوراً متوجہ کرلیتی ہے۔ حیدر امان حیدر نے شاعری کے ساتھ ساتھ بطور نعت خواں بھی اپنی شناخت پوری دنیا میں بنائی ہے اور مختلف ممالک میں انھیں بطور خاص مدعو کیا جاتا ہے۔ اس تقریب میں حیدر امان حیدر کے دوست جناب پرویز خاں بھی شریک ہوئے اور اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی اور منیر انجم نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کے شکریے کے ساتھ تقریب اختتام کو پہنچی۔ تقریب میں ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر اجمل سعید، فیروز عالم، حقانی القاسمی، نیلم رانی، محمد احمد، اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالحی اور ڈاکٹر شاہد اختر کے علاوہ دیگر اسٹاف بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 28 اکتوبر 2019

معروف شاعر بدنام نظر کو استقبالیہ

نئی دھلی: لوک گیت ہمارا تاریخی وتہذیبی اثاثہ ہے۔ لوک گیتوں میں ہمارا ہزاروں سال کا ہندوستان سمایا ہوا ہے۔ اگر ہمیں اپنے قدیم اور اصل ہندوستان کو دیکھنا اور جاننا ہے تو ہمیں لوک گیتوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مگر تشویش ناک بات یہ ہے کہ موجودہ نسل ان گیتوں سے دور ہوتی جارہی ہے اور جدید تہذیب کی چمک نے اسے اپنے ماضی سے

دور کر دیا ہے۔ جب کہ ہم اپنے ماضی کی بازیافت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے صدر دفتر میں جناب بدنام نظر کے اعزاز میں منعقدہ ایک تقریب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے وزیر عزت مآب جناب رمیش پوکھریال نشنک لوک گیتوں اور ہندوستانی تہذیب سے وابستہ پروگراموں کے انعقاد میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ ہندوستانی تہذیب اور فلسفے کی تلاش ہم اپنے لوک گیتوں میں کر سکتے ہیں۔ موجودہ حکومت خاص طور سے ہمارے وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جو خود بھی ایک شاعر اور ادیب ہیں انھیں گاؤں کے لوک کلچر سے بہت زیادہ پیار ہے وہ بھی اس کلچر کو ملک کا اٹوٹ حصہ قرار دیتے ہیں۔

اس تقریب میں بہار کے معروف شاعر جناب بدنام نظر کو استقبالیہ دیا گیا۔ وہ اردو کے مشہور شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں گاؤں اور وہاں کی تہذیب وتمدن کا گہرا عکس نظر آتا ہے۔ انھوں نے اس موقع پر اپنی دو غزلیں سنائیں اور گاؤں کی رسموں پر تخلیق کردہ دو گیت بھی سنائے، جس پر حاضرین نے خوب داد وتحسین سے نوازا۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مزید کہا کہ بدنام نظر کی شاعری ہندوستان کی دیہی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتی ہے اور ان کی شاعری میں گاؤں کو سانس لیتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ آج ہم سب شہروں کی بھیڑ بھاڑ میں گم ہوگئے ہیں۔ ایسے میں ان کی شاعری سن کر دلوں کو ایک سکون سا ملتا ہے۔ تقریب میں قومی اردو کونسل سے ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی، ڈاکٹر یوسف رامپوری، محترمہ آبگینہ اور محمد انصر نے بھی اپنی تخلیقات پیش کیں۔ کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، شاہنواز محمد خرم، اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالحی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ڈاکٹر فیروز عالم اور ڈاکٹر شاہد اختر کے علاوہ دیگر اسٹاف بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 18 اکتوبر 2019

قومی اردو کونسل کا موبائل وین ٹور پروگرام (مہاراشٹر اور تلنگانہ)

47 واں فیز

.1	پونے (مہاراشٹر)	24 تا 27 نومبر 2019
.2	ممبئی (مہاراشٹر)	28 تا 30 نومبر 2019
.3	میرا روڈ (مہاراشٹر)	01 تا 02 دسمبر 2019
.4	ممبرا (مہاراشٹر)	03 دسمبر 2019
.5	بھیونڈی (مہاراشٹر)	04 تا 07 دسمبر 2019
.6	ناسک (مہاراشٹر)	08 دسمبر 2019
.7	مالیگاؤں (مہاراشٹر)	09 تا 12 دسمبر 2019
.8	اکل کنواں (مہاراشٹر)	13 تا 16 دسمبر 2019
.9	نندوربار (مہاراشٹر)	17 دسمبر 2019
.10	جلگاؤں (مہاراشٹر)	18 تا 21 دسمبر 2019
.11	ملکاپور (مہاراشٹر)	22 دسمبر 2019
.12	کھام گاؤں (مہاراشٹر)	23 دسمبر 2019
.13	اکولہ (مہاراشٹر)	24 تا 25 دسمبر 2019
.14	دریاپور (مہاراشٹر)	26 دسمبر 2019
.15	یاوتمل (مہاراشٹر)	27 تا 29 دسمبر 2019
.16	عادل آباد (تلنگانہ)	30 تا 31 دسمبر 2019
.17	نرمل (تلنگانہ)	01 جنوری 2020
.18	کاماریڈی (تلنگانہ)	02 جنوری 2020
.19	حیدرآباد (تلنگانہ)	03 تا 04 جنوری 2020

رابطہ: وی صدیق: موبائل نمبر: 9990597329,8920490683

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جلسۂ تقسیم اسناد

نئی دہلی: صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام جنگ آزادی کی تاریخ سے منسلک ہے اور یہ ہماری مشترکہ وراثت کا حصہ ہے۔ مسٹر کووند نے 30 اکتوبر کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسۂ تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوئے مزید کہا کہ اس یونیورسٹی کے بانیوں نے جو خواب دیکھا تھا وہ آج شرمندہ تعبیر ہو رہا ہے۔ جنگ آزادی کا بگل بجنے پر یہاں کے بانیوں میں محمد علی جوہر، حکیم اجمل خان سمیت کئی شخصیات نے اس میں حصہ لیا اور بابائے قوم مہاتما گاندھی کے ساتھ مل کر جامعہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس یونیورسٹی کا مقصد سب کو ساتھ لے کر چلنا اور کثرت میں وحدت قائم کرنا تھا اور یہ اپنے سوویں سال میں داخل ہونے کے دوران بھی اپنی شبیہ کو برقرار رکھے ہوئے ہے، جو قابل ستائش ہے۔ انھوں نے کہا کہ انھیں ایسی یونیورسٹی کی کانووکیشن تقریب کا حصہ بن کر فخر کا احساس ہو رہا ہے، جہاں سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے 22 سال تک وائس چانسلر کے طور پر خدمات انجام دی ہیں۔ بہار راج بھون اور راشٹرپتی بھون میں ذاکر حسین ہمارے پیش رو رہے ہیں۔ یہ ان کے لیے انتہائی خوشی کا لمحہ ہے۔ صدر نے کہا کہ تعلیم کا مقصد انسان کو بہتر بنانا ہوتا ہے اور جامعہ کے ترانے میں اس کی صاف جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ تعلیمی شعبے میں جامعہ دنیا کے کئی ممالک کے ساتھ مشترکہ پروگرام چلا رہی ہے جس سے اس کی شناخت عالمی سطح پر قائم ہوئی ہے۔ یہاں کے ماس میڈیا کے طالب علموں نے فلم اور میڈیا کے میدان میں بڑا نام کمایا ہے اور کھیل کے شعبے میں بھی کئی ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ اس یونیورسٹی نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی الگ شناخت بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ حکومت کی اہم اسکیم 'اُنت بھارت ابھیان' کے تحت جامعہ نے پانچ دیہات کو گود لیا ہے۔ یہ ایک قابل ستائش قدم ہے۔ انھوں نے کہا کہ مزید دیہات کو گود لینے کی ضرورت ہے تاکہ معاشرے کے محروم اور پسماندہ طبقوں کو قومی دھارے میں لایا جاسکے۔ اس موقعے پر وزارت ترقی برائے انسانی وسائل کے وزیر ڈاکٹر رمیش پوکھریال نشنک نے کہا کہ جامعہ سماجی تبدیلی کے لیے جانی جاتی ہے۔ یونیورسٹی میں کئی کورسز کو شامل کیا گیا ہے جن سے طالب علموں کو خودکفیل بنانے میں امداد ملی ہے۔ کوشل وکاس کے شعبے میں بھی جامعہ نے قابل ستائش کام کیے ہیں۔ ناسازگار حالات میں بھی اس یونیورسٹی نے خود کو قائم رکھا اور مسلسل نئی بلندیوں کو چھوتی رہی ہے۔ اس یونیورسٹی نے کئی شخصیات کو پیدا کیا ہے جنھوں نے ملک کا سر فخر سے بلند کیا ہے۔ مسٹر پوکھریال نے کہا کہ وزیراعظم نریندر مودی نے جس بہترین ہندوستان اور مضبوط ہندوستان کا خواب دیکھا ہے، اس کا راستہ بھی جامعہ سے ہوکر نکلتا ہے۔ حکومت جو نئی تعلیمی پالیسی لا رہی ہے اس سے نئے ملک کی تعمیر ہوگی۔ منی پور کی گورنر اور جامعہ کی چانسلر ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے کہا کہ یہاں کے بانیوں نے جامعہ کے قیام اور اسے آگے لے جانے میں بہت جدوجہد کی ہے۔ یونیورسٹی نے مسلسل ترقی کے نئی جہتیں قائم کی ہیں اور این اے اے سی نے اسے اے گریڈ کا درجہ دیا ہے جو سب کے لیے بہت خوشی کی بات ہے۔ جامعہ کی وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر نے کہا کہ جامعہ گنگا جمنی تہذیب کا خوبصورت نمونہ ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' 31 اکتوبر 2019

'جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اردو خدمات' پر سمینار

نئی دہلی: اردو اکادمی دہلی کے زیراہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدی تقریبات کے سلسلے میں شعبۂ اردو کے اشتراک سے 'جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اردو خدمات' کے موضوع پر سی آئی ٹی آڈیٹوریم میں افتتاحی اجلاس کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر نے کی۔ اس اجلاس میں جامعہ کے دو سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی اور نجیب جنگ بحیثیت مہمانان خصوصی شریک ہوئے۔ پروفیسر نجمہ اختر نے سمینار کے لیے دہلی اردو اکادمی اور شعبۂ اردو کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اور نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس سمینار سے جامعہ کی صد سالہ اردو خدمات کا مفصل احاطہ ہونے کی توقع بے جا نہیں ہے۔ سید شاہد مہدی نے کہا کہ جامعہ کی اردو نثر کو جو دین ہے وہ تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ یہ جامعہ کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے بیش تر شیخ الجامعہ اردو کے ادیب رہے ہیں۔ اردو کے فروغ کے لیے رسم الخط کی اشاعت ضروری ہے۔ انھوں نے مکتبہ جامعہ، کتاب نما، رسالہ جامعہ اور اسلام اور عصر جدید کی بازیابی پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ان رسائل اور اداروں نے اردو میں دانش وری کی روایت کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نجیب جنگ نے کہا کہ جامعہ کو اردو نے بہت کچھ دیا ہے لیکن اب اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اردو کے لیے جامعہ کیا کر رہی ہے۔ شعبۂ اردو کو جامعہ کا تاج ہونا چاہیے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے

'جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اردو خدمات' کے موضوع پر منعقدہ سمینار کا منظر

ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ اردو میں ترجمہ، علمی نثر، تھیٹر، بچوں کے ادب اور خواتین کے ادب کے ساتھ تعلیماتی لٹریچر اور دانش وری کی نئی روایت کے استحکام میں جامعہ کا کردار نا قابل فراموش ہے۔ جامعہ کے بانیان اور معمران نے اردو صحافت، شعر و ادب اور مختلف علوم و فنون سے نہ صرف ذاتی طور پر دلچسپی لی بلکہ انھیں فروغ بخشنے میں حد درجہ محنت سے کام لیا۔ مہمانِ اعزازی ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز پروفیسر محمد اسدالدین نے کہا کہ جامعہ اپنی ابتدا سے ہی زبانوں کا گہوارہ رہی ہے۔ اس کے معماران نے مختلف عالمی، ادبی اور علمی شاہکار کے اردو میں نہایت اعلیٰ درجے کے ترجمے کیے ہیں۔ صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے اپنے تعارفی کلمات میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور شعبۂ اردو کی اردو خدمات کا بسیط احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ کی روشن تاریخ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ جامعہ کی بنیاد اردو پر قائم ہے اور اردو کے بغیر جامعہ کا کوئی بامعنی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے وائس چیئرمین اردو اکادمی، دہلی پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ جامعہ سے اردو اکادمی دہلی کا دیرینہ تعلق رہا ہے۔ جامعہ سے وابستہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر خالد محمود اور پروفیسر اختر الواسع وغیرہ نے وائس چیئرمین کی حیثیت سے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔

سیمینار کے آخری دن تین تکنیکی اجلاسوں کے علاوہ اختتامی اجلاس کا انعقاد کیا گیا۔ اختتامی اجلاس کے صدر پروفیسر محمد ذاکر نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو علم و دانش اور شخصی جوہر کے انکشاف کی ایک نئی تجربہ گاہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہاں کے بنیاد گزاروں نے بنی بنائی ڈگر سے ہٹ کر نئی راہیں بھی تلاش کیں اور نئی منزلیں بھی۔ اجلاس کے دوسرے صدر پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ میں جامعہ کو روشن خیالی کا استعارہ تصور کرتا ہوں۔ اختتامی اجلاس میں سمینار کی روداد پیش کرتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے بتایا کہ کل تیس مقالات پیش کیے گئے۔ اس سمینار کا امتیاز یہ تھا کہ اس کے ہر اجلاس میں کسی ایک مرکزی عنوان کے تحت مقالات کا اہتمام کیا گیا۔ اظہار تشکر وائس چیئرمین اردو اکادمی دہلی پروفیسر شہپر رسول نے کیا۔ چوتھے اجلاس میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر انیس الرحمٰن نے کہا کہ جامعہ سے وابستہ تخلیق کاروں اور ناقدین اردو نے نئی نسل کی ذہنی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ اجلاس کے دوسرے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں انگریزوں نے اپنی تہذیبی، لسانی اور قومی برتری و تفوق کو تسلیم کروالیا تھا لیکن جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پہلی بار باور کرایا کہ ہماری مشرقی تہذیب مغرب سے بدرجہا بہتر ہے۔ چوتھے اجلاس میں ڈاکٹر یحییٰ نشیط نے 'رسالہ جامعہ کے اداریے'، ڈاکٹر تابش مہدی نے 'اردو تنقید اور جامعہ ملیہ اسلامیہ' حقانی القاسمی نے 'تخلیقی نثر کے فروغ میں جامعہ کا حصہ' اور ڈاکٹر جاوید حسن نے 'ڈرامائی ادب کے فروغ میں جامعہ کا کردار' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔ پانچویں اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر اختر صدیقی نے کہا کہ سو سال تک تسلسل کے ساتھ رسالہ 'جامعہ' اور 'پیام تعلیم' کا جاری رہنا کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، و ہمارا سماج' دہلی، 15 و 17 اکتوبر 2017

جشنِ وراثت اردو

نئی دھلی: اردو اکادمی دہلی کا اہم ترین 6 روزہ جشن وراثت اردو 30 اکتوبر سے شروع ہوا۔ نئی دہلی کے کناٹ پلیس واقع سینٹرل پارک میں سالہائے گذشتہ کی مانند اس برس بھی اردو والوں کے لیے سجائی جانے والی اس وسیع محفل میں نہ صرف اردو داں بلکہ غیر اردو داں محبان اردو کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی جس میں سب سے زیادہ نوجوان تھے۔ اس موقعے پر اردو اکادمی، دہلی کے وائس چیئرمین اور معروف وممتاز شاعر پروفیسر شہپر رسول نے افتتاحی اور استقبالیہ گفتگو میں کہا کہ جشن وراثت اردو میں آپ سب کی بے مثال دلچسپی اور اس پروگرام کی بے پناہ کامیابی اردو اکادمی، دہلی حکومت اور اردو اکادمی کے تمام ذمے داران و اراکین و ملازمین کا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ جشن وراثت اردو کے انعقاد کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ اس جشن کے انعقاد سے اردو کے فروغ کے امکانات مزید مستحکم ہوتے ہیں۔ افتتاحی پروگرام کے مہمان خصوصی غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ پہلے لوگ اردو کے سلسلے میں عجب وغریب حوصلہ شکنی کی باتیں کرتے تھے، لیکن اب جس طرح کے پروگرام منعقد ہو رہے ہیں اور جس طرح دہلی کے لوگ دلچسپی لے رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماضی کی بہ نسبت اب ملک میں اردو کے لیے ماحول زیادہ سازگار ہے۔ اردو اکادمی کے سکریٹری ایس ایم علی نے تمام مہمانوں، سامعین اور حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس پروگرام کے انعقاد کا مقصد ہی یہی ہے کہ آپ سب کو ایک ساتھ اکٹھا کیا جائے، محبت کے پیغام کو عام کیا جائے۔ محفل غزل میں پوروا گرو (حیدرآباد) سے لوگوں نے غزلیں سنیں اور محظوظ ہوئے۔ انھوں نے منتخب غزلیں اپنے مخصوص انداز میں پیش کیں۔ صوفی محفل کو وندنا مشرا (لکھنؤ) نے پیش کی۔ میرے رشک قمر پر تمام سامعین بالخصوص نوجوان طبقہ لطف اندوز ہوا۔ حیدرآباد کے مشہور قوال عتیق حسین بندہ نواز نے قوالی پیش کی۔ جشن وراثت اردو کے پہلے روز کا آخری پروگرام شام غزل کے عنوان سے منعقد ہوا۔ اس پروگرام کو معروف گلوکار طلعت عزیز (ممبئی) نے پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت اطہر سعید اور ریشما فاروقی نے کی۔

جشن وراثت اردو کے دوسرے روز کا پہلا پروگرام ٹیلنٹ گروپ نے پیش کیا۔ ٹیلنٹ گروپ کے بچوں نے قصہ گوئی کے ذریعے شاہ جہاں آباد اور دہلی کی تاریخ بیان کی۔ محفل غزل کا انعقاد کیا گیا، جسے غلام صابر (دہلی) نے پیش کیا۔ بعد میں جشن وراثت اردو کے سامعین نے غلام قادر نیازی (دہلی) سے قوالیاں سنیں۔ دوسرے روز دوبارہ محفل غزل منعقد کی گئی جسے پیش کیا علی حسین (پونے) نے۔ چہار بیت کی تاریخ میں اب تک مرد حضرات ہی حاوی اور غالب رہے ہیں لیکن بھوپال کے استاذ محمد مختار خان نے اس تاریخ میں نقاب زنی کرتے ہوئے خواتین کی چار بیت ٹیم بنائی اور اسے اردو اکادمی کے اسٹیج پر جشن وراثت اردو کے دوران پیش کیا۔ اس ٹیم میں شوبھا کیکر، تیجسو جاسنت، نویدتا سونی، ایشا گوسوامی، وپاکھیا چوہان، ایشوریہ سریواستو، زویا خان، انکت پاروچے اور آکاش ایکھارے شامل تھے۔

جشن وراثت اردو کے تیسرے روز بھی سامعین کی خاصی تعداد موجود تھی۔ تیسرے روز کے تمام پروگراموں سے سامعین لطف اندوز ہوئے۔ تیسرے روز کے پروگراموں کا آغاز بیت بازی سے ہوا۔

چوتھے روز کے پروگراموں کا آغاز بچوں کی قصہ گوئی سے ہوا۔ ٹیلنٹ گروپ کے پروگرام کے بعد مباحثہ ہوا، جس کا موضوع 'گاندھی جی' تھا، نظامت کے فرائض ڈاکٹر جاوید حسن، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ادا کیے۔ مباحثے کے اختتام پر پروفیسر کوثر مظہری نے گاندھی جی کی شخصیت اور نظریات اور جدوجہد آزادی میں ان کی خدمات کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی جی کے نظریات پر عمل کرنا جتنا پہلے ضروری تھا، اس سے کہیں زیادہ ضروری آج ہے۔

جشن وراثت اردو کے پانچویں روز بھی سامعین کی خاصی تعداد موجود رہی اور وہ تمام پروگراموں سے لطف اندوز ہوئے۔ محفل قوالی کے تحت دانش حسین و ہمنوا (بدایوں) نے بہترین اور منتخب قوالیاں پیش کیں۔ محفل قوالی کے بعد محفل غزل کا انعقاد کیا گیا جس میں کمال خان (لکھنؤ) نے اپنے فن سے چار چاند لگا دیے۔ اس کے بعد انڈین اوپیرا فیوزن پیش کیا کا کی کھنہ نے۔ انڈین اوپیرا فیوژن کے بعد مزاحیہ ڈراما اکبر دی گریٹ نہیں رہے پیش کیا گیا جس کے ڈائرکٹر یشراج ملک تھے۔ ڈرامے کے بعد شام غزل میں منجری (ممبئی) نے غزلیں پیش کیں۔ جشن وراثت اردو کے پانچویں روز کا آخری پروگرام شلپا راؤ (ممبئی) نے پیش کیا۔

6 روزہ جشن وراثت اردو کا سلسلہ سینٹرل پارک، کناٹ پلیس میں کل ہند مشاعرے کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچا۔ جشن وراثت اردو پر بات کرتے ہوئے اردو اکادمی کے چیئرمین اور دہلی کے نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا نے کہا کہ جشن وراثت اردو کے ذریعے عوام میں بہت مثبت اور غیر معمولی پیغام پہنچ رہا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 اکتوبر، 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 نومبر، 'میرا وطن' 2 نومبر، 'راشٹریہ سہارا' دہلی 3 نومبر؛ 'انقلاب' دہلی 4 نومبر، روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 نومبر 2019

مرزا دبیر: شخص اور شعری کائنات

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 'مرزا دبیر: شخص اور شعری کائنات' کے موضوع پر دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا ہے۔ سمینار کا کلیدی خطبہ اردو کے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر انیس اشفاق نے 'دبیر سوز تنقید منفی مقدمات کا محاکمہ' کے عنوان سے پیش کیا۔ خطبے میں

انھوں نے کہا کہ موازنے کے ذریعے دبیر فہمی کی جو عمارت تعمیر ہوئی اس کی پہلی اینٹ کو تا حال سیدھا نہیں کیا جا سکا اور اردو کے بڑے نقادوں کی تنقیدی آرا پر اب تک وہی اثر باقی ہے۔ اپنی گوناگوں علمی مصروفیات کی وجہ سے شبلی کو دبیر کے بہتر کلام کے انتخاب کا موقع نہیں ملا۔ یہ صحیح ہے کہ دبیر کے کلام میں انیس کی طرح سارے بند اور بندوں میں سارے مصرعے ایک تال کے نہیں لیکن یہ ان کی شاعری کو پرکھنے کا آخری پیمانہ نہیں ہو سکتا ہے۔ ہمیں ان کے کلام کے دیگر امتیازات پر بھی نظر کرنی چاہیے۔ سمینار کے مہمان خصوصی اور سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، سید شاہد مہدی نے کہا کہ رثائی ادب کے تعلق سے خاصا مواد جمع ہو گیا ہے لیکن جب بھی رثائی ادب کے تعلق سے کوئی سمینار منعقد کیا جاتا ہے تو زیادہ گفتگو انیس کے حصے میں آتی ہے، اس لحاظ سے غالب انسٹی ٹیوٹ مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے ایسے سمینار کا انعقاد کیا جس سے گفتگو کو دبیر پر مرکوز کیا جا سکے۔ پروفیسر آذر می دخت صفوی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے اس اہم ترین موضوع کو سمینار کے لیے منتخب کیا۔ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ مجھے بے حد خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے مرزا دبیر کی شاعری کو موضوع بحث بنایا۔ ہم سب اس احساس میں شریک ہیں کہ مرزا دبیر پر ویسی گفتگو نہیں ہو سکی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔' ڈاکٹر معید الرحمٰن نے 'مراثی دبیر بیانیہ کے تناظر میں' اور ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی نے 'مراثی دبیر میں بین کا کرب' کے موضوعات پر مقالے پیش کیے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ میں جاری دو روزہ قومی سمینار بعنوان 'مرزا دبیر: عہد اور شعری کائنات' اختتام پذیر ہوا۔ سمینار کے دوسرے روز بھی ملک کے مختلف گوشوں سے تشریف لائے اہل دانش نے مطالعۂ دبیر کے تعلق سے اپنے گراں قدر مقالات پیش کیے۔ سمینار کے دوسرے دن تین اجلاس کا انعقاد ہوا جس میں چودہ مقالات پیش کیے گئے۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت ممتاز نقاد اور فکشن نگار پروفیسر ابن کنول نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر خالد محمود نے کی جبکہ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انور پاشا نے کی۔ 2 نومبر کو افتتاحی اجلاس کے بعد مرزا دبیر کے تعلق سے دو اہم ترین کتابوں کی رسم رونمائی عمل میں آئی۔ پہلی کتاب 'مرزا دبیر مونوگراف' مصنفہ سید رضا حیدر اور دوسری کتاب مطالعۂ دبیر: سلام اور رباعیات کی روشنی میں مصنفہ: ڈاکٹر شاہدہ فاطمہ۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ ہم مرزا دبیر کے تعلق سے اتنے کامیاب سمینار کا اہتمام کر سکے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 نومبر، 'میرا وطن' دہلی، 4 نومبر 2019

دھلی:

طب یونانی اور اردو

نئی دھلی: یونانی کے مشہور و معروف حکیم امام الدین ذکائی نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ آج یونانی علاج کرنے کا دعویٰ کرنے والے بھی انگریزی میں

اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سرسید میموریل لیکچر کا انعقاد

نسخہ بناتے ہیں جس سے بہت دکھ ہوتا ہے کیونکہ اردو اور یونانی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم سوچ نہیں سکتے ہیں کہ اردو کے بغیر کس طرح یونانی سے وابستہ ہوسکتے ہیں اور یہ بھی سچائی ہے کہ اردو کے لیے یونانی بھی ہمیشہ سے آگے رہی ہے۔ حکیم امام الدین ذکائی نے کہا ہے کہ بیشتر یونانی سے وابستہ پروگرام سیمنار اور ورکشاپ میں اردو کی بات کم کی جاتی ہے۔ ہمارے نوجوان بی یو ایم ایس انگریزی پر زور دیتے ہیں جبکہ ان کو زیادہ سے زیادہ اردو کا استعمال کرنا چاہیے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے لائبریرین اور جامعہ اردو علی گڑھ کے سابق رجسٹرار ڈاکٹر مشکوراللہ خان نے کہا کہ آج کا دور مقابلہ جاتی دور ہے لیکن ہمیں اپنی تہذیب کو ختم نہیں کرنا ہے بلکہ اس کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 اکتوبر 2019

سرسید میموریل لیکچر

نئی دهلی: سرسید احمد خاں کا مشن اصلاحی تھا۔ انھوں نے محسوس کرلیا تھا کہ جدید تعلیم کے بغیر آنے والے زمانے کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اپنی اس جدوجہد میں ہر قسم کی مزاحمت کا مقابلہ کیا اور اپنی منزل حاصل کی۔ ان خیالات کا اظہار سابق انفارمیشن کمشنر پروفیسر ایم ایم انصاری نے سرسید میموری لیکچر کے دوران کیا، جس کا اہتمام اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی دہلی شاخ نے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں کیا تھا۔ اس موقعے پر مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے وائس چانسلر پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ہندوستان کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ جدید تعلیم کا پہلا ادارہ ہندوستان میں قائم ہوا اور اس کا سہرا سرسید احمد خاں کے سر بندھتا ہے۔ پرفیسر اختر الواسع نے مزید کہا کہ اے ایم او کالج نے جدید تعلیم کی جو جوت جگائی اس کی روشنی ساری دنیا تک پہنچی۔ سرسید نے مذہب اور سائنس کے درمیان غیر معمولی ہم آہنگی پیدا کی۔ اس موقعے پر سینئر صحافی اور ادیب معصوم مرادآبادی نے کہا کہ سرسید احمد خاں ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے جس میدان میں بھی قدم رکھا، وہاں اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اردو صحافت ان کا اولین مشغلہ تھا اور انھوں نے اپنی زندگی میں چار جرائد کی بنیاد ڈالی اور اردو زبان اور صحافت کو معیار اور اعتبار عطا کیا۔ معصوم مرادآبادی نے مزید کہا کہ سرسید جیسی شخصیات صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور ان کے اثرات صدیوں تک باقی رہتے ہیں۔ تقریب کی صدارت اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر فصیح اللہ خاں نے کی اور ایسوسی ایشن، دہلی کو علیگ برادری کے لیے زیادہ فعال بنانے کا عزم دہرایا۔ تقریب کی نظامت ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری محمد اسلم خاں ایڈووکیٹ نے بحسن وخوبی انجام دی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی 18 اکتوبر 2019

دہلی میں 21ویں مشاعرہ جشن بہار کا انعقاد

نئی دهلی: 'جشن بہار ٹرسٹ' نے شام ڈی پی ایس متھرا روڈ میں اپنے 21ویں بین الاقوامی مشاعرہ جشن

بہار 2019 کا انعقاد کیا گیا۔ شاعر جہاں دہلی کی خوشگوار فضا میں محبت کے رس گھول رہے تھے، وہیں مہاتما گاندھی کے 150ویں جینتی کے موقعے پر فرقہ وارانہ ہم آہنگی، آفاقی اخوت اور جامعیت کے گاندھیائی نظریات بھی آج کی تازہ شاعری میں بھرپور نظر آئے۔ مشاعرے کے آغاز پر جشن بہار ٹرسٹ کی بانی محترمہ کامنا پرساد نے اپنے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ اردو گاندھی وادی ہے، محبت کی زبان ہے، امن واتحاد کی باتیں کرتی ہے، لیکن زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، ان کا کام ہوتا ہے۔ رابطے قائم کرنا، محبتوں کے پل باندھنا۔ مشاعرے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک دہلی کے نائب وزیراعلیٰ منیش سسودیا نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ دہلی جیسے ہندوستان کی راجدھانی ہے ویسے ہی اردو کی بھی دارالحکومت ہے۔ اردوئے معلی بھی یہیں سے ہے اور اردو بازار بھی یہیں ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں کو اردو پڑھتے، لکھتے دیکھا ہے اور جشن بہار جیسا مقبول مشاعرہ اردو زبان کی ہندوستانیت کا گواہ ہے، ایسے میں اس زبان کو جو لوگ آج کل غیر ملکی قرار دے رہے ہیں انھیں ہندوستان کی تاریخ اور مشترکہ تہذیب پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر محترمہ نجمہ اختر اور مشاعرہ کی صدر اور حال ہی میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز ممتاز ادیبہ محترمہ چترا مدگل و دیگر نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 اکتوبر 2019

اردو شاعری مقابلہ

نئی دهلی: اسکول آئی ڈی نمبر 1923041 حوض رانی گرلس سینئر سیکنڈری اسکول میں زونل لیول کے اردو شاعری مقابلہ کا شاندار انعقاد ہوا جس میں متعدد اسکولوں سے جونیئر اور سینئر طلبہ وطالبات نے شرکت کرتے ہوئے اپنی نمائندگی درج کرائی۔ جج کے طور پر ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل سینئر سیکنڈری اسکول جعفرآباد کے استاد فرحان بیگ اور معروف ادیب وصحافی ماسٹر حبیب سیفی، نیز راما کرشن پورم اسکول کی استانی طاہرہ منظور نے اپنے فرائض انجام دیے۔ غالب، داغ، اقبال اور جگر کے ساتھ اجمل سلطانپوری و دیگر کی شاعری پیش کرتے وقت بچوں نے عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ واضح رہے کہ شبنم ناز PGT اور ششی کلا ورما TGT اسکول ہذا میں تہذیب وثقافتی تقریبات کا اہتمام اپنی کوششوں سے کرتے ہوئے اسکول کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ اردو شاعری کے اس ضلعی سطح کے مقابلہ میں شرکت کرنے والے بچوں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرحان بیگ نے کہا کہ کسی بھی مقابلہ میں شرکت کرنے اور اس میں کامیاب ہونے نہ ہونے سے زیادہ اس بات کو ہمیت دی جائے کہ آپ اس مقابلہ کا حصہ ہیں، جس سے دوسرے بچے محروم ہیں۔ حبیب سیفی نے غزل ونظم کی گائیکی کے لیے لفظیات کی ادائیگی درست کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے اردو قواعد اور مخارج پر توجہ دینے کی بات کہی۔ طاہرہ منظور نے نفس مضمون کی وقعت کو سمجھتے ہوئے ترنم اور تحت کا انتخاب کرنے پر زور دیا۔ یہ انداز پیش کش پر موقوف رہتا ہے کہ کوئی بچہ کیسے کسی شاعری کو پیش کرتا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 اکتوبر 2019

انجم عثمانی کے افسانے اور ان کے تجزیے

نئی دہلی: غالب اکادمی (نئی دہلی) میں ایک نئی کتاب انجم عثمانی کے افسانے اور ان کے تجزیے، پر ایک

مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ انجم عثمانی کی تمام کہانیاں علامتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں کتاب ایک علامت ہے۔ بوڑھا آدمی ساری کہانیوں میں موجود ہے۔ گھر بھی سب کہانیوں میں مذکور ہے۔ ان کی زبان سب کی سمجھ میں آنے والی ہے اس لیے کہانیوں کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی۔ اس موقعے پر بزرگ افسانہ نگار رتن سنگھ نے کہا کہ انجم عثمانی کی کہانی 'شہر گریہ کا مکیں' بہت اہم ہے۔ اس میں کبوتر والے ماموں کا کردار غیر معمولی ہے۔ ایسے کردار ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ انجم عثمانی کے افسانوں نے ہمیں لکھنے پر مجبور کیا۔ ان کا بیانیہ بہت اچھا ہے۔ انجم کی تخصیص یہ ہے کہ بدلاؤ کو خوبصورت انداز میں ثقافت و معاشرت کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔ اس موقعے پر تحسین منور نے کہا کہ ان کی کہانیاں قصبوں خاص طور سے دیوبند کے قریب ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں گنگا جمنی تہذیب ہے۔ ماموں کا کردار اس تہذیب کا نمائندہ کردار ہے۔ وہ کہانیوں میں منظرنامہ پیش کرتے ہیں۔ اس موقعے پر فاروق ارگلی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ان کی کہانیاں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ وہ ایک حساس تخلیق کار ہیں۔ زاہد علی خاں نے کہا کہ انجم عثمانی کو اردو پروگرام کی تشکیل، ترتیب، انتخاب کا بہترین سلیقہ ہے۔ ان کے یہاں ہر کام میں اصلاح کا پہلو ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نگار عظیم نے کہا کہ انجم عثمانی کے یہاں حس مزاح بہت ہے اور طنز میں گہرائی ہے۔ محمد خلیل نے کہا کہ ان کی کہانیوں کی آشفتہ بیانی پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ ہر کہانی میں خود موجود رہتے ہیں۔ ان کے فن اور کتاب پر مبنی خوبصورت نظم پیش کی گئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید فاروق نے انجم عثمانی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ انجم عثمانی صاف شفاف کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ ہوتی ہے۔ اسے کوئی بھی پڑھ سکتا ہے۔ اس موقعے پر عقیل احمد نے کہا کہ ان کی کہانیوں کے موضوعات منفرد ہیں، انھوں نے دیوبند اور دہلی کو کہانی میں پیش کیا ہے۔ ان کی کہانی کا دوسرا وصف اختصار اور جامعیت ہے۔ انجم عثمانی نے اس موقعے پر کہا کہ دوردرشن سے مجھے بہت کچھ ملا اور میں نے کچھ خدمات انجام دیں لیکن کہانیاں میں دہلی آنے سے پہلے سے لکھ رہا ہوں۔ جب میری کہانیوں پر بات ہوتی ہے تو مجھے زیادہ خوشی ملتی ہے۔

روز نامہ 'میرا وطن' دہلی، 21 اکتوبر 2019

اتر پردیش:

پروفیسر محمد یونس نگرامی ندوی: شخصیت اور فن

سہارنپور: لکھنؤ یونیورسٹی کے ممتاز PG کالج کے مولانا علی میاں ہال میں 'آل انڈیا مسلم انٹلکچول' اور 'اردو اکادمی اتر پردیش' کے اشتراک سے ایک پروقار سمینار بعنوان 'پروفیسر محمد یونس نگرامی ندوی شخصیت اور فن' منعقد ہوا جس کی صدارت معروف عالم دین دارالعلوم ندوۃ العلما کے مہتمم حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی دامت برکاتہم العالیہ نے فرمائی۔ بطور مہمان خصوصی حضرت مولانا سید محمد شاہد الحسنی، امین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، سابق گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی صاحب، کارگزار وزیر اعلیٰ ڈاکٹر عمار صاحب، مولانا کفیل اشرف صاحب اور مولانا حمید الدین صاحب نے ڈاکٹر عمار نگرامی کی دعوت پر شرکت فرمائی۔ حضرت مولانا سید محمد شاہد الحسنی نے مولانا موصوف کے محاسن بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا ایک زندہ دل، نیک طبیعت، نیک خو اور صوم وصلوٰۃ کے پابند متحرک انسان تھے جنھوں نے اپنی پوری زندگی دینی وعصری علوم کے سیکھنے اور سکھانے میں صرف کی۔ ہمیں بھی ان کی حیات وخدمات سے سبق لے کر ان کے محاسن پر عمل کرنا چاہیے۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 15 اکتوبر 2019

محبان ملت

پریاگ راج: بعنوان محبان ملت، سرسید احمد خاں، ڈاکٹر علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام کی مجموعی خدمات کو یاد کرتے ہوئے سہ روزہ ادبی تقریبات کا انعقاد الہ آباد ڈگری کالج شاخ نسواں کے شعبہ اردو کی جانب سے کیا گیا۔ تقریب کے پہلے سرسید احمد خاں کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالی گئی اور ان کی نگارشات بھی پیش کی گئیں۔ بعدازاں سرسید کے مقالات سے مقابلہ نثر خوانی میں کالج کی طالبات نے گرم جوشی سے حصہ لیا۔ ڈاکٹر شہناز نے مذکورہ تینوں عظیم شخصیات کی ملی وقومی خدمات کا ذکر کیا۔ ایم اے کی طالبات حبیبہ نعیم، مومنہ بانو، ساجدہ بیگم اور شیبہ بانو وغیرہ نے 'سرسید احمد خاں: حیات وخدمات' کے مختلف گوشوں پر مقالات پیش کیے۔ علاوہ ازیں مقابلہ نثر خوانی میں بھی حصہ لیا۔ بی اے سال اول کی نکہت جہاں، مومنہ، سال دوم کی طالبات شاکرین بانو، شیبہ بانو، ہما شمیم، طیبہ بانو و سال سوم کی طالبات ہبہ صدیقی، صبا فردوس، سمیہ بانو و ادیبہ وکیل بھی مقابلہ نثر خوانی میں شریک رہیں۔ جج اے ڈی سی کی سابقہ ہونہار طالبہ شفقت زاہدہ ہیں جب کہ نظامت کے فرائض شعبے کی گیسٹ لیکچرار ڈاکٹر جوہی بیگم نے انجام دیے۔ دوسرے دن کے پروگرام میں مولانا ابوالکلام آزاد کے تخلیقی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی۔ ساتھ ہی مولانا کی مجموعۂ خطوط 'غبار خاطر' سے اقتباسات پیش کرنے کا مقابلہ نثر خوانی منعقد ہوا جس میں ایم اے کی طالبات ساجدہ بیگم کو اول، شیبہ بانو کو دوم اور حبیبہ نسیم کو سوم مقام حاصل ہوئے۔ بی اے مقابلہ میں ادیبہ وکیل اول ہما شمیم، دوم نکہت جہاں اور سوم پر رہیں جج شفقت زبدہ کے ہاتھ بازی آئی۔ تیسرے دن کا پروگرام ڈاکٹر سر محمد اقبال پر مبنی تھا ان کی حیات وخدمات کو یاد کیا گیا اور نظم خوانی ہوئی۔ ان کا مقابلہ سب سے مخصوص تھا۔ علامہ کے فلسفی کلام پر مفصل روشنی ڈالی گئی۔ دعائیہ نظم 'لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری، زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری' ساتھ ہی کامیابی حاصل کرنے والی طالبات کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ انعامات کی تقسیم ڈاکٹر جوہی بیگم کے ہاتھوں ہوئی۔ ڈاکٹر شہناز صبیح نے اظہار تشکر کیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اکتوبر 2019

سرسید یادگاری خطبہ

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں سرسید یادگاری خطبے کا اہتمام کیا گیا۔ شعبۂ اردو کی جانب سے منعقدہ خطبہ کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر سراج اجملی کو دعوت دی گئی تھی۔ سراج اجملی کے خطبے سے قبل ڈاکٹر ثوبان سعید نے سراج اجملی کی ادبی خدمات کا تعارف کرایا۔ ایم اے

سال آخر کے طالب علم سرور امام نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ تقریب کی صدارت صدر شعبہ پروفیسر شفیق احمد اشرفی نے کی۔ سرسید یادگاری خطبہ کے تحت خطاب کرتے ہوئے پروفیسر اجملی نے کہا کہ اظہار رائے ہر شعبہ زندگی کے لیے ضروری ہے۔ سرسید بھی اسی اصول پر گامزن رہے۔ انھوں نے اپنے جو عقائد بھی بنائے تھے گو کہ اس پر دیگر لوگ معترض تھے لیکن انھوں نے اپنی رائے کے اظہار میں کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ سرسید کے نظریات و عقائد اپنے مطالعے کی اساس پر تھے کسی بھی فرقے یا مذہب کی دل آزاری ان کا مقصد نہیں تھا۔ ان کا مقصود مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور اصلاح و ترقی تھا۔ وہ اس راہ میں خاموشی یا زبان کو مصلحت کی چادر میں لپیٹنے کو گناہ تصور کرتے تھے۔ سرسید کے وہ نظریات و افکار جن کو مسلم عقائد کے خلاف کہا جاسکتا تھا وہ صفحات پر تو موجود ہیں لیکن علی گڑھ تحریک کے صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ لیکن اصلاح و ارتقا کے نظریات سرچڑھ کر بول رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سرسید ایک پکے مسلمان اور سچے عاشق رسول تھے۔ ان کا یہ قول کہ ایک ہاتھ میں قرآن دوسرے میں سائنس اور فلسفہ اور سر پر لا الہ کا تاج ہونا چاہیے۔ وہ ایک عملی انسان تھے اور عمل پر ہی یقین کرتے تھے۔ صدر شعبہ سید شفیق احمد اشرفی نے سراج اجملی کی تشریف آوری اور فکر انگیز خیالات کے لیے شکریہ ادا کیا اور ان سے یہ وعدہ بھی لیا کہ وہ ہماری یونیورسٹی کو اسی طرح اپنا تعاون دیتے رہیں گے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر فخر عالم اعظمی، ڈاکٹر اکمل شاداب، ڈاکٹر مرتضیٰ علی اطہر، ڈاکٹر وصی اعظم انصاری، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن، ڈاکٹر عبدالحق کمال، ڈاکٹر رضوان، سبط حسن نقوی اور کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'قومی تنظیم' لکھنؤ، 23 اکتوبر 2019

ڈاکٹر زیبا محمود کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب

ٹانڈہ: دورِ حاضر کی معتبر، متحرک اور فعال ناقد محترمہ ڈاکٹر زیبا محمود صاحبہ (ایسوی ایٹ، پروفیسر گنپت سہائے پی، جی، کالج سلطانپور) کے اعزاز میں نیشنل اردو تحریک اردو بازار (سکراول) ٹانڈہ امبیڈکر نگر کے دفتر میں ایک استقبالیہ تقریب و ادبی مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت معروف سماجی و سیاسی شخصیت ڈاکٹر متین جمالی نے کی اور نظامت کے فرائض قاری جمال اشرف نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے استاد محمد اسلم خان نے شرکت کی۔ تحریک کے رہنما انس مسرور انصاری نے گلدستہ پیش کر کے مہمان اعزازی و صدر کا پرجوش خیر مقدم اور استقبال کرتے ہوئے تہنیتی کلمات پیش کیے اور کہا کہ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ وہ پروفیسر محمود الٰہی کی ادبی وراثت کو فروغ دینے کے لیے ہمہ تن مصروف اور سرگرم عمل ہیں۔ تقریب کے صدر نے اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ پروفیسر محمود الٰہی سے میرے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ ڈاکٹر امین احسن نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ بیسویں صدی استاذی پروفیسر محمود الٰہی کی محققانہ اور ناقدانہ صلاحیت کی معتبریت پر ناز کرتی ہے اور اکیسویں صدی زیبا محمود کے رشحات قلم اور شاندار ادبی نگارشات سے روشنی حاصل کر رہی ہے۔ مہمان خصوصی محمد اسلم خاں نے کہا کہ تعلیم و تعلم کے علاوہ اردو ادبیات کے حوالے سے زیبا محمود صاحبہ کا نام نہایت اہم ہے۔ مہمان اعزازی نے اظہار تشکر کرتے ہوئے تحریک کی سرگرمیوں اور مقاصد کی تعریف کی اور کہا کہ یہ تحریک اردو کے بنیادی مسائل کے تدارک اور حل کے لیے شب و روز فعالیت کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ انھوں نے تحریک کو ہر طرح سے امداد و استعانت کا یقین دلایا۔ آخر میں سکریٹری غفران کمالی نے مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 1 نومبر 2019

شعبہ اردو اے ایم یو میں ریسرچ ایسوسی ایشن کے تحت 'شام افسانہ' کا اہتمام

شام افسانہ

علی گڑھ: اردو افسانے نے ہمیشہ ان مسائل کو اٹھایا ہے جن کے حل کی ضرورت سماج کو تھی، بعض دفعہ لوگ کہتے ہیں کہ افسانہ کیا ہے، حالات کے مطابق کسی ایسے موضوع کا انتخاب کر کے پروگرام کرنا چاہیے جس سے سماج کا فائدہ ہو۔ ان کو یہ نہیں معلوم کہ اردو افسانے کی یہ روایت رہی ہے کہ اس نے ہمیشہ سماجی مسائل کو موضوع بنایا اور ان کو حل کرنے کی پوری کوشش کی۔ یہ باتیں عصر حاضر کے معروف و معتبر افسانہ نگار سید محمد اشرف نے شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منعقد شام افسانہ میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے افسانے کی سیاسی و سماجی جہات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس موقعے پر پیش کیے گئے افسانوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ توصیف بریلوی کے افسانہ 'رگ جاں سے قریب' میں مسلکی تنافر کو موضوع بنایا گیا ہے اور بہت خوبصورتی کے ساتھ بغیر کسی کی دل آزاری کے افسانہ پیش کیا گیا ہے، وہیں محمد حنیف خاں کے افسانے 'فیصلہ کا حق' میں فی زمانہ محبت کی ناقدری کو اجاگر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ہمارا سماج آج کہاں پہنچ گیا ہے۔ خوشنما کے افسانہ 'بھیڑ' اور شہناز انصاری کے افسانہ 'آدھا سموسہ' میں بھی سماجی مسائل کی ہی عکاسی کی گئی ہے۔ اس موقعے پر سید محمد اشرف نے اپنا افسانہ 'دعا' بھی سنایا۔ ریسرچ ایسوسی ایشن شعبہ اردو اور کورٹ ممبر فیکلٹی آف آرٹس کے اشتراک سے منعقد شام افسانہ کی صدارت کرتے ہوئے صدر شعبہ اردو پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے کہا کہ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ ہمارے شعبے میں اتنے شاندار پروگرام کا اہتمام ہوا جس میں عصر حاضر کے دو مایہ ناز افسانہ نگاروں کی موجودگی میں ہمارے طلبا نے اپنے افسانے پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ طلبا اس سے جہاں فن اور تکنیک سیکھ سکیں گے، وہیں ان کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ افسانہ سنایا کیسے جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ افسانہ لکھنا اور افسانہ سنانا دونوں فن ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، یکم نومبر 2019

بہار:

حامد حسین حامد عظیم آبادی کی شخصیت اور شاعری

پٹنہ: خانقاہوں نے اردو سمیت مختلف زبانوں کو فروغ دینے کی ہمیشہ ہر ممکن کوشش کی ہے اور خانقاہیں اردو کی خدمت کے حوالے سے ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔ یہ بات ممتاز خطیب اور خانقاہ منعمیہ کے سجادہ نشیں ڈاکٹر سید شاہ شمیم الدین احمد منعمی نے سید شاہ حامد حسین حامد عظیم آبادی کی شخصیت اور شاعری کے موضوع پر ایک مذاکرہ کی صدارت کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ مشاعرے کی تاریخ خانقاہوں سے جڑی ہوئی ہے۔ یہ طرحی مشاعرہ 100 سال قبل 1919 میں اسی خانقاہ میں صاحب سجادہ حضرت سید شاہ حامد حسین حامد عظیم آبادی کی سرپرستی میں منعقد کیے گئے دو روزہ مشاعرہ کی یاد میں منعقد کیا گیا جو مغرب کی نماز کے بعد سے تقریباً دو بجے رات تک چلا

جس میں کلکتہ، جمشید پور، گریڈی، بھاگلپور، مظفر پور، گیا، پٹنہ سٹی، پھلواری شریف، داناپور، آسنسول، ہزاری باغ اور ویشالی سے تشریف لائے۔ درجنوں شعرائے کرام نے شرکت کی اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ بزم دوستاں کی طرف سے منعقد تقریب میں اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر شمیم منعمی نے کہا کہ یہ خانقاہ اردو کی خدمت کے حوالے سے ہمیشہ یاد کی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ خانقاہوں نے شعر وسخن اور لوح وقلم کی ہمیشہ آبیاری کی ہے۔ خانقاہوں کو آج اپنے منصب اور ذمہ داریوں کو سمجھنا ہوگا۔ خانقاہ کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ انھوں نے مشاعرہ کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مشاعرہ سے وقت کی بربادی نہیں ہوتی، زبان کو زندہ رکھنے اور مضبوط بنانے کے لیے مشاعرے کا وقتاً فوقتاً انعقاد ضروری ہے۔ مذاکرہ سے خطاب کرتے ہوئے اردو ڈائرکٹوریٹ کے فعال، ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ اردو کے فروغ میں مشاعرہ اہم کردار ادا کرتا ہے، اس سے زبان کے فروغ کے لیے ماحول اور فضا بنتی ہے۔ صوفیائے کرام نے خانقاہوں کے توسط سے جہاں دین کی ترویج واشاعت کی، وہیں اردو کو بھی فروغ دیا۔ انھوں نے کہا کہ ان خانقاہوں کے بزرگوں کی دین ہے کہ ہندوستان میں اردو پھل پھول رہی ہے۔ امتیاز احمد کریمی نے خانقاہوں سے اپیل کی کہ وہ تعلیم کے فروغ کی طرف بھی توجہ دیں اور اپنے وجود کا احساس دلائیں۔ مذاکرہ کی نظامت کرتے ہوئے سینئر صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے کہا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں آج سے تقریباً سو سال پہلے بارہ تیرہ اپریل 1919 کو ایک تاریخ ساز مشاعرہ ہوا تھا۔ یہ وہ مشاعرہ تھا جس کی صدارت اور سرپرستی حضرت حامد حسین حامد عظیم آبادی نے کی تھی۔ حضرت کی پیدائش 1882 میں محلہ درگاہ شاہ ارزاں میں ہوئی اور آپ کا انتقال 85 سال کی عمر میں 1967 میں ہوا اور تدفین احاطہ درگاہ شاہ ارزاں میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 اکتوبر 2019

میراجی کی عصری معنویت پر سمپوزیم

راجستھان:

میراجی کی عصری معنویت پر سمپوزیم

جودھ پور: ہندوستانی زبان کا شاعر میراجی کی شاعری کا تعلق آریوں سے جا کر ملتا ہے جو کہ جنسیات کی جدلیات پر مبنی ہے۔ اس دور میں میراجی اردو شاعری کے ساتھ معروف تو ہوئے لیکن مقبول نہیں۔ ان خیالات کا اظہار ساہتیہ اکادمی دہلی میں اردو کے کنوینر عالمی شہرت یافتہ شاعر اور نقاد شین کاف نظام نے گھومر کے بینکٹ ہال میں منعقدہ میراجی سمپوزیم میں ساہتیہ اکادمی دہلی اور راجستھان اردو اکادمی جے پور کی مشترکہ میزبانی میں منعقدہ افتتاحی سیشن کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جرنلزم اور ماس کمیونی کیشن کے صدر پروفیسر شافع قدوائی نے مہمان خصوصی کے طور پر اپنے خطاب میں کہا کہ میراجی کی شاعری داخلی کشمکش کے لمحوں کو روشن کرنے والی ہے۔ انھوں نے عمر خیام کی نظموں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ استقبالیہ کلمات ساہتیہ اکادمی کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اجے کمار شرما نے ادا کیے۔ راجستھان اردو اکادمی کے سکریٹری محمد معظم علی نے استقبال کیا۔ پہلے سیشن کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ میراجی کی شاعری کو سمجھنے کے لیے شخصیت کو بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔ اس موقعے پر مجلہ استبصار کے معاون مدیر عادل رضا منصوری نے کہا کہ قاری کو شاعری میں رہتے ہوئے ہی اپنا سچ تلاش کرنا ہوتا ہے۔ ابوبکر عباد نے بتایا کہ میراجی کی شاعری جنتی سطح پر دکھائی دیتی ہے اس سے کہیں زیادہ نیچے کی تہوں میں موجود ہے۔ حقانی القاسمی نے میراجی کے تراجم پر مقالہ پڑھا۔ اس سیشن کی نظامت اشراق الاسلام ماہر نے کی۔ دوسرے سیشن کی صدارت مولی بخش نے کی جنھوں نے میراجی کی شاعری میں وشنو فلسفہ اور چارواک کے فلسفے کے حوالے سے گفتگو کی۔ اس سیشن میں شاہد پٹھان نے میراجی کی تنقید کے حوالے مقالہ پیش کیا جبکہ علاء الدین خان نے میراجی کے گیت اور محمد حسین نے میراجی کی شاعری میں جنسی جذبات کے حوالے سے بات کی۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر نثار راہی نے کی۔

روزنامہ 'دینک جیوتی' جودھپور، 20 اکتوبر 2019

مہاراشٹر:

یومِ ترغیبِ مطالعہ

اورنگ آباد: اورنگ آباد کے اردو اسکولوں میں ملک کے سابق صدر جمہوریہ، میزائل مین ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام 15 اکتوبر کو 'یوم ترغیب مطالعہ' کے عنوان سے منایا گیا۔ شہر کے اردو اسکولوں کے ہزاروں طلبا نے اسکولوں کی لائبریری میں رکھیں کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اسی کے ساتھ ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن اورنگ آباد کی جانب سے بھی قومی اردو کونسل سے شائع ماہنامہ 'بچوں کی دنیا'، 'خواتین دنیا' کے خصوصی شمارہ طلبا میں مفت تقسیم کیے گئے۔ فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر مرزا عبدالقیوم ندوی نے بتایا کہ گذشتہ چار سالوں سے 15 اکتوبر کو ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے یوم پیدائش کی مناسبت سے طلبا میں مطالعہ کا شوق، کتابوں کے تئیں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے شہر کے مختلف اسکولوں میں مطالعہ بیداری مہم چلائی جاتی ہے، انھیں ملک و بین الاقوامی شخصیات کے بارے میں بتایا جاتا ہے، 2 اکتوبر کو مہاتما گاندھی اور لال بہادر شاستری کی یوم پیدائش پر بھی اسی طرح کے پروگرام منعقد کیے گئے تھے۔ فاؤنڈیشن کی جانب سے ابھی تک ہزاروں کتابیں شہر کے مختلف اسکولوں میں تقسیم کی گئی ہیں۔ اسکول کے سکریٹری لائق سید نعیم نے بھی طلبا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک کے سب سے مشہور و ہر دلعزیز صدر جمہوریہ اپنے بچپن میں اخبار بیچا کرتے تھے اور ساتھ میں تعلیم بھی حاصل کرتے تھے، وہ ہمیشہ طلبا سے کہتے تھے ''خواب وہ ہے جو آپ کو بے چین کردے۔''

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 اکتوبر 2019

مغربی بنگال:

کولکاتہ سب سے زیادہ نوبل جیتنے والا شہر

کولکاتہ: مغربی بنگال کی راجدھانی کولکاتہ دنیا کا پہلا ایسا شہر بن گیا ہے جہاں کے 6 دانشوروں کو نوبل انعام مل چکا ہے۔ حال ہی میں ابھجیت ونائک بنرجی کو معاشیات کے زمرے میں نوبل انعام دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس سے بنگال سمیت پورے ملک میں خوشی کی لہر ہے۔ اس شرف کے حاصل ہوتے ہی کولکاتہ دنیا کا واحد شہر بن

گیا ہے جس نے چھ نوبل اور ایک آسکر ایوارڈ جیتا ہے۔ کولکاتہ سے متعلق جن لوگوں کو نوبل انعام ملا ہے وہ ہیں رونالڈراس، رابندر ناتھ ٹیگور، سی وی رمن، مدرٹریسا، امرتیہ سین اور ابھجیت بنرجی۔ سب سے پہلے رونالڈراس کو 1902 میں نوبل انعام ملا تھا۔ انھیں میڈیسن کے شعبے میں ملیریا اور دیگر بیکٹریا سے پیدا ہونے والی بیماریوں کو پھیلانے والے مچھروں سے بچاؤ کے لیے کی گئی ایجاد کے لیے نوبل انعام سے نوازا گیا تھا۔ وہ 1888 میں کولکاتہ آئے تھے۔ اس کے بعد 1913 میں گرودیو رابندر ٹیگور نے ادب کے میدان میں یہ ایوارڈ جیتا تھا۔ وہ پہلے غیر یوروپی تھے جنھیں نوبل انعام سے نوازا گیا تھا۔ ان کے ناول گیتانجلی کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا تھا جس پر انھیں یہ اعزاز ملا تھا۔ اس کے بعد 1930 میں سائنسداں سی وی رمن کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔ فزکس کے شعبہ میں ملے اس نوبل انعام کو حاصل کرنے والے سی وی رمن نہ صرف بھارت بلکہ ایشیائی براعظم کے پہلے سائنسداں تھے۔ 1860 سے 1935 تک انھوں نے کولکاتہ کے بو بازار میں واقع انڈین ایسوسی ایشن فار دی کلٹیویشن آف سائنس کے ساتھ جڑ کر کام کیا تھا اور رمن افیکٹ اصول انجام دیا تھا۔ سنت مدر ٹریسا کو 1970 میں امن کے لیے اعزاز دیا گیا تھا۔ غریبوں کی ترقی، تعلیم اور صحت کے لیے انھوں نے جو کام کیا تھا اس کے لیے انھیں اس ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ 1950 میں کولکاتہ میں انھوں نے مشنریز آف چیریٹی قائم کی جو دنیا بھر کے مختلف ممالک میں کام کرتی ہے۔ اس کے بعد 1998 میں ماہر اقتصادیات کے طور پر امرتیہ سین کو نوبل انعام ملا تھا۔ ان کی پیدائش شانتی نکیتن میں ہوئی تھی۔ انھوں نے ڈھاکہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد مختلف مقامات پر ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ برطانیہ اور امریکہ میں ہی انھوں نے زندگی کا زیادہ تر وقت گزارا تھا۔ فی الحال وہ کولکاتہ میں رہتے ہیں۔ اب معاشیات کے میدان میں ہی ابھجیت بنرجی کو یہ اعزاز ملا ہے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی ایستھر ڈفلو کو بھی یہ اعزاز ملا ہے۔ 2013 میں دونوں میاں بیوی نے مل کر مشترکہ طور پر 'عبداللطیف جمیل پاورٹی ایکشن لیب' کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا مقصد غربت دور کرنے کے لیے تحقیق کرنا تھا اور ان کے اصولوں کی وجہ سے دنیا بھر کے درجن بھر سے زائد ممالک میں غربت دور ہوئی ہے۔ اگر آسکر ایوارڈ کی بات کی جائے تو ستیہ جیت رے کو یہ اعزاز 1992 میں پہلے ہندوستانی کے طور پر ملا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی 16 اکتوبر 2019

اعزاز و اکرام:

پروفیسر زاہد اشرف

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ، شعبہ بایوٹیکنالوجی کے پروفیسر محمد زاہد اشرف کو انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ (آئی سی ایم آر) کی جانب سے بسنتی دیوی امیر چند نامی

اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ یہ اعزاز مرکزی وزیر صحت ڈاکٹر ہرش وردھن نے پروفیسر اشرف کی تحقیقی کارفرمائی کے اعتراف میں انھیں دیا۔ بسنتی دیوی امیر چند اعزاز 1953 میں آئی سی ایم آر کے ابتدائی ادارہ ایوارڈ میں سے ایک ہے جو بائیومیڈیکل سائنسز کے شعبے میں اہم تحقیقی کاموں کے لیے دیا جاتا ہے۔ پروفیسر اشرف کی لیب اونچائی والے علاقوں میں خون کے منجمد ہوجانے سمیت قلبی عوارض کی نشو ونما اور کم آکسیجن کی وجہ سے ہونے والی بیماریوں کو سمجھنے میں معاون رہی ہے۔ کم آکسیجن کے جواب میں سیلولر ردعمل کی تحقیق کی اہمیت کا تجزیہ اس حقیقت سے کیا جاسکتا ہے کہ اس سال نوبل انعام کمیٹی برائے جسمانیات نے اس بات کی دریافت کی اور صلاحیت کو پہچان لیا کہ کس طرح خلیوں کو احساس ہوتا ہے اور اسے آکسیجن کی دستیابی کے مطابق ڈھال لیا جاتا ہے۔ مشترکہ طور پر ان کی تاریخی دریافتوں کی وجہ سے تینوں سائنسدانوں کو اعزاز کا اہل سمجھا گیا۔ آکسی ڈیشن کے عمل کے لیے آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے جو توانائی پیدا کرتی ہے۔ اس کی کم فراہمی کے نتیجے میں پھیپھڑوں کو نقصان اور دماغی اختلال کے علاوہ دل کے عوارض کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ پروفیسر اشرف کی تحقیق نے خون جمنے والے عوارض کے پیچھے آکسیجن سے منسلک میکانزم کے کردار پر کام کیا ہے اور اونچائی پر آکسیجن کی کم دستیابی کی وجہ سے اس کے اثرات سے بحث کی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستگی سے قبل، وہ ڈیفنس انسٹی ٹیوٹ آف فزیالوجی اینڈ الائیڈ سائنسز (ڈی آئی پی اے ایس)، دفاعی تحقیق اور ترقیاتی تنظیم (ڈی آر ڈی او)، دہلی میں جینومکس ڈویژن کے سربراہ تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 اکتوبر 2019

مولانا ڈاکٹر عبدالمالک مغیثی

سہارنپور: صوبائی سطح پر منظم، مستحکم، متحرک و فعال صحافیوں کی تنظیم 'گرامین پترکار ایسوسی ایشن' اترپردیش رجسٹرڈ کے 32 ویں صوبائی سمینار میں اتوار کو تقریباً 60 اضلاع کے اراکین و ضلعی عہدے داران تنظیم کی موجودگی میں صوبائی عہدے داران نے آل انڈیا ملی کونسل کے ضلع صدر اور جامعہ رحمت گھگرولی سہارنپور کے مہتمم مولانا ڈاکٹر عبدالمالک مغیثی کو ان کی سماجی، تعلیمی، ثقافتی و برادران وطن کے لیے پیام انسانیت کے پیغام کو عام کرنے کی خدمات کے اعتراف میں اعزاز سے نوازا۔ دریں اثنا مولانا نے ملک کے موجودہ حالات میں صحافت کے معیار اور صحافیوں کا کردار واحساسِ ذمے داری پر سیر حاصل گفتگو کی۔ تقریب کو صوبائی صدر سوربھ کمار، پدم شری بھارت بھوشن شہر سہارنپور، راجیہ سبھائی وی صحافی اروند کمار سنگھ بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 اکتوبر 2019

ڈاکٹر شمیم دیوبندی

دیوبند: بزم ادب دیوبند کے زیراہتمام بعنوان 'محفل ادب' کا انعقاد محلہ شاہ رمزالدین میں واقع ڈاکٹر صادق دیوبندی کی رہائش گاہ پر کیا گیا جس کا افتتاح ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر بزم کی جانب سے شان ادب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر سماجی کارکن ڈاکٹر ایس اے عزیز نے کہا کہ اس طرح کی محفلیں ہونی چاہئیں۔ اس سے ادب کے تئیں عوام میں ایک اچھا پیغام جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں نسل نو کو بھی اس میں شریک کرنا چاہیے تاکہ وہ ادب کے سلسلے میں معلومات حاصل کرسکیں۔ ڈاکٹر ایس اے عزیز نے ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو ادبی خدمات کے پیش نظر اعزاز سے نوازے جانے پر بزم کے عہدیداران کو مبارکباد پیش کی۔ سماجی کارکن انجم عثمانی نے کہا کہ محفل ادب کے پروگرام کا انعقاد کرنا ایک اچھا قدم ہے، اس سے نسل نو میں ادب کے تئیں رجحان پیدا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے اپنی ادبی خدمات سے شہر کا ہی نہیں بلکہ علاقہ کا نام بھی روشن کیا ہے۔ شمیم کرتپوری نے کہا کہ ڈاکٹر شمیم دیوبندی کا نام ادبی میدان میں نیا نہیں ہے، ان کی تحریریں قومی سطح پر بھی مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 اکتوبر 2019

ذکی انجم صدیقی

دیوبند: شہر کے شاعر ذکی انجم صدیقی کو ان کی ادبی خدمات پر ادبی تنظیم بزم ادب کی جانب سے 'نشانِ ادب' ایوارڈ

سے نوازا گیا ان کو شہر کی نامور ادبی و سماجی شخصیات کی جانب سے مبارکباد پیش کی گئی۔ اس سلسلہ میں ادیب و مصنف مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے ذکی انجم کو نشان ادب ایوارڈ ملنے پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ذکی انجم کی تخلیقات متاثر کرنے والی ہیں، وہ جدید لب و لہجہ میں بات کہنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ عبداللہ راہی نے کہا کہ ذکی انجم صدیقی نے شاعری کو جدیدیت سے بھرپور نیا اور توانا لہجہ دیا ہے، ان کو ہمیشہ ادبی حوالوں میں یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ذکی انجم کی شاعری اپنی فکر اور اسلوب کے حوالے سے آفاقی شاعری ہے، انھوں نے نئے اسلوب میں جو شعر کہے ہیں وہ بھرپور تازگی اور توانائی کا احساس دلاتے ہیں، ان کی فکر نے جن نئی ادبی سمتوں کو روشن کیا ہے۔ اس کے لیے وہ قابل صد مبارکباد ہیں۔ شاعر ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے کہا کہ ذکی انجم نے بہت کم وقت میں شاعری کی بلندیوں کو چھوا ہے، ان کے اشعار میں انگریزی کے الفاظ کا فنکارانہ استعمال دیکھا جاسکتا ہے، ان کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور شاعری بھی کمال کی ہے۔ ان کی شاعری آج کے انسان کی ذہنی و فکری شکست و ریخت کی شاعری ہے، ان کا تازہ لہجہ سناٹے کو چیرتے ہوئے آواز کی طرح ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ایس اے عزیز نے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ذکی انجم ایک طویل زمانے سے اردو شاعری کی زلفیں سنوارنے میں مصروف ہیں۔ وہ پروفیسر عنوان چشتی کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں اور عنوان صاحب نے اپنی کتابوں میں ذکی انجم کا تذکرہ بہت اچھے انداز میں کیا ہے اور ان کا کلام یقیناً اردو ادب کی آبرو کہے جانے کا مستحق ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 اکتوبر 2019

جنید عبدالقیوم

سولاپور: اکھل بھارتیہ اردو شکشک سنگھ اور جن سیوا شکشک سنگٹھنا سولاپور کے اشتراک سے نرمل کمار فڑکولے آڈیٹوریم سولاپور میں منعقدہ پروقار تقریب میں تعلیمی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے اساتذہ کو جن سیوا مثالی مدرس ایوارڈ 2019 سے نوازا گیا جس میں سولاپور کے سوشل اردو ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج آف سائنس کے ہونہار معلم اور سائنسی قلمکار جنید عبدالقیوم شیخ کو جن سیوا مثالی مدرس ایوارڈ سے نوازا گیا۔ شیوسینا کے ضلعی صدر اور منپا کے اپوزیشن لیڈر مہیش کوٹھے کے ہاتھوں جنید عبدالقیوم شیخ کو ٹرافی، سند اور شال پیش کی گئی۔ جلسے کی صدارت عبدالقادر (ایڈمنسٹریشن آفیسر، منپا بورڈ آف ایجوکیشن سولاپور) نے کی۔ موٹیویشنل اسپیکر سید

سعید احمد پونے مہمان خصوصی تھے۔ اشفاق ساتکھیڑ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جنید شیخ کے ساتھ ظہیر الدین سید، عرفان شیخ، عزیز النساء وڈو، امجد انعامدار، انجلی شرے، اڑمیالمے، سمینہ منیار، بشیر کڑپا اور موہن راؤ گھوڈکے کو بھی مثالی معلم ایوارڈ دیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 اکتوبر 2019

ادب وسماج اور طب کے میدان میں ایوارڈ

سکندرآباد: سرسید فاؤنڈیشن نے سرسید احمد خاں کے 102 ویں یوم پیدائش پر ادب، سماج اور طب کے میدان میں نمایاں خدمات انجانے والی شخصیات کو قومی سطح کے اعزاز سے سرفراز کیا۔ فاؤنڈیشن کے تحت راج محل میں ہونے والی سرسید ڈے تقریب میں یہ ایوارڈ پیش کیے

گئے۔ علی گڑھ تحریک کے افکار و خیالات کو فروغ دینے والے پروگرام کے مہمان خصوصی اجمل خاں طبیہ کالج کے پروفیسر بدرالدجی خان کو سرسید نیشنل ایکسی لنس ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ طب یونانی کے شعبے میں دواسازی اور غریبوں کو سستا علاج مہیا کرانے کے لیے ڈاکٹر قمرالزماں کو حکیم اجمل خاں نیشنل ایوارڈ دیا گیا۔ اردو میں تقابلی مطالعہ کو فروغ دینے کے لیے شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے استاد پروفیسر محمد علی جوہر کو نیشنل ایوارڈ فار کمپریٹیو اسٹڈی، اردو صحافت میں اپنی خدمات کے لیے روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو اور عالمی سہارا چینل کے گروپ ایڈیٹر اور سربراہ ڈاکٹر جسیم محمد کو سرسید نیشنل ایوارڈ فار جرنلزم سے سرفراز کیا گیا۔ اردو فکشن کے لیے ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی کو سعادت حسن منٹو نیشنل فکشن ایوارڈ سے نوازا گیا جبکہ محمد حنیف خان کو سریندر پرکاش ینگسٹ نیشنل فکشن ایوارڈ دیا گیا، دولت رام شرما تان سین ایوارڈ سے سرفراز کیے گئے۔ پروگرام کے روح رواں اور سرسید فاؤنڈیشن کے صدر ڈاکٹر محمد فاروق نے نظامت کرتے ہوئے جہاں سرسید احمد خاں کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی، وہیں انھوں نے مہمانوں کا تعارف بھی کرایا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 نومبر 2019

جامعہ ہمدرد میں جلسہ تہنیت

نئی دھلی: کمزور طبقات کو روزگار فراہم کرنے والی فلاح ہینڈی کرافٹ سوسائٹی کے زیر اہتمام جامعہ ہمدرد کے کنونشن سنٹر میں ایک عظیم الشان جلسۂ تہنیت کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پدم شری ڈاکٹر سید احتشام حسنین نے کی۔ انھوں نے جامعہ ہمدرد کی کارکردگی خاص طور سے شعبہ طب یونانی کو اہمیت دیتے ہوئے ملک میں شمار کی جانے والی بہترین یونیورسٹی میں شامل ہونے کو قابل رشک قرار دیا۔ اس موقعے پر 15 سال سے کم عمر کے زمرے میں شامل جنوبی دہلی، سنگم وہار کے ہونہار طالب علم ورلڈ چمپئن کھلاڑی محمد عارف کو سوئٹزرلینڈ میں گولڈ میڈل حاصل کرنے پر تہنیت پیش کی گئی اور مہمان خصوصی دہلی کے ڈپٹی چیف منسٹر منیش سسودیا نے محمد عارف کو سرٹیفکیٹ، شال اور مومنٹو دے کر حوصلہ افزائی کی۔ اس موقعے پر دہلی کی کچھ چنندہ شخصیات کو بھی ان کی قوم و ملت کے لیے خدمات کے اعتراف میں سرٹیفکٹ آف ایکسی لنس سے منیش سسودیا اور ڈاکٹر سید احتشام حسنین کے ہاتھوں سرفراز کیا گیا، جس میں طب یونانی کے معروف طبیب حکیم سید احمد خان اور کینسر کے مشہور نوجوان معالج ڈاکٹر ماجد احمد تلی کوٹی کے علاوہ محمد ریاض بیگ (ٹاپر GPAT، 2018)، محمد سہیل خان (2017, NASA)، بسمہ (ٹاپر CBSE 10th 97.3%)، سمیہ ندیم (ونر برونز میڈل ان سوئمنگ)، طیبہ (بیسٹ ٹیچر اینڈ سوشل ایکٹیوسٹ)، ڈاکٹر خورشید احمد انصاری (اسسٹنٹ پروفیسر، جامعہ ہمدرد)، بسمہ پرویز (ٹاپر CBSE 10th 95%)، ترنم (بیسٹ ٹیچر اینڈ سوشل ایکٹیوسٹ) شامل ہیں۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 جنوری 2019

رسم اجرا:

پروفیسر رکھی باسو کی دو کتابوں کا اجرا

نئی دھلی: نائب صدر جمہوریہ ہند، شری وینکیا نائیڈو نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پروفیسر رکھی باسو کی دو کتابوں کا دہلی میں پبلک ایڈمنسٹریشن انڈین انسٹی ٹیوٹ کے سالانہ کانفرنس میں اجرا کیا۔ جن کتابوں کا اجرا عمل میں آیا ان میں سے ایک 'پبلک ایڈمنسٹریشن ان ٹوئنٹی فرسٹ سنچری: اے گلوبل ساؤتھ پرسپیکٹو' (روٹلیج انڈیا) اور دوسری 'انڈین ایڈمنسٹریشن اسٹرکچر

پرفارمنس اینڈ ریفارم' (ایڈروئٹ پبلشرز) تھی۔ رکھی باسو پبلک ایڈمنسٹریشن کی پروفیسر اور شعبہ پولیٹکل سائنس، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سابق صدر ہیں۔ وہ سروجنی نائیڈو سنٹر برائے خواتین کے مطالعہ کی ڈائرکٹر بھی رہی ہیں۔ انھوں نے ہندوستان میں پبلک پالیسی اینڈ گورننس، بین الاقوامی تنظیم اور سیاسی ترقی جیسے امور پر 12 کتابیں اور 40 مضامین تحریر کیے ہیں۔ پروفیسر باسو نے معیشت و سیاست کے علاوہ منتظمہ و مقننہ جیسے موضوعات پر بھی کام کیا ہے۔ ان کی تازہ ترین دو کتابیں انٹرنیشنل پالی ٹکس: کانسپٹ اینڈ تھیوریز (2015) اور گورننس ان ساؤتھ ایشیا (2017) کو سیج اینڈ روٹلج، انڈیا نے شائع کی ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 25 اکتوبر 2019

چاند کے اس پار

نئی دھلی: ترجمہ نہ صرف مختلف اقوام کے رابطے کا ذریعہ ہے بلکہ اس سے دیگر ملکوں کی ثقافت اور تہذیب کا بھی علم ہوتا ہے۔ مصر اور ہندوستان کے تعلقات بہت قدیم ہیں، لیکن حالیہ دنوں میں دونوں ملکوں کے درمیان ترجمہ کی وجہ سے ادبی، ثقافتی اور لسانی تعلقات میں انقلاب آیا ہے۔ مصری ناول نگار اور نوبل انعام یافتہ نجیب محفوظ، طہٰ حسین عباس محمود عقاد اور توفیق الحکیم جیسے عظیم ادبا کے کارناموں کا ترجمہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ مصری کہانیوں کا مجموعہ 'ماوراء القمر' کا اردو ترجمہ 'چاند کے اس پار' بھی اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے جسے جے این یو میں مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات کے استاد ڈاکٹر محمد قطب الدین نے کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ہندوستان میں مصر کی سفیر ڈاکٹر ہبہ المراسی نے جے این یو کے کنونشن سینٹر میں منعقد مصری کہانیوں کے مجموعہ 'ماوراء القمر' کے اردو ترجمہ 'چاند کے اس پار' کے افتتاحی پروگرام میں کیا۔ اس پروگرام کی صدارت

اسکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچرل اسٹڈیز کے ڈین پروفیسر سید عین الحسن نے کی، جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر ہندوستان میں مصر کی سفیر عزت مآب ڈاکٹر ہبہ المراسی اور مہمان اعزازی کے طور پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد نے شرکت کی۔ مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات کے صدر پروفیسر رضوان الرحمٰن نے تمام حاضرین کا خیر مقدم کیا اور مہمانان کرام کا تعارف پیش کیا۔ اپنے صدارتی کلمات میں پروفیسر سید عین الحسن نے کہا کہ مصری کہانیوں کا یہ مجموعہ بنام 'چاند کے اس پار' صرف محبت اور عشق کی داستان پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر دہشت گردی، نسل پرستی، انسانیت، بھائی چارہ جیسے اہم موضوعات بھی شامل ہیں۔ مہمان خصوصی قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد نے کتاب کے ترجمہ پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح دوسری زبانوں کے ادب، ثقافت اور تاریخ کو ہم ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرتے ہیں، اسی طرح ضرورت ہے کہ ہم ہندوستان کی بھی قدیم تہذیب و ثقافت اور ادب کو دوسری زبانوں بالخصوص عربی زبان میں منتقل کریں۔ کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ترجمہ نگار ڈاکٹر محمد قطب الدین نے کہا کہ 'چاند کے اس پار' کے اندر نو کہانیاں ہیں، جو کہ موجودہ دور میں مصر اور عالم عرب کے اندر رونما ہونے والے حقیقی واقعات پر مبنی ہیں اور یہ ایک قسم کے تاریخی دستاویز بھی ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 اکتوبر 2019

جامع البحرین

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ اور ممتاز اسلامی اسکالر پروفیسر عبیداللہ فہد کی حیات اور علمی خدمات پر مشتمل خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی لکھنؤ کے صدر شعبۂ عربی پروفیسر مسعود عالم فلاحی کی مرتب کردہ کتاب 'جامع البحرین' کا اجرا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے کیا۔ پروفیسر فہد کو حال ہی میں اسلام اور علم سیاسیات کے موضوع پر اعلیٰ درجہ کی تحقیقات پیش کرنے کے اعتراف میں نئی دہلی کے موقر ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز نے تیرہویں شاہ ولی اللہ ایوارڈ سے سرفراز کیا ہے۔ اس موقع پر اہل علم اور ارباب ادب نے پروفیسر فہد کی علمی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر تجزیاتی مقالے لکھے جو مذکورہ کتاب میں شامل ہیں۔ 'جامع البحرین' کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ دو سمندروں کا سنگم ہے یعنی دینی اور دنیاوی علوم کو مصنف نے اپنی ذات میں جمع کر لیا ہے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ شعبہ کے دیگر اساتذہ بھی پروفیسر فہد کی طرح اپنا علمی و تحقیقی سفر جاری رکھیں گے۔ ممتاز سیرت

ہفت روزہ 'دعوت'، دعوت نیوز پورٹل اور دعوت موبائل ایپ کا افتتاح

نگار پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے ڈاکٹر فہد کو مدبر و مفکر، محقق اور مصنف قرار دیتے ہوئے نظم قرآن پر ان کی تحقیقات کو قرآن کی ادبی جہات اور فکری و معنوی پہلوؤں سے ایک قابل قدر سرمایہ قرار دیا۔ پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی نے ڈاکٹر فہد کو مجمع البحرین قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کی مشرق و مغرب کے مذہبی اور معاصر سیاسی حالات پر وسیع نظر ہے، وہ ایک کثیر المطالعہ اور کثیر التصانیف محقق ہیں۔ مدیر پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے کہا کہ ہند و پاک کے معاصر ماہرین قرآنیات و اسلامیات کی مختصر ترین فہرست بھی بنائی جائے تو اس میں پروفیسر عبید اللہ فہد فلاحی کا ممتاز نام ضرور ہوگا۔ آپ کی تصانیف اہل علم و دانش کے درمیان معروف اور موضوع بحث ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی نے 'جامع البحرین' کتاب کی ترتیب و تنظیم پر مرتب کو مبارکباد دیتے ہوئے اس کتاب کی ایک خوبی یہ بتائی کہ اس میں ڈاکٹر فہد کی کتابوں پر اردو اور انگریزی میں چھپنے والے تنقیدی اور تجزیاتی تبصرے بھی شامل ہیں، جنھیں ڈاکٹر محمد مصعب گوہر نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 اکتوبر 2019

ہفت روزہ دعوت

نئی دھلی: ہفت روزہ دعوت کی افتتاحی تقریب میں امیر جماعت اسلامی ہند انجینئر سعادت اللہ حسینی نے کہا کہ دعوت کے طویل سفر میں جن اعلیٰ قدروں اور صحافت کے جن اعلیٰ معیاروں کو برقرار رکھا گیا ہے، ان کی پاسبانی ہوگی اور نئے تقاضوں، جن کے پیش نظر نئے ہفت روزہ کی لانچنگ کی گئی ہے، اس کی تکمیل ہوگی۔ مرکز جماعت اسلامی ہند میں منعقد ہفت روزہ دعوت کے افتتاحی پروگرام میں خطاب کرتے ہوئے امیر جماعت نے کہا کہ صحافت اندھیرے میں چلنے والے مسافروں کے ہاتھ میں مشعل کے مانند ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ راستے کے اتار چڑھاؤ اور دشمن و موذی جانوروں کے پینتروں سے واقف اور روشناس ہوتا ہے۔ عہد حاضر میں اس مشعل اور ٹارچ کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس وقت پوری دنیا میں صحافت کو مختلف چیلنجز درپیش ہیں Post-truth اور Post-human rights کا ولولہ پوری دنیا میں مچا ہوا ہے۔ ایسے حالات میں سچائی پوری طرح سے دب رہی ہے۔ خبروں اور انفارمیشن کا ہجوم ہے۔ اس بات کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ سچائی اور حق کی آواز کو مضبوطی دی جائے اور اسے بلند کیا جائے۔ اس پروگرام کے مہمان خصوصی ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں نے کہا کہ اخباروں کے مضامین اور خبروں کی پیشکش کے معیار کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کتنے گر چکے ہیں۔ جو خبریں شائع ہو رہی ہیں وہ نہیں ہونی چاہئیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 اکتوبر 2019

سید شاہد علی کے ترجمہ شدہ قرآن شریف کا اجرا

انبالہ: ہریانہ وقف بورڈ کے سابق سی او اور ماہر اقتصادیات سید شاہد علی نے قرآن کریم کا اردو اور ہندی میں ترجمہ کر کے علمی دنیا کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ اس ترجمہ شدہ قرآن شریف کا علما کی جماعت کی موجودگی میں جامعہ دارالسلام انبالہ میں اجرا کیا گیا اور لوگوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دی گئی۔ قابل ذکر ہے کہ سید شاہد علی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی کام اور آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے اکنامکس ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ سے فارسی اور اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ موصوف نے قرآن کریم کا اردو اور ہندی ترجمہ نہایت ہی آسان زبان میں کیا ہے۔ اس کی تصحیح مفتی اعظم پنجاب مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی اور جامعہ دارالسلام انبالہ کے مہتمم مولانا جاوید ندوی نے کی ہے۔ اس موقعے پر سید شاہد علی نے کہا کہ ان کے پیش نظر صرف یہ بات ہے کہ مقدس قرآن کے پیغام کو جوں کا توں عوام تک پہنچا دیا جائے۔ اس میں کوئی اضافی بات نہ ہو۔ اسی لیے انھوں نے خود کو ترجمہ تک محدود رکھا ہے اور تفسیر نہیں کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کے پیغام کو بالکل سادہ زبان میں عام کیا جائے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 اکتوبر 2019

لفظوں کی گلکاری

رام پور: رامپور میں داغ اسکول کے آخری نمائندہ استاد شاعر مرحوم ڈاکٹر شوق اثری کے شاگرد رشید نعیم نجمی کے مجموعہ کلام 'لفظوں کی گلکاری' کا اجرا انجمن تعمیر ادب کے زیر اہتمام گلوبل سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے چیئرمین محمد زبیر شمسی کے ہاتھوں عمل میں آئی جبکہ اس تقریب سعید میں ڈاکٹر شریف احمد قریشی، اظہر عنایتی، س ش عالم، مولانا اسلم جاوید، سید شکیل غوث، فرید شمسی، غفران فریدی بھی موجود رہے۔ 1957 میں شاعری کا آغاز کرنے والے نعیم نجمی ایک زندہ دل انسان اور خوش فکر شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اب وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک میں بھی اپنے مخصوص لب و لہجہ کی شاعری سے رام پور کی نمائندگی کر کے نام روشن کر رہے ہیں۔ نعیم نجمی کے کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی تمام ادبی تحریکوں اور رجحانات سے واقف ہیں اور ان سے متاثر بھی ہوئے ہیں۔ انھیں کلاسیکی غزل کی شعریات کے ساتھ عہد جدید کے تقاضوں کی بھی کما حقہ واقفیت ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام 'لفظوں کی گلوکاری' ہے جبکہ دیگر مجموعات زیر اشاعت ہیں۔ نہایت دیدہ زیب اور 160 صفحات پر مشتمل مجموعہ کلام لفظوں کی گلوکاری میں پیش لفظ من آنم کہ من دانم نعیم نجمی کی تحریر ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی کی کامیابی و کامرانی کا سہرا اپنی والدہ مرحومہ کے سر باندھا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 31 اکتوبر 2019

افکار جالب

هاپوڑ: فروغ اردو زبان ٹرسٹ کے زیر اہتمام بابائے اردو مولوی عبدالحق کی سرزمین ہاپوڑ میں کل ہند مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر بزرگ استاد شاعر سید الیاس جالب کا شعری مجموعہ 'افکار جالب' کی رسم اجرا بدست حاجی یاسین قریشی توڑی والے عمل میں آئی۔ مشاعرے میں ملک کے مشہور و معروف شعراء کرام نے شرکت کی اور اس کی صدارت حاجی نور قریشی نے کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض فاخر ادیب نے انجام دیے۔ اس پروگرام میں بطور مہمان خصوصی یاسین قریشی توڑی والوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 اکتوبر 2019

کربلا اور شہیدان کربلا

دیوبند: سرکاری ڈگری کالج میں طلبہ وطالبات نیز آل انڈیا بزم عنوان چشتی کے اشتراک سے ایک جلسہ کا انعقاد ڈاکٹر الف ناظم کے اعزاز میں بطور الوداعیہ تقریب کیا گیا۔ اس موقعے پر مہاشے جیمنی سرشار کی نظموں پر مشتمل کتاب کربلا اور شہیدان کربلا کی رسم رونمائی بھی عمل میں لائی گئی۔ پروفیسر تنویر چشتی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر الف ناظم نے جیمنی سرشار کی پانچ اعلیٰ نظموں کو ترتیب دے کر قارئین کو روشناس کرایا اور بتایا کہ کس طرح ہندو شعرا حضرات نے اردو زبان کے ذریعے مذہبی شخصیات کی توصیف وتعریف کرکے ملک کی یکجہتی کی فضا کو فروغ دیا ہے اور گنگا جمنی تہذیب کی عاشق مہاشے جیمنی سرشار کی مساعی جمیلہ سے روشناس کرایا اور ثابت کیا کہ اردو میں دلوں کو جوڑنے کی طاقت ہے۔ صدارتی تقریر فرماتے ہوئے ڈاکٹر شمیم ارشاد اعظمی نے کہا کہ ڈاکٹر الف ناظم اردو کے معتبر ادیبوں میں شامل ہیں جنھوں نے بطور خاص مصحفی اور سرور جہان آبادی کی تدوین وتجزیوں کے ذریعے بڑا وقیع کام کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر الف ناظم کی سات مطبوعہ کتابیں ہیں اور مزید آٹھ کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہونے کی منتظر ہیں۔ آل انڈیا بزم عنوان چشتی کے صدر ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے کہا کہ الف ناظم اردو کے مخلص کارکن ہیں۔ انھوں نے اس موقعے پر اپنی بزم کی طرف سے موصوف کو ٹرافی اور اعزاز سے سرفراز فرمایا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 اکتوبر 2019

حقوق العباد قرآن وحدیث کی روشنی میں

رامپور: مدرسہ فیض العلوم تھانہ ٹین کے وسیع صحن میں ایک پروقار تقریب کے دوران مولانا شمس الدین کی مولفہ کتاب 'حقوق العباد قرآن وحدیث کی روشنی میں' کا اجرا عمل میں آیا۔ تقریب رسم اجرا کی صدارت سید اسلم میاں

قطبی نے فرمائی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے مولانا سید مفتی محمد عفان منصور پوری استاد حدیث وصدر مفتی مدرسہ جامعہ مسجد امروہہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 اکتوبر 2019

جامعہ اور گاندھی

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کتاب 'جامعہ اور گاندھی' کا سرورق جاری کیا گیا۔ یہ اجرا جامعہ کے 'مشیر فاطمہ نرسری اسکول' کی نرسری کلاس کی طالبہ نیہہ جہانگیر اور طالب علم خرم ثاقب کے ہاتھوں ہوا۔ یہ دونوں بچے کشمیر

سے ہیں۔ جب اس کتاب کے مصنف افروز عالم ساحل سے بچوں کے ہاتھوں اپنی کتاب کے سرورق کے اجرا کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ آئیڈیا 1926 سے 1948 تک جامعہ کے وائس چانسلر اور 1963 میں پھر سے جامعہ کے چانسلر بننے والے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (8 فروری 1897 - 3 مئی 1969) سے لیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ 1 مارچ 1935 کو جامعہ کے سب سے کم عمر طالب علم عبدالعزیز کے ہاتھوں اوکھلا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پہلی عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ ذاکر حسین صاحب کا یہ آئیڈیا گاندھی جی کو خوب پسند آیا۔ اس سلسلے میں گاندھی جی نے پریس کو اپنا بیان بھی جاری کیا اور کہا کہ یہ بہت اچھا خیال ہے کہ جامعہ کی بنیاد ان کے سب سے چھوٹے بچے کے ذریعے رکھی جائے۔ اس دلچسپ واصل سوچ پر میری مبارکباد۔ میں جانتا ہوں کہ جامعہ کا مستقبل روشن ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کا بیج ایک شاندار درخت کی شکل میں اُگے گا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 26 اکتوبر 2019

'اردو زبان پر علاقائی اثرات'

مدراس: انجمن ابنائے قدیم برائے اردو، شعبہ عربی، فارسی و اردو مدراس یونیورسٹی کا دوسرا سالانہ اجلاس

دو اکتوبر 2019 کو مدراس یونی ورسٹی کے پلاٹنم جوبلی آڈیٹوریم میں منعقد ہوا، جس میں بڑی تعداد میں شعبہ کے فارغین، اردو کے اساتذۂ کرام اور دیگر سامعین نے شرکت کی۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر مظفر علی شہ میری نے کی۔ نظامت کے فرائض انجمن کے معتمد عمومی ڈاکٹر امان اللہ اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو مدراس یونیورسٹی نے انجام دیے۔ شعبہ عربی، فارسی و اردو، مدراس یونی ورسٹی میں کچھ ماہ پیشتر ایک اہم لسانی موضوع 'اردو زبان پر علاقائی اثرات' پر ایک قومی سمینار منعقد ہوا تھا۔ اس میں کئی ماہرین ادب نے گراں قدر مقالے پیش کیے تھے۔ ان تمام مقالوں پر مقدمہ لکھوا کر ایک خوبصورت کتاب ترتیب دی گئی جس کا اس اجلاس میں پروفیسر مظفر علی شہ میری، وائس چانسلر، ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ پروفیسر نسیم الدین فریس نے پہلی کاپی حاصل کی۔

پروفیسر امان اللہ ایم بی، شعبہ عربک، پرشین اینڈ اردو، مدراس یونیورسٹی، چنئی، 10 اکتوبر 2019

چاند سے باتیں

گلبرگہ: ''خالد سعید نے اردو میں جدیدیت کی تحریک کے عنفوان شباب کے وقت آنکھ کھولی تھی۔ لہٰذا ان کی شاعری دوسرے کئی جدید شعرا کے مقابلے میں اس عہد کی عکاسی زیادہ بہتر طور پر کرتی معلوم ہوتی ہے۔'' اس خیال کا اظہار 28 ستمبر 2019 کو گلبرگہ میں منعقدہ جلسہ اجرا میں پروفیسر خالد سعید کی کلیات 'چاند سے باتیں' کی رونمائی کرتے ہوئے جدید اردو نظم کے نمائندہ اور نامور شاعر جناب خلیل مامون نے کہا۔ انھوں نے کلیات کی اشاعت پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خالد سعید کی شاعری میں چاند ایک جامد شے کی علامت نہیں ہے بلکہ انھوں نے شعری تقاضوں کے بموجب چاند کو مختلف طرح سے باندھا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاعر کے لیے چاند ان کی ذات کا حصہ ہے۔ مالیگاؤں سے تشریف لائے مہمان خصوصی اردو کے ممتاز شاعر اور نقاد جناب سلیم شہزاد نے خالد سعید کی نظموں کی ہیئت پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے ان کی نظموں کے فنی محاسن پر روشنی ڈالی۔ اردو تنقید کی نئی نسل کے معتبر نقاد ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی نے اپنے مضمون میں خالد سعید کی غزل گوئی پر مفصل اظہار خیال کیا۔ نئی نسل کی ایک اور مقبول نقاد ومحقق ڈاکٹر بی بی رضا خاتون نے اپنے مقالے میں کہا کہ خالد سعید کی شاعری

فکر وفن کے لحاظ سے ایک منفرد لب ولہجہ کا پتہ دیتی ہے۔

جدید اردو افسانے کے ایک اہم ستون پروفیسر حمید سہروردی نے بطور مہمانِ خصوصی کہا کہ خالد سعید کی شاعری میں پیکر سازی کا عمل زیادہ محسوس ہوتا ہے اور یہ بصری وسمعی دونوں سطح پر متاثر کن ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ خالد سعید ڈکشن کی سطح پر اپنے ہم عصروں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک اور مہمان خصوصی ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین (سابق صدر شعبۂ اردو وجے نگر کالج، ہاسپیٹ) نے خالد سعید کی انجمن آرائی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شخصی خوبیوں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ جناب انجینئر اکرم نقاش نے اپنے خاکے میں خالد سعید کی شخصیت اور شاعری کا محاکمہ کیا۔ خالد سعید کے شاگرد اور ضلع بیدر کے ہائی اسکول میں معاون معلم جناب عبدالمجید نے ان کی تدریسی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کے دیگر کمالات کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا۔ جلسے کے صدر بزرگ ادیب ونقاد ڈاکٹر وہاب عندلیب نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ خالد سعید کا شمار ہمارے ان شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے مسلسل فنی ریاضت کے ذریعے اپنا مقام بنایا ہے۔ ان کا شعری سفر طویل ہے۔ ان کا ایک ایک تخلیقی لمحہ ان کے اپنے ذاتی تجربات میں زندہ ہے۔ جلسے کی ابتدا جناب کاشف الرحمٰن کی قرأت اور اس کے بعد جناب تخی سرمست کی نعت پاک سے ہوئی۔ جناب میر شاہ نواز شاہین نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں خالد سعید سے اپنے دیرینہ مراسم کا پراثر انداز میں تذکرہ کیا۔

جناب ملنسار اطہر احمد نے جلسے کی نظامت کی۔ جلسے کی ابتدا میں خالد سعید کے ماموں جناب حاجی پیراں لوہاری اور یار طرحدار جناب حامد اکمل مدیر روزنامہ 'ایقان' ایکسپریس نے ان کی گل پوشی اور شال پوشی کی۔ جلسے کے بعد شہر کے ادیبوں، شاعروں، دوستوں اور رشتہ داروں نے خالد سعید کی گل پوشی کی۔ تقریب کے کنوینر ڈاکٹر اسلم سعید اور دیگر احباب نے مہمانانِ خصوصی کی گلپوشی اور شالپوشی کی۔ اس تقریب میں عمائدین شہر نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ آخر میں ڈاکٹر افتخار الدین اختر نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 14 اکتوبر 2019

رشک ارم

یادگیر: 'بزمِ بتول' میسور کے زیر اہتمام کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے شائع کردہ پروفیسر شاہدہ شاہین کا ناول 'رشکِ ارم' کی رسم رونمائی محترمہ سیدہ نیلوفر نایاب صدر فاطمہ ویمن اینڈ چلڈرن ویلفیئر ایسوسی ایشن میسور کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ درس گاہ بتول، بتادیوی روڈ، ین آر محلّہ، میسور میں منعقدہ تقریب میں مہمانِ خصوصی مشتاق سعید سابق رکن کرناٹک اردو اکادمی، سلمیٰ صدیقہ ایم ڈی، ٹیپو سلطان ٹرسٹ میسور اور مومنہ مختار صدر فیضان اردو ادب تھے۔ مومنہ مختار صدر فیضان اردو ادب، میسور نے پروفیسر شاہدہ شاہین کا تعارف کرایا۔ 'رشکِ ارم' پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر جہاں آرا، موظف صدر شعبۂ اردو KSOU میسور نے بتایا کہ سماج کا نچلا اور پچھڑا طبقہ بہت صبر آزما حالات سے گزرتا ہے۔ صدارتی کلمات میں محترمہ سیدہ نیلوفر نایاب نے کہا کہ شاہدہ شاہین نے اپنے ناول میں غریب طبقہ کی مشکلات کا ذکر بہت ہی شستہ اردو میں کیا ہے۔

روزنامہ 'اعتماد' دہلی، 12 اکتوبر 2019

سہ ماہی رسالہ 'آج کے مباحث' کا اجرا

آج کے مباحث

نئی دهلی: حالیہ عرصہ میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے حالات اور واقعات نے مختلف افکار، نظریات اور مذاہب کے حامیوں اور پیروؤں کے درمیان سنجیدہ، مثبت اور تعمیری گفت وشنید کی ضرورت کو مزید نمایاں کردیا ہے۔ اس احساس کا اظہار کرتے ہوئے اردو کے سہ ماہی رسالہ 'آج کے مباحث' کے اجرا کی تقریب میں مقررین نے علمی اور فکری روایت کے نمائندہ رسالہ کی اشاعت کا پرجوش خیر مقدم کیا اور امید ظاہر کی کہ سماج کے باشعور طبقہ کے سنجیدہ تعاون سے یہ رسالہ مختلف موضوعات پر نتیجہ خیز تبادلۂ خیال کا وسیلہ بنے گا۔ رسالہ کے مدیر اعلیٰ معروف صحافی انجم نعیم اور مدیر معاون عبدالرب کریمی ہیں۔ جنوب مشرقی دہلی کے شاہین باغ علاقہ میں واقع اسلامک سنٹر میں منعقدہ اس تقریب کی صدارتی تقریر میں معروف اسلامی اسکالر ڈاکٹر محمد رفعت نے کہا کہ موجودہ حالات میں بالخصوص مسلمانوں کی فکر اور عمل دونوں کی بیک وقت ضرورت ہے۔ مہمانِ خصوصی اور سرکردہ ادیب مشرف عالم ذوقی، ناقد وادبی تجزیہ نگار حقانی القاسمی اور معروف صحافی سہیل انجم نے رسالہ سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 4 نومبر 2019

پران رکشک

بھوپال: سماجی، ادبی، ثقافتی تنظیم شیری اکادمی کے ذریعے منعقد پروگرام میں ریٹائرڈ ڈی جی پی ایم ڈبلیو انصاری نے گاندھی جی کے 'پران رکشک' بطخ میاں انصاری نامی کتاب کا اجرا بھی کیا۔ سید نصیر احمد کے ذریعے تحریر کردہ اس کتاب کو ہندی، اردو، انگریزی زبان میں شائع کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس کا تیلگو ایڈیشن بھی

تیار کیا جارہا ہے۔ انصاری نے اس کتاب کا اقتباس بتاتے ہوئے کہا کہ 1917 میں بطخ میاں انصاری نے چمپارن دورے کے دوران گاندھی جی کی جان بچائی تھی۔ اس دوران ایک تحریک کے لیے چمپارن پہنچے گاندھی جی سے انگریز خوفزدہ تھے جس کے سبب انھوں نے گاندھی جی کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے انھوں نے بطخ میاں کو مہرہ بناتے ہوئے انھیں لالچ دینے کی کوشش کی اور لالچ میں نہ آنے پر ان پر دباؤ بھی بنایا کہ وہ گاندھی جی کے دودھ میں زہر ملا کر انھیں پلادیں جس سے ان کی جان چلی جائے۔ عین وقت پر بطخ میاں انصاری نے گاندھی جی کو دودھ پینے سے روک دیا اور انھیں انگریزوں کی سازش کی جانکاری دے کر ان کی جان بچالی۔ ایم ڈبلیو انصاری نے کہا کہ اپنی جان کی بازی لگا کر گاندھی جی کی جان کی حفاظت کرنے والے بطخ میاں کا نام تاریخ کے صفحات سے مٹا دیا گیا ہے۔ ایسے میں یہ کتاب ملک کی صحیح تاریخ کو جاننے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ انھوں نے بتایا کہ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے گمنام مسلم مجاہدین پر مبنی ایک کتاب خون کی قسطیں بھی جلد ہی شائع کی جانے والی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مقبول واجد ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 نومبر 2019

جون ایلیا: حیات وشاعری

امروہہ: ہاشمی گرلس پی جی کالج امروہہ، شعبۂ اردو سے حصول تعلیم کے بعد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) سے معروف ومقبول شاعر جون ایلیا پر تحقیقی مطالعہ کرنے والی کم عمر مصنفہ ڈاکٹر نیہا اقبال نے اردو ادب میں ایک اور نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ نیہا اقبال کی تصنیف 'جان ایلیا: حیات وشاعری' اب پڑوسی ملک پاکستان میں بھی شائع ہوگئی ہے۔ قابل ذکر ہے کہ ہاشمی گرلس پی جی کالج امروہہ سے ایم اے اردو میں فراغت حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے جان ایلیا پر تحقیقی مطالعہ کرنے والی ڈاکٹر نیہا اقبال کی تصنیف 'جان ایلیا: حیات وشاعری' ہندوستان میں پہلے ہی شائع ہوچکی ہے۔ اخلاقی قدروں کی پاسداری کرتے ہوئے ہاشمی کالج کی ہونہار طالبہ ڈاکٹر نیہا اقبال گذشتہ شام پاکستان سے شائع اپنی تصنیف کے ساتھ صدر دفتر انجمن ترقی اردو اترپردیش ہاشمی ہاؤس پہنچیں اور اپنی تصنیف نائب صدر انجمن ترقی اردو اترپردیش اور چیئرمین ہاشمی ایجوکیشنل گروپ ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی کی خدمت میں پیش کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ہاشمی وانجمن کے دیگر اراکین کے ذریعے نیہا اقبال کا استقبال کیا گیا اور یادگاری نشان سے سرفراز کیا گیا۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہی لگایا جاسکتا ہے کہ صرف 6 ماہ کے درمیان ہی اس کتاب کو پڑوسی ملک پاکستان سے شائع کیا گیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 3 نومبر 2019

ڈاکٹر نیہا اقبال کی کتاب 'جون ایلیا: حیات وشاعری' کا اجرا

وفیات:

پروفیسر ریاض الرحمٰن

علی گڑھ: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نائب صدر مسلم یونیورسٹی کے معروف استاد دانشور وصحافی پروفیسر

ریاض الرحمٰن خاں شیروانی کا طویل علالت کے بعد ان کی رہائش گاہ پر حبیب منزل میں 4 نومبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ 95 سال کے تھے۔ پروفیسر شیروانی کا تعلق ایک معروف علمی خانوادے سے تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم ان کے والد الحاج عبیدالرحمٰن خاں شیروانی کے ذریعے حبیب گنج میں ہوئی۔ بعد میں 1942 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا، 1946 میں یہیں سے گریجویشن کیا اور 1970 میں مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کی اور 1973 میں مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں بحیثیت استاد تقرر ہوا اور 30 سال تدریسی خدمات انجام دیں، 1983 سے 1988 تک کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر صدر شعبہ رہے، سیاسی طور پر وہ مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت متاثر تھے۔ مولانا آزاد کی تصنیف 'انڈیا ونس فریڈم' ایک مطالعہ اور 'میر کارواں مولانا آزاد' دونوں تصانیف انتہائی اہمیت کی حامل ہیں، ان کے 1949 سے 2015 تک شائع مضامین کا مجموعہ 'مسائل ومباحث' 2018 میں شائع ہوچکا ہے۔ ان کے والد عبیدالرحمٰن شیروانی اترپردیش قانون ساز اسمبلی کے رکن رہے اور ان کے دادا صدریار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی حیدرآباد میں صدر الصدور رہے۔ انھی کے نام سے مولانا ابوالکلام آزاد نے احمد نگر جیل میں جو خطوط لکھے وہ 'غبار خاطر' کا حصہ ہیں۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی متحدہ قومیت کے تصور کے علمبردار تھے اور وہ مذہب اور وطن کے درمیان کوئی تصادم نہیں سمجھتے تھے۔ وہ مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لعل نہرو اور مہاتما گاندھی سے متاثر تھے۔ اس کے علاوہ ان کے طالب علمی کے دور کی یادیں دھوپ چھاؤں شائع ہوکر مقبول عام رہی۔ ان کے مرتب کردہ مقالات سرسید اور پروفیسر عبدالعلیم نمبر بھی بہت مقبول ہیں۔ ان کا صحافتی کارنامہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ترجمان 'کانفرنس گزٹ' ہے جو 14 سال نہایت پابندی سے ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا، ان کا مقبول عام اداریہ کتابی شکل میں شجرات ریاض الرحمٰن شیروانی شائع ہوچکا ہے۔ گذشتہ تین سال سے نہایت پابندی کے ساتھ ماہنامہ 'فکر نو' کی ادارت آخر دم تک انجام دیتے رہے۔ انھیں سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں مسلم یونیورسٹی کے قبرستان منٹوائی میں سپرد خاک کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 نومبر 2019

حق کانپوری

کانپور: بین الاقوامی مشاعروں میں کامیابی کا ڈنکا بجانے والے خوش الحان غزل گو شاعر حق کانپوری نے منگل کو دارفانی کو رخصت اور داعی اجل کو لبیک کہا۔ حق

کانپوری مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئے اور کسب معاش کے لیے کانپور تشریف لائے۔ کانپور میں سکونت اختیار کرنے کے بعد کچھ سال قبل رائے بریلی چلے گئے۔ وہ انتہائی نیک سیرت، بااخلاق وباشرع انسان اور کسی بھی مشاعرے میں کامیابی کی ضمانت تھے۔ انھوں نے ہندوستان بھر کے مشاعروں میں خوبصورت آواز میں غزل کے لیے اپنی انفرادی پہچان بنانے کے ساتھ عالمی سطح پر امریکہ، دبئی، کویت، پاکستان وغیرہ میں اپنی خوش الحان غزل سے سامعین کو اردو غزل کا عاشق بنایا۔ جوانی سے لے کر آخری دور تک عالمی سطح کے مشاعروں میں اپنی خوبصورت آواز و انداز میں روایتی غزل کے ذریعے نئی نسل کے جذبات کی ترجمانی کرکے داد وتحسین لوٹتے رہے۔ پچھلے چند مہینوں سے بیمار رہنے کے بعد منگل 22 اکتوبر کو 78 سال کی عمر میں رائے بریلی میں داعی اجل کو لبیک کہا اور لاکھوں چاہنے والوں کو ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گئے۔ نماز جنازہ بعد نماز مغرب مسجد ڈبل پھاٹک بعد ادا کی گئی اور مقامی قبرستان میں حق کانپوری کی تدفین عمل میں آئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اکتوبر 2019

جاوید رشید عامر

مراد آباد: مراد آباد کی مشہور ومعروف ادبی شخصیت جاوید رشید عامر ایڈووکیٹ اچانک ہی عارضۂ قلب میں مبتلا ہوگئے، جس کے بعد انھیں نزدیکی اسپتال میں لے جایا گیا، جہاں ڈاکٹروں نے ابتدائی نگہداشت کے بعد

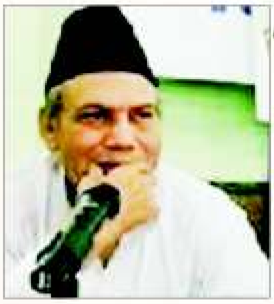

علی الصبح 2 نومبر کو مردہ قرار دے دیا۔ بتا دیں کہ مراد آباد کے صاحب دیوان و تاریخی کتب کے ماہر جاوید رشید نہایت ہی مقبول ترین شخصیت تھے۔ ادبی محفلوں، ادبی نشستوں اور مذہبی جلسوں کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام 'شمشیر، الہام اور سنہری اکشر' شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں اردو کی خدمات کے لیے مختلف اعزازات سے بھی نوازا جاچکا ہے، جس میں سنہ 2001 میں جگر میموریل سوسائٹی نے 'جگر ایوارڈ'، 'میں مراد آبا ہوں' کے لیے سرسید ایوارڈ اردو کی خدمات کے لیے ریا جن کلیان سمیتی کی جانب سے 'اردو ایوارڈ' سے نوازا جاچکا ہے۔ جاوید رشید عامر مراد آباد کے مشہور شہید آزادی نواب مجو خاں کے مدعاؤں میں سے تھے۔ مرحوم کی نماز جنازہ مرکز والی مسجد میں بعد نماز عشا ادا کی گئی اور ہزاروں سوگوار آنکھوں کے ساتھ ان کو ان کے آبائی قبرستان اندرا چوک کے نزدیک سپرد خاک کیا گیا جہاں ادبی، سیاسی، سماجی و تعلیمی، مذہبی شخصیات نے شرکت کی۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور بیٹی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 3 نومبر 2019

ڈاکٹر سلمان راغب

وارانسی: معروف صحافی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بنارس اسٹڈی سینٹر کے سابق کارڈینیٹر فرہنگ کلیات

مومن کے مصنف اور سہ ماہی 'ارتقا' کے مدیر ڈاکٹر سلمان راغب اب اس دارفانی میں نہیں رہے۔ طویل علالت کے بعد 55 سال کی عمر میں 21 اکتوبر کو انتقال کر گئے۔ وہ شہر بنارس کے ایک سرگرم ادبی شخصیت کے طور پر دیکھے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی علم و ادب کے گیسو سنوارے، اور اسے اپنے علم و صلاحیت سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے اور ان کے سکھ دکھ میں کام آنے میں گزار دیا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ سے ہنسنے مسکرانے والے اور نہایت خلیق اور ملنسار قسم کے انسان تھے۔ وہ مرنجان مرنج قسم کے انسان تھے، مسکراہٹ ان کے چہرے کا ناگزیر حصہ تھی۔ حال ہی میں یوپی اردو اکادمی نے انھیں ان کی ادبی خدمات کے لیے صحافتی ایوارڈ سے نوازا ہے۔ پسماندگان میں والد محترم ابوالقاسم شاد عباسی، بیوہ اور تین بیٹے ہیں۔

دیگر ذرائع سے

قومی اردو کونسل کے ریسرچ آفیسر شہنواز خرم کی والدہ کا انتقال

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سینئر ریسرچ آفیسر شہنواز خرم کی والدہ کی تجہیز و تکفین شاہین باغ قبرستان میں سیکڑوں سوگواروں، قومی کونسل کے کارکنوں، میڈیا اور سماج کے سرکردہ لوگوں کی موجودگی میں عمل میں آئی۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اس موقعے پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ قومی کونسل کے ارکان دکھ کی اس گھڑی میں مسٹر خرم کے ساتھ ہیں۔ انھوں نے مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہوئے کہا کہ ماں وہ سایہ دار شجر ہوتی ہے جہاں بچے ہمیشہ آرام محسوس کرتے ہیں۔ بچوں کو کبھی تکلیف نہیں پہنچنے دیتی ہے۔ دنیا میں ہر چیز کا بدل مل جاتا ہے لیکن ماں کا بدل کبھی نہیں ملتا۔ انھوں نے کہا کہ اللہ شہنواز خرم صاحب کو صبر جمیل دے۔ واضح رہے کہ مرحومہ شکیلہ بانو کا 4 نومبر کو ایک بجے ہسپتال میں طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی عمر تقریباً 72 سال تھی۔ پسماندگان میں شاہنواز خرم سمیت تین بیٹے اور چھ بیٹیاں ہیں۔ مرحومہ شکیلہ بانو صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں اور دینی و سماجی کاموں میں حصہ لیتی تھیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 5 نومبر 2019

خراج عقیدت: ___________

عشرت ظفر

علی گڑھ: اردو ناول کی دنیا کا آخری درویش بھی 16 اکتوبر کو ہم سے رخصت ہو گیا۔ 14 اپریل 1944 کو بارہ بنکی

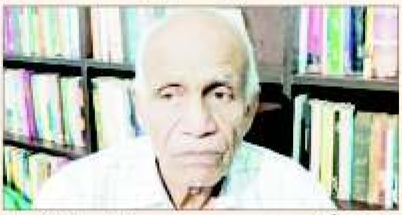

کے ترکانی گاؤں میں پیدا ہونے والے عشرت ظفر کو ادبی دنیا ان کے ناول آخری درویش کے نام سے جانتی تھی، ایسا نہیں کہ انھوں نے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں لکھا، حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے شہر سوختہ کے نام سے ایک شاندار ناول لکھا جبکہ وہ اپنی خود نوشت از کف خاکستر م کے نام سے لکھ چکے تھے جو جلد ہی شائع ہو رہی ہے۔ اتنا ہی نہیں ان کی اردو شاعری کے کئی مجموعے نوشتہ ہفت پر کار، امشب، سفال ہیچاک سمیت تنقیدی مضامین پر مشتمل مجموعے آفرینش، استفہام، احتساب اور نقش امروز شائع ہوئے جن کی پذیرائی بھی ادبی حلقے میں خوب ہوئی۔ عشرت ظفر نے 1961 سے کانپور کو اپنا وطن ثانی بنایا ہوا تھا اور ان کی علمی و ادبی خدمات کا سلسلہ تا حال جاری تھا۔ عشرت ظفر کے انتقال سے ادبی حلقے میں سوگواری چھائی ہوئی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 اکتوبر 2011

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر .... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

عام لسانیات

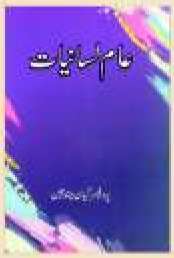

مصنف: پروفیسر گیان چند جین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 910

قیمت: 395 روپے

اردو ڈراموں کا انتخاب

مرتب: محمد حسن

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 600

قیمت: 265 روپے

قومی تہذیب کا مسئلہ

مصنف: سید عابد حسین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 220

قیمت: 120 روپے

اردو املا

مصنف: رشید حسن خاں

پانچویں طباعت: 2019

صفحات: 706

قیمت: 240 روپے

کلیاتِ سراج

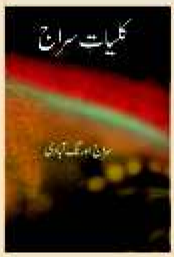

مصنف: سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 732

قیمت: 320 روپے

تفہیمات وترجیحات

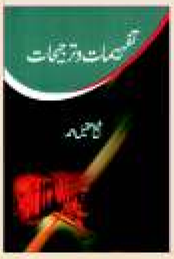

مصنف: شیخ عقیل احمد

صفحات: 237

قیمت: 130 روپے

مجمع البحرین

مصنف: داراشکوہ

مترجم: طلحہ رضوی برق

صفحات: 36

قیمت: 45 روپے

علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات

مصنف: خوشتر نورانی

صفحات: 248

قیمت: 110 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, December-2019, Vol.21, Issue:12
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/11/2019
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

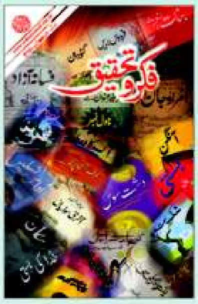

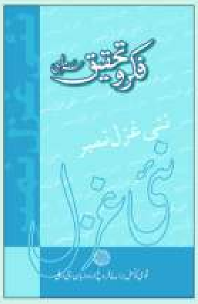
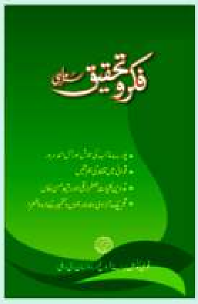
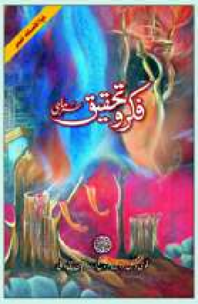
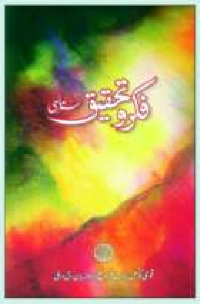

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025